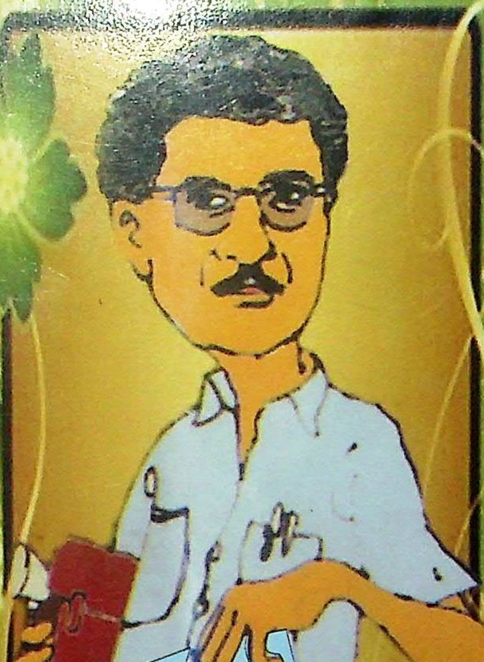
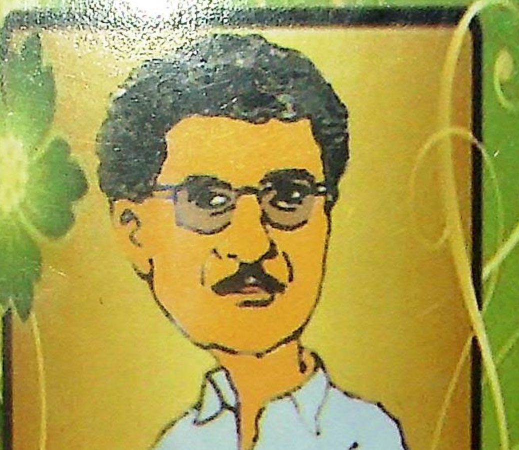
آئینہ



مرتب: قرۃ العین

آئینُما



مرتّب: قرۃ العین

آئینہ نما

(8)

مرتب

قرۃ العین

نام کتاب	آئینہ نما (8)
مرتب	قرۃ العین
سکونت	باغاتِ برزلہ، نزدیک بون اینڈ جوائنٹ ہسپتال سرینگر
	موبائل: 9419015745
کمپیوٹر کتابت	TFC کمپیوٹرس گاؤکدل، 2473818
قیمت	
عام ایڈیشن	200 روپے
لائبریری ایڈیشن	300 روپے
سالِ طباعت	2009ء
سرورق ڈیزائن	بشیر احمد

ملنے کا پتہ

قرۃ العین

باغاتِ برزلہ، نزدیک بون اینڈ جوائنٹ ہسپتال سرینگر

فون: 2433795

فہرست

◘◘◘

اپنی بات

آئینہ نما کا آٹھواں شمارہ پیش خدمت ہے۔ سنہ 2000ء میں جب اس سفر کی شروعات ہوئی تھیں تو نا معلوم خدشات اور وسوسوں نے گھیر رکھا تھا خدا جانے یہ کوشش کامیاب ہوگی یا نہیں، 20 سال کا عرصہ گذرنے کے بعد لوگوں میں شمیم احمد شمیم کی یاد باقی ہوگی بھی یا نہیں؟، کیا آئینہ کے پرستار اور شمیم صاحب کے عقید تمند ایک بار پھر آئینہ کی تحریروں کو پڑھنا پسند کریں گے؟ بدلتے ہوئے حالات کے پسِ منظر میں کیا یہ کوشش مناسب ہے؟۔ یہ اور کئی ایسے سوالات ذہن میں جنم لے رہے تھے۔لیکن آج مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے بڑی مسرت ہورہی ہے کہ 29 سال کا عرصہ گذرنے اور حالات کی تیز رفتاری سے بدلنے کے باوجود شمیم صاحب کے تئیں ان کے مداحوں اور خیر خواہوں کی محبت، شفقت اور خلوص میں کوئی فرق نہیں آیا ہے بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف ان کی محبت اور ان کی طلسماتی شخصیت سے جذباتی وابستگی میں اضافہ ہوا ہے بلکہ ان کی تحریروں کی اہمیت، معقولیت اور موزونیت کا احساس اور بھی گہرا ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئینہ نما کا آغاز ہوتے ہی مجھے ان کی جانب سے جو بھرپور تعاون اور حوصلہ ملا ہے اس نے اس سفر کو جاری رکھنے کے ارادے کو تقویت بخش دی۔

بزرگوں اور ہمعصروں کی محبت اور عقیدت تو اپنی جگہ مسلم اور مقدم!۔اس سے

بڑھ کر خوشی کی بات یہ ہے کہ ریاست کے باشعور اور تعلیم یافتہ نوجوان نسل کے لیے، بھی آئینہ نما کی اشاعت دلچسپی اور توجہ کا مرکز بنی ہے اور مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہو رہا ہے کہ صحافت، اُردو زبان اور کشمیر کی سیاست اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے آئینہ نما، ایک تاریخی دستاویز سے کم نہیں۔ میرے پاس ان شعبوں سے تعلق رکھنے والے طالب علم اکثر ''آئینہ نما'' کی تلاش اور شمیم صاحب کی ذات سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے آتے رہتے ہیں۔ ان کا ذوق اور تجسّس اس بات کا ثبوت ہے کہ آئینہ،کو ایک پھر منظر عام پر لانا ایک صحیح اور بروقت فیصلہ تھا۔

''آئینہ نما'' کا پہلا شمارہ چراغ بیگ کے تیسرے صفحے پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد قلمی خاکے، ہفتہ وار تاریخی اداریئے، ادبی تصانیف، طنز و مزاح کے کالم اور پاکستان میں چالیس دن چھپ کر آ گئے۔ 1975ء میں ہفتہ وار آئینہ روزنامے میں تبدیل ہوا اور چراغ بیگ کی جگہ کوہ کن نے سنبھال لی۔ دو سال تک کوہ کن آئینہ کے صفحات کی زینت بنا اور لوگوں کو آئینہ، دکھانے کا فرض بخوبی انجام دیا۔ اس کے بعد ش، احمد نے چراغ بیگ اور کوہ کن کی صحتمند اور جرأت مندانہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے منفرد اور مخصوص انداز میں ریاست کی روزمرہ ادبی، صحافتی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی زندگی کا احاطہ کیا۔ اپنے بے لاگ، بے خوف اور بے باک تبصروں اور تجزیوں پر مبنی تاریخ مرتب کی۔

آئینہ نما کا آٹھواں شمارہ کوہ کن اور ش، احمد کے مدلل، سیاسی سوجھ بوجھ، شعور سے بھرپور بصیرت افروز تحریروں پر مشتمل ہے اور غالباً اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کی افادیت، اہمیت اور معقولیت آج بھی مسلم اور اٹل ہے۔ بات کشمیر کی بے پناہ خوبصورتی اور قدرتی مناظر کے ساتھ ہو رہی سفاکی اور زیادتی ہو، جھیل ڈل کے سکڑنے کا خدشہ ہو، سٹیٹ سبجیکٹ کی خامی ہو، سبسڈی اور دربار موکی

برقراری کا تنازعہ ہو، میسا اور پبلک سیفٹی کا ناجائز استعمال ہو، ٹریفک کی بدنظمی ہو، سیاسی اور سماجی سطح پر اخلاقیات کا زوال ہو، سیکولرازم کا استحصال ہو، ش، احمد نے تمام مسائل پر گہری نظر رکھی ہے اور اپنے اداریوں اور تجزیوں میں بڑے لطیف اور موثر انداز میں ارباب اقتدار واختیار اور عوام کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہر تحریر اتنی جاندار اور تازگی کا ایسا احساس لیے ہے کہ لگتا ہے یہ اسی دور کی داستاں ہے جس سے ہم گذر رہے ہیں۔ اس شگفتگی اور طرزِ بیان نے ہی ان کی تحریروں کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ مرحوم سید میر قاسم نے بجا طور پر شمیم صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ کشمیر کی سرزمین آج تک دوسرا شمیم پیدا نہ کر سکی۔

اس شمارے کے بارے میں آپ کی رائے کی منتظر

قرۃ العین

.1

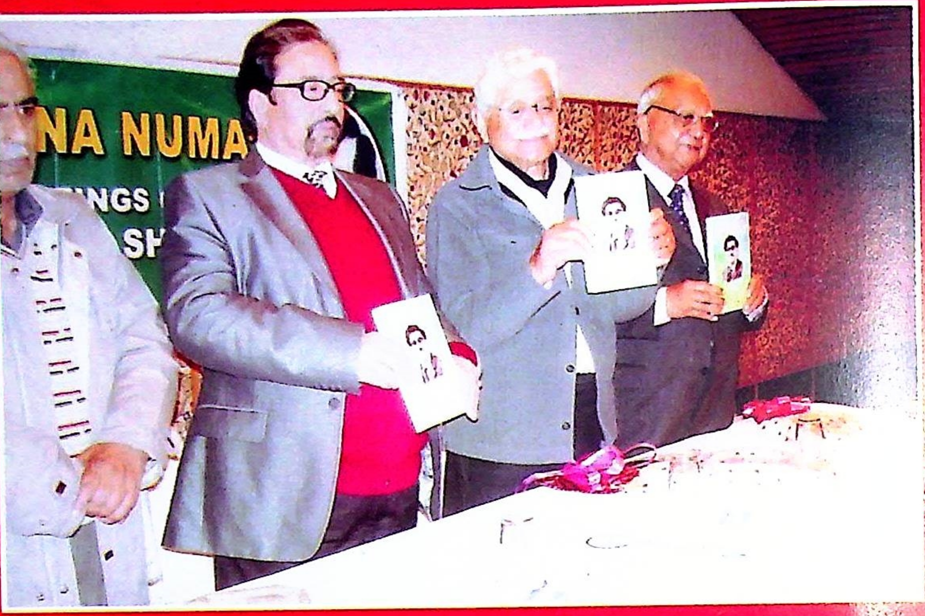
اداریئے

.2

ش احمد کے قلم سے

.3

باتیں کوہ کن کی



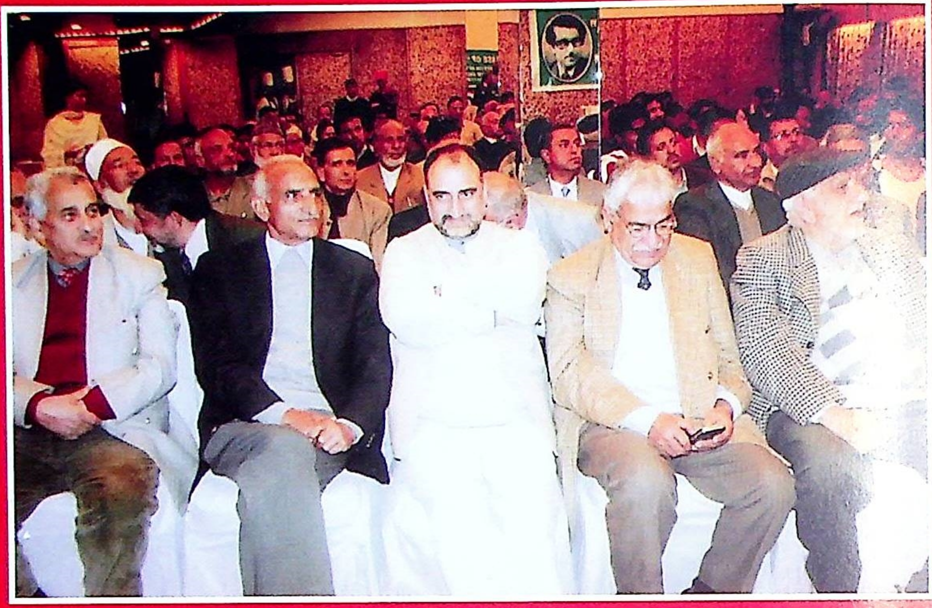


آئینہ نما (7) کے شمارے کی رسمِ اجراء (چند جھلکیاں)





آئینہ نما (7) کے شمارے کی رسمِ اجراء (چند جھلکیاں)





آئینہ نما (7) کے شمارے کی رسمِ اجراء (چند جھلکیاں)



محسن مغل (ماس کمیونکیشن) کشمیر ٹائمز کا ''شمیم احمد شمیم'' ایوارڈ لیتے ہوئے۔



آئینہ نما (7) کے شمارے کی رسمِ اجراء (چند جھلکیاں)

اداریئے

اس بدنظمی کو روکیئے

سرینگر شاید دُنیا کا واحد شہر ہے جہاں کوئی بھی شخص کسی بھی جگہ گاڑی کھڑی کر کے اپنا کام کاج کرنے میں مصروف ہوسکتا ہے اور اس حرکت کے اثرات کا اُسے بالکل احساس نہیں ہوتا اور نہ ہی سڑک پر متعین ٹریفک کو کنٹرول کرنے والے سپاہی پر اس کا کوئی پڑتا ہے۔ کیونکہ شہر کی مصروف ترین سڑکوں پر گاڑیاں پارک کرنا اب ہمارے ہاں کا ایک معمول بن چکا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ یاستی حکومت اس صورتِ حال پر قابو پانے میں ناکام ہوچکی ہے اور اس سلسلے میں وہ اب کسی اور اقدام کا ارادہ نہیں رکھتی۔ اس وقت شہر میں ٹریفک کا ظام جس بے راہ روی کا شکار ہو چکا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن ٹریفک ہپیس یا محکمہ ٹریفک کی طرف سے اس مسئلے کے تیئں جو سردمہرانہ رویہ اپنایا گیا ہے اس کو دیکھ کر بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ محکمہ ہٰذا کو اس مسئلے کے وجود کا بھی حساس نہیں کیونکہ معمولی سی توجہ اور منصوبہ بندی سے اس بے راہ، وی کا بہت حد تک خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

امیرا کدل، ریذیڈنسی روڑ اور مولانا آزاد روڑ جو نہ صرف ریاستی لوگوں کے لیے بلکہ وادی کی سیاحت کو وارد ہونے والے ہر سیاح کے لیے پہلے پڑاؤ کا حیثیت رکھتے ہیں، ٹریفک کی بدانتظامی اور ڈرائیوروں کی من مانی کی ایک

ایسی مثال پیش کرتے ہیں کہ جس کو الفاظ میں بیان کرنا نہایت ہی مشکل ہے۔ اس کے ساتھ ہی سٹی بس سٹینڈ، لالہ رُخ ہوٹل اور کے، ایم، ڈی اڈہ کے گردو نواح میں جو ہنگامہ دن بھر جاری رہتا ہے، اُسے دیکھ کر انسان یہ یقین کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس شہر میں ٹریفک کا نظم و نسق سنبھالنے والے محکمے کا کوئی وجود نہیں۔ ریذیڈنسی روڑ پر کافی ہاؤس کے قریب ٹریفک کا بحران تو اپنے پورے عروج پر ہوتا ہے اور بدقسمتی سے اس علاقے میں دن بھر سیاح لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ کافی ہاؤس کے بالکل سامنے اور ریگل سینما تک ہر شخص جہاں چاہے، اپنی گاڑی کھڑی کر سکتا ہے۔ چاہے راستہ مسدود ہی کیوں نہ ہو اُسے کوئی پوچھنے والا نہیں، کافی ہاؤس کے قریب تو کبھی کبھی لمبرٹ لین کو جانے والا راستہ بالکل بند ہو جاتا ہے، لیکن نہ گاڑی کو کھڑی کرنے والے شخص اور نہ ہی ڈیوٹی پر متعین سپاہی کو اس بات کی پرواہوتی ہے کہ کوئی ٹریفک کے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔

اس صورت حال کو بڑھاوا دینے میں عوام سے زیادہ محکمہ ٹریفک کا قصور ہے، کیونکہ اگر بیچ سڑک میں یا غلط جگہ گاڑی پارک کرنے والے ایک فرد کو ہی کبھی کوئی سزا دی گئی ہوتی، یا اُس پر جرمانہ عائد کیا گیا ہوتا، تو دوسرے لوگ ایسا کرنے سے پہلے کئی بار سوچ لیتے۔ اس وقت شہر میں ٹریفک کا دباؤ بڑھتا چلا جارہا ہے اور جس رفتار سے اس وقت گاڑیوں، موٹروں، ٹرکوں، سکڑوں، ٹیکسیوں وغیرہ کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے، اُسے دیکھ کر یہ اندازہ لگا قطعی مشکل نہیں کہ اگر یہ رفتار جاری رہی تو آئندہ چند برسوں کے بعد شہر کی موجودہ سڑکیں ٹریفک کے اس سیلاب بے پناہ کو روکنے میں ناکام ہوں گی۔ حالات کا تقاضا تو یہ تھا کہ متعلقہ افسران مستقل کو مدِ نظر رکھ کر ابھی سے آنے والے

خطرے کے تدارک کی کوششیں کرتے۔لیکن اس کا کیا کیجیے کہ یہ لوگ حال کی خرابی کو بھی دور کرنے کی تکلیف نہیں کررہے ہیں اور کوئی بھی حاکم اس سنجیدہ اور اہم مسئلے کی طرف توجہ دینے پر تیار نہیں۔ اگر اس امر کی طرف ایسی ہی لا پرواہی برتی گئی تو چند سال بعد شہر کی سڑکوں سے گذرنا خطرے کا باعث بن جائے گا۔اس صورت حال کا سب سے بہتر علاج صرف اتنا ہے کہ اس بے راہ روی کو ختم کرنے کے لیے فوری سے قدم اٹھایا جائے اور شہریوں میں ٹریفک کے قواعد وضوابط کا احترام کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ڈرائیوروں کو ٹریفک رولز سے آگاہ کیا جائے اور ان کی خلاف ورزی کرنے والے کو کڑی سزا دی جائے۔اس سلسلے میں بے شک پہلے مرحلے پر چند دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا، مگر اُن پر آسانی سے قابو پایا جا سکتا ہے اور اس طرح ایک بڑے خطرے کی آمد کو ٹالا جا سکتا ہے۔ہمیں چاہیے کہ ہم اس مسئلے کا سنجیدگی سے جائزہ لیں۔

❖❖❖

۳۰رجولائی ۱۹۷۶ء

کشمیری لڑکیاں اور سٹیٹ سبجیکٹ

ریاست کے سٹیٹ سبجیکٹ قانون کو ہماری سیاست ، اقتصادیات اور تاریخ میں جو اہمیت حاصل ہے اس کی وضاحت غیر ضروری ہے ۔ یہ قانون مہاراجہ کے وقت میں نافذ ہوا تھا اور اس کی رُو سے کسی غیر ریاستی باشندے کو ریاست میں زمین کی ملکیت حاصل نہیں ہوسکتی ہے ۔ اس کا مقصد غریب ریاستی عوام کو بیرون ریاست کے سرمایہ داروں کے تسلّط اور استحصال سے محفوظ رکھنا تھا اور حق یہ ہے کہ مہاراجہ کے اس دور اندیشانہ قدم نے کشمیر کی خوبصورت وادی کو گجراتی سیٹھوں اور بنگالی مہاجنوں کی دست برد سے محفوظ رکھا ، ورنہ اب تک آدھے سے زیادہ کشمیر کی زمین ، غیر ریاستی سرمایہ داروں کے ہاتھوں بک گئی ہوتی اور ہم اپنے ہی وطن میں اجنبی بن کر رہ گئے ہوتے ۔ سٹیٹ سبجیکٹ قانون کے اس حفاظتی پہلو نے اسے ہماری سیاسی تحریک اور قومی معشیت کا سب سے اہم عنصر بنا دیا ہے اور ریاستی عوام اسے بجا طور پر اپنے تحفظ اور آزادی کا چارٹر سمجھتے ہیں ۔ ہماری دانست میں اس قانون کو نہ صرف برقرار رہنا چاہیے بلکہ اس کی موجودہ خامیوں کو دور کر کے اسے زیادہ شدت کے ساتھ لاگو کیا جانا چاہیے ۔ لیکن اس قانون کے نفاذ اور استعمال سے خود ریاستی عوام کا ایک حصہ بہت نامنصفانہ طریقے پر متاثر ہو رہا ہے اور اس کی طرف قانون دانوں کو فوری توجہ دے کر اس مسئلے کا کوئی حل دریافت کر لینا

چاہیے۔

ریاستی ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کی رُو سے ایک کشمیری لڑکی جب کسی غیر کشمیری نوجوان (یا بوڑھے) سے شادی کرتی ہے، تو اس کا ریاستی باشندہ ہونے کا حق زائل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی کشمیری نوجوان (یا بوڑھا) کسی غیر کشمیری خاتون سے شادی کرتا ہے تو وہ خاتون از خود سٹیٹ سبجیکٹ بن جاتی ہے۔ بادی النظر میں یہ قانونی دِقت کشمیری خواتین کے لیے غیر منصفانہ ہے اور اسے موجودہ حالت میں برقرار نہیں رہنا چاہیے۔ اس کا علاج کیا ہوسکتا ہے، ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، لیکن یہ معاملہ بجائے خود اتنا اہم ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ تہذیبی اختلاط اور تمدنی میل ملاپ کے موجودہ دور میں کشمیری لڑکیوں کا غیر کشمیری نوجوانوں کے ساتھ بیاہ کرنا ناگزیر ہو گیا ہے اور ہماری بہت سی لڑکیاں آئے دن یو پی، بہار، دہلی، گجرات اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں رہنے والے نوجوانوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ غیر ملکی نوجوانوں کے ساتھ بھی بیاہی جا رہی ہیں۔ ان بے چاریوں کو صرف اسی بناء پر اپنے آبائی حق سے محروم کرنا صریحاً زیادتی ہے۔ معاملہ یہیں تک رہتا تو تب بھی کسی حد تک گوارا ہوسکتا تھا لیکن اس قانون کے بعض مضمرات یقیناً شدید ناانصافی کی ذیل میں آتے ہیں اور اس قسم کی ناانصافی کو ہمیشہ کے لیے روا نہیں رکھا جا سکتا۔ مثلاً اُس صورت میں کیا ہوگا کہ اگر ایک کشمیری لڑکی کو ایک غیر کشمیری نوجوان سے شادی کے سال دو سال کے بعد طلاق دی جاتی ہے؟ کیونکہ وہ ایک بار سٹیٹ سبجیکٹ کے حق سے محروم رہ کر دوبارہ اس کی حق دار بننے سے رہیں۔ اسی طرح فرض کیجیے کہ شادی کے چند ماہ بعد ہی وہ بیوہ ہو جاتی ہے، اس عورت میں اس کا اور اس کے بچوں کا کیا ہوگا؟ اسی طرح ایک

اور مثال سامنے آجاتی ہے، فرض کیجیے کہ ایک سرکاری ملازم خاتون ، ایک غیر ریاستی باشندے سے شادی کرتی ہے اور اس طرح سٹیٹ سبجیکٹ کے حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ اب اس کی سروس پر کس نوعیت کا قانون لاگو ہوگا اور کیا صرف غیر ریاستی باشندے سے شادی کرنے کی بناء پر اسے ان تمام رعائیتوں سے محروم کر دیا جائے گا کہ جو ایک سٹیٹ سبجیکٹ کو حاصل ہوتی ہیں۔ یہ اور اسی نوعیت کے بہت سے مسائل اس قانون کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ ان مسائل پر تنگ نظری، جذباتیت اور حقیر مفادات کی بجائے ریاستی عوام کے مجموعی مفادات کے نقطۂ نظر سے غور کیا جائے۔ کیونکہ اس قانون کا مقصد ریاستی عوام کے مفادات کا تحفظ ہے۔ انہیں کسی قسم کا زک پہنچانے سے نہیں۔ لیکن موجودہ حیثیت میں سٹیٹ سبجیکٹ کا یہ قانون ہماری لڑکیوں کے مفادات کی نگہبانی کرنے کی بجائے ان کے آبائی اور پیدائشی حقوق کو ختم ہی کر دیتا ہے۔ قانون بنانے کا ہرگز یہ منشاء نہیں تھا اور نہ موجودہ حکومت کا یہ منشاء ہوسکتا ہے، اس لیے ان دقتوں کو دور کرنے میں مزید تاخیر نہیں کی جانی چاہیے۔

☆☆☆

۲۹ر جولائی ۱۹۷۶ء

ٹھاکور صاحب کی وکالت

ریاست کے وزیر اعظم جناب شیخ محمد عبداللہ کو جمہوریت کے مقدمۂ قتل میں پبلک سیفٹی آرڈی ننس کے مہلک ہتھیاروں کی برآمدگی سے جو تشویش ہوئی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اخبار نویسوں کی عدالت میں اپنا بیانِ صفائی پیش کرتے وقت وہ ریاست کے دو مشہور وکیلوں مرزا محمد افضل بیگ اور ٹھاکور دیوی داس کو بھی ہمراہ لائے تھے۔ بیگ صاحب بہت سے ہارے ہوئے مقدموں کے وکیل رہ چکے ہیں اور ٹھاکور صاحب شیخ صاحب کی وکالت سے پہلے بخشی صاحب کی وکالت کر چکے ہیں۔ اس لیے دونوں وکیلوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں جمہوریت کے قتل کے سلسلے میں پبلک سیفٹی آرڈی ننس کے مہلک ہتھیاروں کو بے ضرر اور غیر متعلق ثابت کرنے کی کوششیں کیں۔ لیکن بد قسمتی سے مقدمہ اتنا کمزور، شہادت اتنی ٹھوس اور عدالت اتنی غیر جانبدار تھی کہ نہ بیگ صاحب کی ذہانت کام آئی اور نہ ٹھاکور دیوی داس کی وکالت اور بالآخر شیخ صاحب کو قتل کے اس مقدمے میں خود حفاظتی Self Defence کے اصول کا سہارا لے کر پاکستان کے مستقل خطرے کی نشان دہی کرنا پڑی۔ لیکن اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بھی شیخ صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ عوامی عدالت سے ان کا بری ہونا ناممکن ہے اور پچھلے دو چار دنوں سے اس سلسلے میں رائے عامہ کا ردعمل دیکھتے ہوئے

ان کا اندیشہ صحیح ثابت ہو رہا ہے۔ کشمیر کے اخبار نویسوں کے سامنے اپنی وکالت کا مظاہرہ کرنے کے بعد جب وزیر خزانہ ٹھاکر دیوی داس جموں پہنچے، تو انہوں نے پبلک سیفٹی آرڈی ننس کے لیے ایک اور جواز تراشا، انہوں نے کہا کہ اس آرڈی ننس میں کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ سارے قوانین ۱۹۴۷ء سے موجود ہیں اور ہم نے انہی قوانین کو ایک آرڈی ننس کی شکل دی ہے۔ ٹھاکر صاحب کا خیال ہوگا کہ انہوں نے اپنی بحث میں یہ اہم اور نادر نکتہ پیدا کر کے مقدمہ جیتنے کا سامان کر لیا ہے، لیکن انہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اپنی اس قانون دانی اور نکتہ آفرینی سے انہوں نے اس مقدمہ قتل میں ریاستی حکومت کی بریت کا رہا سہا امکان بھی ختم کر دیا ہے۔ ٹھاکر صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ شیخ صاحب اور ان کے ساتھی مرزا محمد افضل بیگ پچھلے ۲۴ سال سے اس قسم کے کالے قوانین کے خلاف ہی جدو جہد کرتے آئے ہیں اور ان کا سیاسی موقف یہی ہے کہ پچھلے ۲۴ بلکہ ۳۰ برسوں سے جو کچھ ہوا ہے اس کی اخلاقی، آئینی اور سیاسی حیثیت مشکوک ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ ۱۹۵۳ء کے بعد سے لاگو کیے گئے مرکزی قوانین پر نظر ثانی کر کے ایسے قوانین کو کالعدم قرار دینا چاہتے ہیں کہ جن سے ریاست کی اندرونی خود مختاری اور ریاستی عوام کے بنیادی حقوق متاثر ہوئے ہوں، اور اب جب کہ پہلی بار انہیں یہ موقع مل رہا تھا کہ وہ گذشتہ تیس بیس یا چوبیس سالوں کے دوران نافذ کیے گئے کالے قوانین کو بہ یک جنبش قلم ختم کر سکتے تھے، ان کا ان قوانین کا احیاء، بلکہ انہیں زیادہ سخت بنانے کا عمل ایک ایسا گناہ ہے کہ اس کے جواز میں پیش کیا جانے والا ہر عذر گناہ سے بھی بدتر دکھائی دیتا ہے۔ ٹھاکر صاحب نے غیر شعوری طور پر اس بات کا اعتراف کر لیا ہے کہ شیخ صاحب اور بیگ صاحب دونوں پرانے قوانین

میں کسی قسم کی ترمیم یا رد بدل نہیں کرنا چاہتے بلکہ وہ اندرونی خودمختاری کے نام پر پرانے قوانین کو زیادہ سخت اور جابرانہ بنا کر اپنے اقتدار کو بحال رکھنے کے لیے کوشاں ہیں ورنہ یہ کون سی دلیل ہے کہ آج کے کالے قوانین دراصل آج کے نہیں بلکہ آج سے ۲۴ سال کے ہیں اور اسی لیے انہیں دوبارہ زندگی عطا کی جا رہی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ٹھاکور دیوی داس کو اپنی وکالت کے سیاسی مضمرات کا احساس اور اندازہ نہیں۔ انہیں ہو بھی کیسے سکتا ہے کیوں کہ ان کے نیشنل کانفرسی ہونے کی تاریخ صرف چار ماہ پرانی ہے، ہم شیخ صاحب سے گذارش کریں گے کہ وہ خزانے کے وزیر کو قوانین کے وزیر کے معاملات میں دخل دینے سے باز رکھیں۔

☆☆☆

۱۲ر نومبر ۱۹۷۷ء

سبسڈی

وزیر اعلیٰ جناب شیخ صاحب نے چند روز قبل گاندربل میں ایک عوامی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے خوراک پر دی جانے والی سبسڈی کے معاملے پر اظہار رائے کیا ہے، انہوں نے کہا کہ سبسڈی کو فوری طور ہٹائے جانے کی کوئی بھی تجویز زیرِ غور نہیں ہے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ اس مسئلے کے ساتھ ریاست کے لاکھوں عوام کی دلچسپی ہے اور حکومت اس مسئلے کو حل کرنے سے قبل عوام کے ساتھ مشورہ کرے گی۔

چند روز قبل ریاست کے وزیر خوراک مسٹر غلام محمد شاہ نے ''سماچار'' کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ ریاستی حکومت سبسڈی کو مرحلہ وار طریقے پر ہٹائے گی، اور حکومت چاہتی ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو سبسڈی کو ہٹانا چاہیے۔ انہوں نے اس سلسلے میں کہا تھا کہ عوام نے ریاستی حکومت کو خوراک پر دی جانے وای سبسڈی کو مکمل طور ہٹانے کا اختیار دیا ہے۔

وزیر اعلیٰ اور وزیر خوراک کے ان بیانات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کابینہ نے ابھی اس معاملے پر غور نہیں کیا ہے اور ہمارے سامنے اب تک حکومت کی مجموعی رائے نہیں آئی ہے۔ وزیر اعلیٰ کے بیان نے وزیر خوراک کے بیان کی تردید کی ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں لیڈروں نے اس معاملے پر جو کچھ کہا ہے، وہ ان کی ذاتی رائے ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ حکومت کو چاہیے کہ وہ سبسڈی کو مکمل طور ہٹانے کے لیے

فوری اقدامات کرے۔ کیوں کہ حالیہ انتخابات میں اس معاملے پر عوام نے اپنا فیصلہ سُنا دیا ہے۔ عوام کی رائے جاننے کا سب سے بہترین طریقہ انتخابات ہوتا ہے اور حالیہ انتخابات میں سبسڈی کے مسئلے کو ریاستی جنتا پارٹی اور کانگریس نے انتخابی اشو بنا لیا تھا۔ اگر چہ نیشنل کانفرنس نے اپنے انتخابی منشور میں سبسڈی ہٹانے کا وعدہ نہیں کیا تاہم اس جماعت کے لیڈروں نے اپنی تقریروں اور بیانات میں سبسڈی کو قائم رکھنے کی زبردست مخالفت کی۔ جنتا پارٹی نے سبسڈی بحال کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا، لیکن اس کے باوجود یہ جماعت ۷۶/ارکان کے ایوان میں صرف ۱۲ نشستیں حاصل کرسکی۔ جب کہ نیشنل کانفرنس کو انتخابات میں زبردست کامیابی ہوئی۔ اس لحاظ سے شیخ صاحب کا عوام کے ساتھ مشورہ کرنے کی تجویز کچھ بے معنی سی لگتی ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ وقت ضائع کیے بغیر ایسے اقدامات کرے جن کی توقع عوام ان سے رکھتے ہیں۔ ہم اُمید کریں گے کہ نیشنل کانفرنس کے لیڈرانِ کرام ذاتی رنجشوں اور گروہ بندی سے باہر آئیں گے اور عوام کے ساتھ کیے وعدے پورے کرنے کی کوشش کریں گے۔ عوام نے ان پر جس اعتماد کا اظہار کیا ہے، انہیں اپنے آپ کو اس کے اہل ثابت کرنا ہوگا۔ جہاں ہم حکومت سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ انصاف کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھ کر یہاں کے عوام کا معیار زندگی بلند کرنے کے کام میں جٹ جائے گی۔ وہاں ہم حزب اختلاف سے بھی توقع کریں گے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں نہایت ہی ایمانداری کے ساتھ نبھائے گی۔

☆☆☆

جولائی ۱۹۷۷ء

دربارِمُو

حسبِ معمول آج سے چند ہفتے بعد وہ سالانہ ورزش شروع ہو جائے گی کہ جس کو اصطلاعِ عام میں انتقالِ دفاتر یا دربارِمُو کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں سیکریٹریٹ اور دیگر سرکاری دفاتر موسمِ سرما کے لیے جموں منتقل ہوں گے اور وادی کشمیر سرکاری طور ''یتیم'' ہو کے رہ جائے گی۔ دربارِمُو ہمیں عہد گذشتہ کے اُس جاگیردارانہ اور شخصی راج کے دور کی یاد دلاتا ہے کہ جب حکومت کا تمام تر کام کاج، چند گنے چُنے لوگ انجام دیتے تھے اور حکومت اور عوام کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہوا کرتا تھا۔ زمانہ بدل گیا، حکومت بدل گئی ۔لیکن ''شاہی دربار'' کا تصور کسی نہ کسی شکل میں ہمارے ذہن پر چھایا رہا اور آج جب کہ ریاست میں شخصی راج کی تقریباً ہر یادگار مٹ چکی ہے، دربارِمُو یا انتقالِ دفاتر کی یادگار اور روایت ابھی تک زندہ ہے۔ اس پر بس نہیں بلکہ ہم اس روایت کو زندہ رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش سے بھی گریز نہیں کرتے اور ہر سال نومبر کے وسط میں ریاستی حکومت کے تمام ضروری دفاتر جموں منتقل ہو جاتے ہیں۔

شخصی راج میں جب دفاتر جموں منتقل ہوا کرتے تھے، تو اُس زمانے میں سیکریٹریٹ میں صرف چند سو ملازم تھے اور اُن کا جموں سے سرینگر اور سرینگر سے جموں منتقل ہونا کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ جو انتظامیہ کی کارکردگی پر کوئی غیر معمولی اثر ڈال سکتی ۔ لیکن ریاست میں عوامی حکومت کے قیام کے بعد سیکریٹریٹ اور دیگر دفاتر اس قدر متاثر ہو گئے ہیں کہ انتقالِ دفاتر کے موقع پر ہر سال ہزاروں پر مشتمل ایک قافلہ خانہ بدوشوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے

اس کے علاوہ انتقال دفاتر کے نتیجے میں سرکاری کام کاج میں جو تاخیر ہوتی ہے، خالص مالی نکتہ نگاہ سے اگراس کا اندازہ لگایا جائے تو نقصان کا تخمینہ لاکھوں روپے تک پہنچ جائے گا،اوراس سے بھی زیادہ توجہ طلب بات یہ ہے کہ ریاست کی راجدھانیوں میں رہائشی مکانوں کی قلت،ٹرانسپورٹ کی نامکتفی سہولیات اور دیگر ضروریات کی نایابی ہزاروں ملازموں اوران کے اہل خانہ کواس قدر کوفت اور پریشانی میں مُبتلا کر دیتی ہیں کہ وہ ایک لمبے عرصے تک یکسوئی اور توجہ کے ساتھ سرکاری کام کاج انجام دینے کے اہل نہیں رہ جاتے اور جب وہ اپنی گھریلو ضروریات کوکسی حدتک پورا کرلیتے ہیں تو دوبارہ کوچ کرنے کا وقت کچھ دورنہیں ہوتا اوراس طرح ایک بارپھر وہ ورزش شروع ہوتی ہے کہ جوکوئی فائدہ دینے کے بجائے سینکڑوں مشکلات ومصائب کوجنم دیتی ہے۔

کئی برسوں سے ریاستی حکومت اس روایت کوترک کرنے اورکوئی متبادل انتظام تلاش کرنے کی سوچ رہی تھی کہ جس کے نتیجے میں انتہائی ضروری دفاتر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیے جاسکیں۔صادق صاحب مرحوم کے وقت میں کچھ عرصہ کے لیے اس تجربے کوآزمایا بھی گیا تھا مگر بعد میں اسے ترک کرلیا گیا۔ وزیراعظم جناب شیخ محمد عبداللہ نے فروری ۷۵ء میں زمام اقتدار سنبھالنے کے موقع پر کہا تھا کہ وہ اس بدعت کوختم کرنے کی بھرپورکوشش کریں گےلیکن وہ دن اورآج کا دن،اوراب جب کہ حالیہ انتخابات میں ریاستی عوام نے شیخ صاحب کواپنا بھرپور اعتماد بخشا ہے ہم محترم وزیراعظم سے گذارش کریں گے کہ وہ اپنے اس وعدے کی تکمیل کے لیےکوشش کریں۔

☆☆☆

۲۶/اکتوبر۷۷ء

کچھ اوقاف اسلامیہ کے بارے میں

چند دن قبل مسٹر محمد شفیع قریشی نے ایک عوامی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ادارہ اوقاف اسلامیہ کو نیشنل کانفرنس کی قید سے آزاد کیا جانا چاہیے تاکہ اِس بات کی گنجائش نہ رہے کہ صدر او[illegible] جو صدر نیشنل کانفرنس بھی ہیں، اوقاف کے پیسے انتخابات میں اپنے اُمیدواروں کی کامیابی کے لیے صرف کریں۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس ادارے کے حساب وکتاب کی جانچ پڑتال کرنی چاہیے۔ جہاں تک قریشی صاحب کے پہلے مطالبے کا تعلق ہے تو ہم یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کریں گے کہ یہ مطالبہ نہایت ہی مناسب ہونے کے ساتھ ساتھ بروقت بھی ہے۔ اوقاف اسلامیہ ریاست کا ایک بہت ہی بڑا ادارہ ہے اور ہر برس اس کی لاکھوں روپے آمدن ہوتی ہے۔ ریاست میں اسمبلی کے لیے انتخابات کا اعلان کیا جا چکا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ نیشنل کانفرنس نے اپنے مخصوص انداز میں اپنی انتخابی مہم شروع بھی کی ہے۔ چونکہ شیخ صاحب نیشنل کانفرنس کے ساتھ ساتھ اوقاف اسلامیہ کے صدر بھی ہیں، اس لیے اس بات کا خدشہ ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ کہیں اوقاف کے وسائل کو انتخابات جیتنے کے لیے استعمال میں نہ لایا جائے۔ قریشی

صاحب نے اس کے علاوہ ادارہ اوقاف کی انتظامیہ پر خورد بُرد کے الزامات بھی عائد کیے ہیں، ہم ان الزامات پر بھی اپنی رائے کا اظہار نہیں کرنا چاہتے البتہ ہم اس سلسلے میں چند باتیں محترم شیخ صاحب کی خدمت میں عرض کرنے کی جسارت ضرور کریں گے۔

شیخ صاحب کا دعویٰ ہے کہ وہ ریاست میں ایک جمہوری نظام قائم کرنے کے لیے گذشتہ پچاس برس سے مسلسل میدان جنگ میں ہیں، اگر یہ بات صحیح ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایک بہت ہی بڑے عوامی ادارے کو جمہوری قدروں اور اصولوں پر نہیں چلایا جاتا ہے؟ شیخ صاحب اس ادارے سے طویل عرصے سے وابستہ رہے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی اس ادارے کا انتظامیہ منتخب کرنے کے لیے انہوں نے آج تک کوئی کاروائی نہیں کی۔ بلکہ انہوں نے جب بھی انہیں موقعہ ملا، خود اپنے آپ کو صدرِ اوقاف بنایا۔ اس بات سے قطع نظر کہ آیا وہ ادارہ تسلی بخش کام کرتا ہے یا نہیں یہ بات اصولاً غلط ہے کہ اس ادارے کو ایک شخص کی تحویل میں رکھا جائے، گذشتہ برس ہی سکھوں کے مذہبی مقامات سے متعلق ریاستی قانون سازیہ نے ایک قانون بنایا جس کی رو سے تمام ایسے مقامات کا انتظام چلانے کے لیے کمیٹیوں کے ممبروں کا انتخاب باضابطہ الیکشن کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس قانون میں تمام متعلقہ معاملات کے بارے میں بھی اصول مرتب کیے گئے ہیں۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب ریاست کی قانون سازیہ نے سکھوں کے مذہبی مقامات کے انتظام کے بارے میں قوانین بنا لیے ہیں تو کیا مسلمانوں کے مذہبی مقامات کے انتظام سے متعلق قوانین نہیں بنائے جاسکتے۔ شیخ صاحب حال ہی میں دو برس تک ریاست پر حکومت کرتے رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی وہ کچھ سال تک برسر اقتدار رہے کیا وجہ ہے کہ

آٹھ برسوں کے دوران انہوں نے اس قسم کا قانون بنانے کی کوشش نہیں کی۔

کوئی بھی جمہور پسند انسان اس بات سے انکار نہیں کرسکتا ہے کہ تمام عوامی اداروں کا نظم ونسق چلانے کے لیے ایک جمہوری طریق کار ہونا چاہیئے۔ اس لیے ہم مطالبہ کرتے ہیں حکومت عام انتخابات کے بعد فوراً اس سلسلے میں کاروائی کرے۔ انتخابات تک ہم توقع کریں گے کہ ریاست کے گورنر شری جھا ایک ایسا طریقہ تلاش کریں گے جس سے اس ادارے پر نیشنل کانفرنس کا کنٹرول ختم ہو۔

☆☆☆

۲۳/اپریل ۱۹۷۷ء

جناح مرحوم کی صدسالہ برسی

برصغیر ہندو پاک کو عالم اقوام میں ہمیشہ ایک منفرد اور اہم مقام حاصل رہا ہے اور ایک صدی پہلے اس سرزمین نے ایسی عظیم شخصیتوں کو جنم دیا جن کا نام رہتی دنیا تک یاد کیا جائے گا اور جو اپنے اپنے میدانوں میں اپنی مثال آپ تھے چاہے وہ ادب ہو یا فلسفہ، مذہب ہو یا سیاست، قانون ہو یا سائنس۔ غرض زندگی کے ہر شعبے میں برصغیر کی خاک نے ایسے لوگوں کو اُچھال کر باہر نکالا جن کی چھاپ آج بھی جگہ جگہ نظر آرہی ہے۔ مثال کے طور میدانِ سیاست کو ہی لیجیے۔ آج سے تقریباً ایک صدی قبل ہمارے ملک کو یہ فخر حاصل ہوا کہ یہاں عظیم رہنما مہاتما گاندھی، قائداعظم محمد علی جناح، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسی عظیم شخصیتوں کا جنم ہوا۔ آج پورے پاکستان میں قائداعظم محمد علی جناح کا صدسالہ جشن پیدائش منایا جارہا ہے۔ پاکستان کے ساتھ ہمارا صرف ہمسائیگی اور بھائی چارے کا رشتہ ہی نہیں ہے بلکہ اُن کے ساتھ ہمارا ایک اور رشتہ بھی ہے، جو سب رشتوں سے افضل اور مقدم ہے وہ یہ کہ پاکستان اور پاکستان میں رہنے والے لوگ اور ہم ایک ہی مٹی سے بنے ہوئے ہیں۔ اُن کے اور ہمارے درمیان خون کا رشتہ ہے۔ اُن کی اور ہماری تاریخ ہی نہیں بلکہ تقدیر بھی مشترک ہے۔ محمد علی جناح کا جنم ایک سندھی خاندان میں ہوا تھا۔ اور قائداعظم کا خطاب انہیں ہند کی تحریکِ آزادی کے دوران ہی مہاتما گاندھی نے دیا تھا۔ مہاتما گاندھی نے جب بھی محمد علی جناح کو یاد کیا تو صرف قائداعظم کے خطاب کا استعمال کیا۔ یعنی سب سے بڑا لیڈر۔ عظیم لیڈر۔ محمد علی جناح صرف اس لیے عظیم نہیں کہ اُنھوں نے پاکستان نام کی

ایک علیحدہ مملکت کی بنیاد ڈالی، یا وہ مسلمانوں کے ایک عظیم رہنما تھے بلکہ جناح مرحوم دراصل اس لیے عظیم ہیں کہ انہوں نے پاکستان بننے سے اور مسلم لیگ کی بنیاد ڈالنے سے پہلے ہندوستان کی تحریک آزادی کے دوران قابل قدر کارنامے انجام دئے، اُن کی عظمت اور اُن کے قابل ذکر کارناموں کے پیش نظر بمبئی میں انڈین نیشنل کانگریس نے ان کی یاد اور ان کے نام پر ایک بہت بڑا ہال تعمیر کیا۔ جسے آج جناح ہال کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ قائداعظم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کانگریس کے چند لیڈروں کے رویے کے نتیجے میں کانگریس سے علیحدگی اختیار کی۔ لیکن کانگریس سے الگ ہو کر بھی وہ اپنے اُس جذبہ قومیت کو بھولے نہیں جو ایک عظیم انسان کی خصوصیت ہوتی ہے۔ یہ حالات کی ستم ظریفی اور تاریخ کا چکر ہے کہ وہ کبھی شخصیتوں کو بدلنے پر مجبور کرتا ہے اور جناح صاحب کے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوا اور کانگریس کے چند لیڈروں کے رویے نے اُنہیں مسلم لیگ قائم کرنے اور مذہب کی بُنیاد پر ملک کی تقسیم کر کے ایک نئی مملکت قائم کروانے پر مجبور کیا۔ لیکن پاکستان بننے کے فوراً بعد اُنہوں نے جو تقریر کی، اس میں انہوں نے پاکستان میں رہنے والے ہندو اور مسلمانوں سے کہا کہ وہ مذہب کی بنیاد پر جانچنے کی بجائے خود کو سب سے پہلے پاکستانی تصور کریں اور اپنے ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے جٹ جائیں۔ اس سے قبل بھی اپنی ایک تقریر میں جناح مرحوم نے پاکستان کے قیام کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ موجودہ حالات کے نتیجے میں ملک کی تقسیم کے سوا اور کوئی چارہ نہیں، لیکن اگر کبھی دونوں میں سے کسی ممالک کو بیرونی جارحیت کا سامنا کرنا پڑے۔ تو ہم دو بھائیوں کی طرح اُس کا مقابلہ کریں گے۔ کیوں کہ بہرحال ہم دو بھائیوں کی مانند ہیں اور خون کا رشتہ ہر

حال میں مقدم اور افضل ہوتا ہے۔ ان باتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قائد اعظم کتنے عظیم تھے اور ہندوستان اور پاکستان کے درمیان وہ کس قسم کے رشتے کے خواہاں تھے ۔ یہ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ گذشتہ برسوں کے دوران دونوں ملکوں کے تعلقات میں چند وجوہات کی بناء پر تلخی پیدا ہوگئی تھی اور بہت حد تک ہم ایک دوسرے کو اپنا دشمن تصور کرتے تھے مگر ہماری وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے فہم و تدبر نے اس صورت حال کو بدل دیا اور اس وقت ہندوستان اور پاکستان کے درمیان انتہائی خوشگوار تعلقات پائے جاتے ہیں جس کا ایک ہلکا سا نشان اس بات سے ملتا ہے کہ گذشتہ روز پاکستانی ہائی کمشن کے اہتمام سے نئی دہلی میں قائد اعظم کے صد سالہ جشن پیدائش کے سلسلے میں جو تقریب منعقد ہوئی اس میں وزیر خارجہ مسٹر وائی بی چوان نے بھی شرکت کی اور اطلاعات کے مطابق پاکستان کی حکومت نے جس طرح مختلف سربراہاں مملکت کو جناح میڈل دئے ، اُسی طرح صدر جمہوریہ جناب فخر الدین علی احمد کو بھی ایسا ہی میڈل ایک خصوصی تقریب پر دیا جا رہا ہے۔ آج کے دن جب کہ قائد اعظم کا سوواں یوم پیدائش منایا جا رہا ہے، قائد اعظم کو اس سے بڑھ کر اور کوئی خراج پیش نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملک ایک ایسے برادرانہ اور دوستانہ رشتے میں بندھ جائیں کہ جس کا خواب قائد اعظم جناح نے دیکھا تھا.

اور برصغیر کے تینوں ملک ، ہندوستان ، پاکستان اور بنگلہ دیش اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے ایک ایسے مشترکہ طریقہ کار کو ترتیب دیں جو برصغیر کے کروڑوں عوام کی خوش حالی کا باعث بن جائے ۔ اور یہ ہماری طرف سے قائد اعظم کے لیے ایک بہترین خراج عقیدت ہوگا۔ ☆☆☆

۲۵ر دسمبر ۱۹۷۶ء

یگیہ اور سیکولر اِزم

پچھلے ایک ہفتہ سے کھیر بھوانی میں جو یگیہ ہو رہا ہے اس کی نوعیت بظاہر مذہبی اور روحانی ہے اور اس کا مقصد عالمی امن کو تقویت پہنچانا ہے لیکن سرکاری سطح پر اسے جو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ یگیہ مذہبی کم اور سیاسی زیادہ ہے۔ یگیہ کے مہا پنڈت سوامی چندر کا حکمران جماعت سے گہرا تعلق ہے اور انہیں بہت سے مرکزی اور سیاسی وزیروں کا ذاتی قرب حاصل ہے۔ ریاست میں ان کی آمد پر ان کا بڑی گرمجوشی سے استقبال ہوا، اور جب سے یگیہ شروع ہوا ہے کئی مرکزی اور ریاستی وزیر کسی نہ کسی بہانے کشمیر آکر یگیہ میں شرکت کر چکے ہیں۔ پچھلے دنوں وزیر اعلیٰ جناب شیخ محمد عبداللہ بھی سوامی جی کے یگیہ میں اپنی نیک خواہشات شامل کرنے کے لیے کھیر بھوانی گئے اور توقع ہے کہ آئندہ چند دنوں میں اور بھی بہت سی سرکردہ شخصیات سوامی جی کے درشن کرنے اور یگیہ میں شرکت کے لیے کھیر بھوانی جائیں گے۔

ہم سوامی چندر کو ذاتی طور نہیں جانتے، لیکن سنا ہے کہ وہ بہت پہنچے ہوئے سوامی ہیں۔ ان کے یگیہ کا جو بھی مقصد ہو، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں، ایک مذہبی رہنما اور روحانی پیشوا کی حیثیت سے ہم ان کا احترام کرتے ہیں لیکن ایک خالص مذہبی تقریب کے ساتھ یہ سرکاری دھوم دھام ہماری فہم سے بالاتر ہے۔ آئین میں مجوزہ ترمیم کی رُو سے اب ہندوستان صرف ایک خود مختار

جمہوریت ہی نہیں سیکولر جمہوریت ہوگا اور سیکولرازم کا مطلب یہ ہے کہ سرکار کا کوئی اپنا مذہب نہیں ہوگا، اور اس کی نگاہوں میں سبھی مذاہب کا برابر کا درجہ حاصل ہوگا۔ کھیر بھوانی کا یگیہ ایک خالص ہندوانہ تقریب ہے اور سوامی چندر جی ہندوؤں کے لیے ایک سرکردہ اور واجب الاحترام شخصیت ہیں۔ پھر ان کے یگیہ کو سرکاری سطح پر یہ اہمیت دینا کہ دلی سے مرکزی وزیر اور دوسری ریاستوں کے وزراء اعلیٰ صرف ان کے یگیہ میں شرکت کے لیے کھیر بھوانی چلے آئیں، یقیناً سیکولرازم کے تصوّر اور اقدار کے منافی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یگیہ میں شریک ہونے والے جتنے وزیر یہاں تشریف فرما ہوئے، ان کے پاس کسی نہ کسی سرکاری کام کا بہانہ تھا۔ بالفاظ دیگر یہ سب لوگ سرکاری پیسے سے یہاں آئے، اور اپنے سفر اور قیام وطعام کے لیے انہوں نے سرکاری خزانے سے رقومات حاصل کیں۔ جب کہ ان کی آمد کا واحد مقصد سوامی چندر جی کے یگیہ میں شرکت کرنا تھا۔ سُنا ہے کہ یہ یگیہ عالمی امن کو استوار کرنے کے لیے کیا جارہا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ بات صحیح ہو، لیکن کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ اس کا مقصد موجودہ مرکزی حکومت کو ہر قسم کے سنکٹ سے محفوظ رکھنا ہے اور اسی لیے دلی سے دھڑا دھڑ وزیر لوگ کھیر بھوانی پہنچ رہے ہیں۔ ایک ترقی پسند اور سیکولر ہندوستان میں وزیروں کا کسی ایک مخصوص مذہبی تقریب سے اس قسم کی گہری وابستگی، ہندوستان کے سیکولرازم کے لیے نیک شگون کا درجہ نہیں رکھتا۔ ایسے ہی مرحلوں پر ہمیں پنڈت جواہر لال نہرو کی یاد آتی ہے کہ جو اس قسم کے تعصّبات، توہمات اور تصوّرات سے بہت بلند تھے۔

☆☆☆

۱۵/اکتوبر ۱۹۷۶ء

معقول تجویز

یونین آف ورکنگ جرنلسٹس کی کشمیر شاخ نے ایک سیمنار میں پبلک سیفٹی آرڈی ننس پر بحث و مباحثے کے بعد متفقہ طور ریاستی حکومت سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ آرڈی ننس میں پریس کی آزادی ، اشاعت اور تقسیم کے متعلق تمام قوانین کو کالعدم قرار دیا جائے۔ صحافیوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ غیر ملکی جاسوسوں ، دراندازوں اور تخریب کاروں کی سرگرمیوں کا سدِ باب کرنے والے قوانین کے ساتھ ہی اخبارات اور صحافیوں کی شرارت پر روک لگانے والے قوانین بھی نافذ کیے گئے ہیں اور یہ بات نظر انداز کی گئی کہ بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اخبارات کی آزادی پر بظاہر پابندیاں عائد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ زیر بحث آرڈی ننس کے جاری کرنے کا ریاستی حکومت کے پاس کوئی ایسا معقول اور موزون جواز نہیں ہے کہ جسے وہ دنیا کے سامنے پیش کر کے اسے مطمئن کر سکے۔ اس لیے غیر ملکی خطرے کا ہوا کھڑا کر کے ہندوستانی عوام کے اندیشہ ہائے دور دراز کو تقویت پہنچائی جارہی ہے تاکہ ملک کے دفاع اور سالمیت کے نام پر کچھ لوگ اس ناجائز اور ناروا قانون کو ہضم کرسکیں ، خوش قسمتی سے ہندوستانی عوام پچھلے دس پندرہ برسوں میں اتنے بالغ اور دور اندیش ہو گئے ہیں کہ وہ آج فرضی خطرات اور توہمات کی خاطر اپنی آزادی اور عزت و آبرو کو گروی رکھنے پر آمادہ نہیں کیے جا

سکتے ۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی اندرونی حالت اور پاکستانی حکمرانوں کے خطرناک عزائم کی دہائی دینے کے باوجود ملک بھر میں اس کالے قانون کی حمایت میں ابھی تک ایک آواز بھی نہیں اٹھی ہے اور نہ اٹھنے کا امکان ہے، اس پسِ منظر میں بہترین صورت یہ تھی کہ شیخ صاحب کی حکومت آرڈی ننس کو واپس لے کر اپنی جمہور پسندی اور وسیع القلبی کا ثبوت فراہم کرتی ۔ لیکن ان کے ذہن میں جمہوریت اور انصاف کا جو تصور ہے اس کے پیش نظر ان سے اِس طرز عمل کی توقع رکھنا بے کار ہے، غالباً اسی لیے ورکنگ جرنلسٹس نے سارے آرڈی ننس کو واپس لینے کا مطالبہ کرنے کی بجائے اخبارات اور مدیروں سے متعلق دفعات کو کالعدم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ ہماری دانست میں اخبارات اور اخبار نویسوں کی آزادی، فرد کی آزادی اور اس کے بنیادی حقوق سے وابستہ ہے اور اخبارات کے لیے کسی ایسی آزادی کا تصور ناممکن ہے کہ جو فرد کو اس کی ذاتی حیثیت سے حاصل نہ ہو۔ اس لیے ورکنگ جرنلسٹس کے مطالبے کی معقولیت کو تسلیم کرنے کے باوجود ہم اس کی افادیت کے قائل نہیں ہیں اور جب تک آرڈی ننس کی وہ تمام دفعات کالعدم قرار نہیں دی جائیں کہ جن سے شہریوں کے بنیادی حقوق اور ان کی آزادیاں سلب ہو جاتی ہیں، صرف پریس کے متعلق قوانین کی منسوخی ہمارے درد کا مداوا نہیں ہوسکتیں۔ اخبار والوں کے پاس قلم ہے، زبان ہے اور احتجاج کے دوسرے ذرائع بھی۔ لیکن اُن بے زبان بے گناہ اور بے بس شہریوں کی بات کون کرے گا جن کی جائز سرگرمیوں اور نقل و حرکت پر پابندیاں عائد کرنے کے لیے موجودہ آرڈی ننس میں ایسی ایسی زنجیریں فراہم کی گئی ہیں کہ جن کی موجودگی میں ان کے لیے سانس لینا بھی دشوار ہوگا۔ اب جب کہ وزیر اعظم جناب شیخ محمد

عبداللہ نے اس بات کی یقین دہانی کی ہے کہ ریاستی اسمبلی میں بحث کے دوران اس آرڈی ننس میں مناسب ترامیم کرنے پر سنجیدگی سے غور ہوگا، میر واعظ مولوی محمد فاروق کی یہ تجویز نہایت معقول نہایت اور برمحل ہے کہ اسمبلی میں یہ بحث مباحثہ مکمل ہونے تک اس کالے قانون پر عمل درآمد ملتوی کیا جائے تاکہ تین ماہ کے اس مختصر سے وقفے کے دوران بھی کسی بے گناہ اور بے زبان کو ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے آرڈی ننس کا تختہ مشق نہ بنایا جائے۔ ورکنگ جرنلسٹس نے اپنی قرارداد میں حکومت کی توجہ اس اس امر کی طرف مبذول کی ہے کہ اخبارات کی کسی بھی شرانگیزی اور شرارت کا تدارک کرنے کے لیے مروجہ قوانین میں کافی گنجائش ہے۔ ہماری رائے میں دوسرے ناپسندیدہ عناصر سے نمٹنے کے لیے بھی تعزیرات ہند میں بہت سی دفعات موجود ہیں۔ اور خصوصی اختیارات کا سہارا لینے کی بجائے ان قوانین کو ہی بروئے کار لانا چاہیے۔

☆☆☆

۲ر دسمبر ۱۹۷۷ء

مسئلہ آٹونامی کا

نیشنل کانفرنس جموں کے صوبائی صدر مسٹر بلراج پُوری نے ریاست کے تین خطوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم میں جدید انتظام اور جموں صوبے کے لیے آٹانومی کا مطالبہ کر کے ریاستی سیاسیات کی خاموش جھیل میں ایسا پتھر پھینکا ہے جس نے فوراً جھیل کی بظاہر پُرسکون سطح پر لہریں پیدا کر دی ہیں۔ نیشنل کانفرنسی حلقوں نے ابھی اس اہم استفسار پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا ہے لیکن پردیش کانگرس کے لیڈروں نے اس کو اپنے جماعتی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے کاروائی شروع کر دی ہے اور انہوں نے اسے ایک امکانی خطرے کا سگنل بتایا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایڈہاک کانگرس کے نائب صدر خواجہ غلام رسول کار کا وہ بیان قابلِ غور ہے جس میں اُنہوں نے اس مطالبے کی کڑی نکتہ چینی کر کے اسے جن سنگھ اور دیگر فرقہ پرستوں کی ذہنیت کی صدائے بازگشت قرار دیا ہے۔ اس مسئلے کے سیاسی امکانات پر گفتگو کرنے سے پہلے کچھ ابتدائی اور تعارفی امور کو حافظے میں تازہ کرنا مناسب ہوگا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جن دوستوں کو مسٹر بلراج پوری کے سیاسی نظریات کا علم ہے وہ جانتے ہیں کہ پُوری صاحب ایک زمانے سے جموں کے لیے آٹانومی کا مطالبہ کرتے آئے ہیں اور

وہ اس بات کے قائل ہیں کہ جموں کے ساتھ اُن کے بقول کی گئی بے انصافیوں کا ازالہ جموں کو جموں و کشمیر کے بڑے دائیرے میں آٹانومی دیکر ہی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ مدت تک جموں آٹانومی لیگ کے صدر رہے، لیکن یہ معاملے کا صرف ایک پہلو ہے، واقع یہ ہے کہ کانگرس میں بھی اُن کے ہمنواؤں کی کمی نہیں ہے اور لوگوں کی بات جانے دیجیے۔ جموں میں کانگریس کے سب سے پُرکشش لیڈر ڈاکٹر کرن سنگھ اس مطالبے کے قائل ہی نہیں، بلکہ اس کے موجد بھی ہیں۔ آج سے کوئی دس سال قبل انہوں نے ''ٹائمز'' لندن کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں جموں اور کشمیر کو لسانی بنیادوں پر تقسیم کرنے کا نعرہ بلند کیا تھا۔ بعد میں مرکز کے سخت رویے نے اگرچہ اُن کو زبان بندی پر مجبور کر دیا، لیکن اُن کے نظریے کے بارے میں خود کانگریسی دوستوں کو بھی غلط فہمی نہیں۔ اگر ان حالات میں غلام رسول کار صاحب کو بلراج پوری کے مطالبے پر تاؤ آ گیا ہے تو انہیں اپنے لیڈر ڈاکٹر کرن سنگھ کے خیالات اور فرمودات کو بھی زیر نظر رکھنا چاہیے۔

جہاں تک بلراج پوری صاحب کے مطالبے کی ٹائمنگ کا تعلق ہے وہ بڑی حد تک معنی خیز ہے۔ پُوری صاحب نیشنل کانفرنس کے ایک اہم عہدیدار ہیں اور حیرت ہے کہ انہوں نے یہ مطالبہ پارٹی کے اندر اُٹھانے کی بجائے اور اپنی لیڈر شپ کا عندیہ معلوم کرنے کے بغیر کیوں عوامی سطح پر پیش کر دیا۔ شاید اس کی ایک وجہ جماعتوں کی قلابازی سے ہو جو انہوں نے انتخابات کی آمد آمد کے پیش نظر شروع کر دی ہے۔ یہ بات راز نہیں ہے کہ جموں میں نیشنل کانفرنس کا تنظیمی ڈھانچہ ابھی عوامی سطح پر اُس طرح اُستوار نہیں ہو سکا ہے جس طرح کشمیر میں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ جموں میں اُسے پردیش کانگریس کی طرف سے کشمیر کی بہ نسبت کئی گنا زیادہ بڑے چلینج کا سامنا ہے۔ اس لیے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ

بلراج صاحب نے دراصل یہ عوام پسند نعرہ جموں میں اپنی اور اپنی جماعت کی جذباتی اپیل بڑھانے کے لیے کیا ہو۔ نیشنل کانفرنس اس وقت ریاست میں اصل اقتدار کی مالک ہے اور اس کے کسی ذمہ دار لیڈر کی طرف سے اس مطالبے کا عام اظہار ایسی بات نہیں ہے جسے محض افسانہ سرائی اور داستان گوئی کہہ کر نظر انداز کیا جا سکے۔

☆☆☆

۲۰/جولائی ۱۹۷۶ء

مسز اندرا گاندھی کا سایہ

مسز گاندھی کے حالیہ بیانات اوران کی تازہ سرگرمیوں سے اس امکان کو تقویت ملنے لگی ہے کہ وہ ایک بار پھر سیاست میں سرگرم ہو کر اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گی ۔ بی ، بی ، سی سے ایک انٹرویو، آچاریہ ونوبا سے ملاقات اور پبلک جلسوں میں ان کی بعض تقاریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ باضابطہ طور اپنی سرگرمیاں شروع کرنے سے پہلے وہ ملک کے سیاسی ماحول، عوامی ردِعمل اور اپنی جماعت کی موجودہ ہئیت کا اندازہ کرنا چاہتی ہیں ۔ عام حالات میں مسز گاندھی کی اس خواہش اور کوشش پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ان کے ارادوں سے بہت سے سیاستدانوں کو بجا طور پر تشویش لاحق ہو رہی ہے اور مشہور مارکسٹ لیڈر نمبو دری پد نے مسز گاندھی کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے کچھ ہنگامی اقدامات کرنے کا بھی مشورہ دیا ہے ۔ جنتا پارٹی کے لیڈر اگرچہ مسز گاندھی کی حالیہ سرگرمیوں کے متعلق کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کر رہے ہیں لیکن یہ کہنا غلط ہو گا کہ وہ مسز گاندھی کے وجود کو نظرانداز کر رہے ہیں یا ان کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی کامیابیوں اور اپنے موجودہ استحکام کے باوجود اگر انہیں کسی جانب سے کوئی خطرہ محسوس ہو رہا ہے تو وہ مسز گاندھی ہیں ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی اپنی جماعت کانگریس میں

بھی ان کی آمد آمد سے بے چینی اور پریشانی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔

بادی النظر میں یہ بات حیران کن ہے کہ ایک ہاری ہوئی اور انقلابِ زمانہ کی ماری ہوئی عورت سے اتنے طاقتور اور آزمودہ کار سیاسی کھلاڑی اس طرح سے خائف ہوں، کہ جیسے وہ کوئی عورت نہ ہو، کوئی مافوق البشر قوت ہو، لیکن نفسیات کے ماہروں اور سیاسی تاریخ کے طالب علموں کو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ مسز گاندھی اپنی ہار کے باوجود عوام اور سیاستدانوں کے ذہنوں پر کیوں سوار ہے، اور اپنی ذلت اور رسوائی کی موجودہ حالت میں بھی اس کا سایہ ہندوستانی سیاست کے افق پر کیوں لہرایا ہے؟ ہماری دانست میں اس کا سبب مسز گاندھی کی ''محبوب'' شخصیت یا ان کی غیر معمولی، طاقت نہیں بلکہ موجودہ حکمرانوں اور سیاستدانوں کی اپنی کمزوریاں ہیں۔ مسز گاندھی اور ان کی جماعت کی شکست بنیادی طور پر ایمرجنسی اور اس کے نام پر کی جانے والی زیادتیوں کے خلاف عوامی احتجاج کا نتیجہ تھی۔ دوسرے الفاظ میں یہ ایک منفی ووٹ تھا اور اس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ ہندوستانی عوام جمہوریت کی قیمت دے کر اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے تیار نہیں۔ مارچ ۷۷ء کے انتخابات میں انہوں نے یہ ثابت کر دیا۔ اب اس کے بعد وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ نئے حکمران جمہوری نظام میں ان کی زندگی کی تلخیاں، روزمرہ کی مشکلات اور ان کے دُکھ درد کو دُور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ اگر موجودہ حکومت کے رہنما، بے کاری، بے روزگاری، مہنگائی، بیماری اور کورپشن کو دور کرنے کا اپنا وعدہ نبھانے میں کامیاب رہے تو مسز گاندھی اپنی تمام سر عیاریوں اور شاطرانہ چالوں کے باوجود اپنی کمین گاہ سے باہر نہیں آسکیں گی چاہے انہیں سرکاری سادھو آچاریہ ونوبا کی حمایت حاصل ہو یا چودھری بنسی

لال جیسے ڈاکو کی ، اس کے برعکس اگر جنتا سرکار کے سادھو عام لوگوں کے جذبات اور ان کی مشکلات سے بے نیاز ہو کر صرف جمہوریت اور آزادی کی باتیں کرتے رہے تو اس بات کا زبردست امکان ہے کہ ایک دن لوگ مسز گاندھی کو زبردستی اُن کی خلوت گاہ سے باہر لا کر موجودہ حکومت کے خلاف اپنی بغاوت اور نفرت کی علامت بنائیں گے۔ پھر اس کے بعد اس ملک میں کوئی جمہوریت، آزادی اور بنیادی حقوق کی بات نہیں کرے گا۔ مسز گاندھی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ اس بات کا فیصلہ اس ملک کے عوام کریں گے کہ انہیں دوبارہ سیاست میں آنا چاہیئے یا نہیں۔ مرار جی ڈیسائی اور ان کے ساتھی مسز گاندھی کے وجود کو نظر انداز کرنا چاہیں تو کریں لیکن وہ مسز گاندھی کی شخصیت سے وابستہ کچھ حقائق کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

نومبر ۱۹۷۷ء

پاکستانی نسخہ

انتخابات سے پہلے، انتخابات کے دوران اور انتخاب کے بعد ریاستی حکومت کے قائدین اتنی بار راولپنڈی روڈ کھولنے کا مطالبہ اور وعدہ کر چکے ہیں کہ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اسمبلی کے انتخابات میں رائے دہندگان نے شیخ صاحب کو نہیں بلکہ راولپنڈی روڈ کو ووٹ دیئے۔ ہم اگرچہ اس خیال سے بالکل متفق نہیں ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ نیشنل کانفرنسی رہنماؤں نے انتخابی مہم کے دوران راولپنڈی روڈ کا بے تحاشا استعمال کیا، اور بہت سے سادہ لوح دیہاتیوں نے اس پرفریب نعرے سے مسحور ہو کر نیشنل کانفرنسی کھمبوں کو ووٹ دیئے، لیکن حکومت بنانے کی دیر تھی کہ شیخ صاحب اور بیگ صاحب نے راولپنڈی روڈ کی بجائے راولپنڈی کے خطرے کی باتیں کرنا شروع کر دیں اور راتوں رات وہ اتنے زبردست ہندوستانی بن گئے کہ بہت سے ہندوستانی جنرلوں کو بھی ان کی حب الوطنی پر رشک آنے لگا۔ اب صورت یہ ہے کہ ہمارے ان قائدین محترم کو راولپنڈی سے ایسے ایسے خطرے لاحق ہو گئے ہیں کہ انہوں نے ان فرضی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے پبلک سیفٹی ایکٹ آرڈی ننس کے نام سے اصلی ہتھیاروں کا ایک خطرناک ذخیرہ جمع کر دیا ہے، اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس اسلحہ سازی کے لیے شیر کشمیر اور فخر کشمیر بالکل وہی

دلیلیں اور جواز دے رہے ہیں کہ جو آج سے ۲۴ سال پہلے مرحوم بخشی غلام محمد اور ان کے بعد خواجہ غلام محمد صادق اور سید میر قاسم دیتے آئے ہیں۔ بخشی صاحب کے دورِ اقتدار میں پاکستان نے مسئلہ کشمیر کے نام پر پوری دنیا میں ایک اودھم مچایا ہوا تھا۔ صادق صاحب کے دور میں پاکستان نے کشمیر میں دراندازی کر کے باقاعدہ ایک جنگ کا آغاز کیا اور قاسم صاحب کے عہد میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک خون ریز جنگ لڑی گئی۔ اس لیے یہ لوگ اگرچہ پاکستان کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے خطرناک قوانین کا سہارا لینے میں بہت حد تک حق بجانب تھے لیکن اس کے باوجود ہم نے ان کالے قوانین کو غیر ضروری، غیر جمہوری اور آمرانہ قرار دے کر ان کی معقولیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ ہمارا موقف یہ تھا کہ پاکستانی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے بنائے گئے یہ قوانین بالآخر سیاسی مخالفین کے خلاف استعمال کیے جائیں گے، اور اس میں شک نہیں کہ اکثر اوقات یہی ہوا بھی، اور پاکستانی خطرے کا سد باب کرنے کے لیے بنائے گئے زیادہ تر قوانین کا اطلاق شیر کشمیر، فخر کشمیر اور ان کے ساتھیوں پر ہی ہوا۔ حد یہ ہے کہ شیخ صاحب کو ۱۹۷۱ء میں ریاست بدر کرنے کا قانون بھی صرف پاکستانی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ہی نافذ کیا گیا تھا۔ لیکن جب حاکمانِ وقت کو شیخ صاحب کے سیاسی خطرے سے نپٹنے میں دِقت محسوس ہوئی تو انہوں نے بلا تامل اس کا استعمال کیا۔ اس کے برعکس آج ہندوستان اور پاکستان کی سیاسی صورت حال اس درجہ مختلف ہے کہ پاکستان کا بدترین سے بدترین دشمن بھی پاکستانی حکمرانوں پر یہ الزام عائد نہیں کر سکتا کہ وہ کشمیر میں کسی شرارت کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ وہ بے چارے اپنے اندرونی مخمصوں میں اس طرح

الجھے ہوئے ہیں کہ کشمیر کی تو بات ہی نہیں۔ان کے لیے ''آزاد کشمیر'' کو سنبھالنا بھی مشکل نظر آتا ہے۔ شیخ صاحب نے کہا ہے کہ جب تک پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کشمیر کا تنازعہ باقی ہے، ریاست میں اس قسم کے قوانین کی ضرورت باقی رہے گی۔ ٹھیک یہی بات مرحوم بخشی صاحب، مرحوم صادق صاحب اور سید میر قاسم بھی کہا کرتے تھے۔ اس لیے پبلک سیفٹی آرڈی ننس نافذ کر کے شیخ صاحب نے صرف یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اپنے پیش رووں سے کسی لحاظ سے بھی مختلف نہیں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ شیخ صاحب کو اپنی پارسائی کا دعویٰ ہے اور ان کے پیش رؤں کو اپنی گناہ کاری اور انکساری کا احساس تھا۔ پاکستان کے نام کو انہوں نے بھی اپنے ذاتی اقتدار کے لیے استعمال کیا اور پاکستان کے نام کو شیخ صاحب اور بیگ صاحب بھی جی بھر کے استعمال کر رہے ہیں۔ جب تک پاکستان سلامت ہے، ہمارے حاکموں کو گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ وہ نسخہ ہے کہ جسے وہ اپنے ہر ناجائز کام اور قانون کو صحیح ثابت کرنے کے لیے استعمال کرتے رہیں گے۔

☆☆☆

۱۰ر نومبر ۱۹۷۷ء

ش احمد کے قلم سے

پاکستان کا ہوا

وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے جب اپنی جماعت کی انتخابی مہم کے دوران پاکستان کے انتخابات میں مسٹر بھٹو اوران کی پیپلز پارٹی کی فتح کا حوالہ دے کر رائے دہندگان سے یہ اپیل کی کہ وہ ہندوستان میں بھی ایک مضبوط اور مستحکم حکومت قائم کرنے کے لیے کانگریس کو ووٹ دیں تو اکثر لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ مسز گاندھی، مسٹر بھٹو کا ہوا کھڑا کر کے رائے دہندگان کو خوفزدہ کرنا چاہتی ہیں، تاکہ وہ مسز گاندھی کو اپنا نجات دہندہ سمجھ کر ان کی جماعت کو بے تحاشا ووٹ دیں۔ مسز گاندھی کے اس فرضی اندیشے کی کوئی بنیاد ہے یا نہیں، اس سے قطع نظر، انتخابی حکمت عملی کے اعتبار سے مسز گاندھی کا یہ سِٹنٹ قابلِ فہم ہے۔ لیکن جب شعوری یا غیر شعوری طور پر وزیر اعلیٰ جناب شیخ محمد عبداللہ بھی محل بے محل، پاکستان کی طرف سے لاحق خطرے کا راگ الاپنا شروع کر دیں تو یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہو جاتی ہے...... سانبہ (جموں) میں کل نیشنل کانفرنس اُمیدوار شری بلراج پوری کی انتخابی مہم کے سلسلے میں معلوم نہیں، شیخ صاحب پاکستان کا ذکر کیوں بیچ میں لائے، اخباری اطلاعات کے مطابق شیخ صاحب نے کہا ہے:

"لوگوں کو چاہیئے کہ وہ پاکستان میں غیر معمولی فوجی تیاریوں کے پیشِ نظر اپنا اتحاد و اتفاق برقرار رکھیں، پاکستان اس سے پہلے دو بار ریاست پر حملہ کر چکا ہے اور اگرچہ وہ اس وقت بظاہر خاموش ہے لیکن وہ مستقل طور پر ریاست پر اپنے حق سے دست بردار نہیں ہوا ہے"۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ شری بلراج پوری کی انتخابی مہم اور پاکستان کا کشمیر پر حق جتانے سے کیا تعلق ہے؟ اور شیخ صاحب ایک بالکل غیر متعلق مسئلے کو ایک مقامی مسئلے کے ساتھ جوڑ کر کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کی غیر معمولی فوجی تیاریوں کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ لیکن پاکستان کی موجودہ صورتِ حال سے اگر کچھ ظاہر ہوتا ہے تو وہ یہ کہ پاکستان ایک خطرناک اندرونی بحران کا شکار ہے، اور مسٹر بھٹو انتخابات میں اپنی غیر معمولی کامیابی کے باوجود حد درجہ ہراساں اور بدحواس نظر آتے ہیں۔ ان حالات میں پاکستان ہندوستان کے خلاف کسی فوجی کاروائی کا اہل ہے یا نہیں، ہم نہیں جانتے، لیکن اگر عقلِ سلیم اس سلسلے میں ہماری کوئی رہبری کر سکتی ہے تو ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ پاکستان کی طرف سے فی الحال کسی بھی فوجی کاروائی کا کوئی خطرہ نہیں، اور شری بلراج پوری کو جتانے کے لیے پاکستانی حملے کا ہوا کھڑا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اِس کے برعکس اصل صورتِ حال یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات پچھلے دو سال سے اس درجہ خوشگوار ہو گئے ہیں کہ حملے کی بات ہی نہیں، دونوں ممالک کے ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر ہونے کا خوش کن امکان پیدا ہو گیا ہے۔ اس پسِ منظر میں شیخ صاحب کا خواہ مخواہ پاکستانی مردے کو گھسیٹ لینا افسوناک ہے، ابھی زیادہ

عرصہ نہیں گزرا کہ شیخ صاحب ہند پاک مفاہمت اور دوستی کو اپنی زندگی کا واحد مقصد بنانا چاہتے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وزیر اعلیٰ بن جانے کے بعد ان کا مقصد حیات ہی نہیں نکتۂ نگاہ بھی بدل گیا ہے اور اب اُنہیں وہاں سے بھی خطرہ نظر آتا ہے کہ جہاں سے کسی خطرے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ افسوس کہ جس رہنما کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بدظنی اور بے اعتمادی ختم کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے تھا وہ بلراج پوری کو کامیاب بنانے کے لیے پاکستان کے فرضی خطرے کا الارم بجا رہا ہے۔ یہ ہماری ہی نہیں پورے برصغیر کی بدقسمتی ہے۔

☆☆☆

۱۹/مارچ ۱۹۷۷ء

پولیس

مرکزی سرکار نے مرکزی پولیس افسروں کی توجہ اس بات کی طرف پھیر دی ہے کہ پولیس کے افسران سرکاری گاڑیوں کا استعمال اپنے ذاتی کاموں کے لیے کرتے ہیں اور جو اردلی اُن کے ساتھ متعین کیے جاتے ہیں وہ اُن کے گھروں میں گھریلو نوکروں کی طرح رہتے ہیں۔ ان پولیس افسروں سے کہا گیا ہے کہ قانوناً یہ دونوں باتیں ممنوع ہیں اور ان سے فوری طور پر پرہیز لازمی ہے۔ یہ حکم اگرچہ مرکزی سرکار نے پولیس افسروں کو دیا ہے لیکن اس کا اطلاق ریاستی پولیس افسروں پر بھی ہونا چاہئیے۔ جو سرکاری گاڑیوں کا استعمال اپنے ذاتی مفاد کے لیے کرتے ہیں اور اردلیوں سے خانگی نوکروں اور خادموں کا کام لیتے ہیں۔ آپ کسی بھی پولیس افسر کی رہائش گاہ کو دیکھئے، دن رات کے اکثر حصے میں ایک سرکاری گاڑی باہر کھڑی نظر آئے گی۔ اور اس کے گھر کے اندر دیکھئے تو اردلی پرائیوٹ کام کرنے کے لیے موجود ہوں گے۔ اس صورت حال کو جس طرح مرکزی سرکار نے غلط اور قابل اصلاح سمجھا ہے اسی طرح ریاستی سرکاروں کو بھی اس کا جائیزہ لے کر اس کا تدارک کرنا چاہیے۔ یہ دراصل ہمارے سماج میں دور غلامی کا ایک ورثہ ہے۔ جس میں پولیس کے افسران لوگوں پر رعب جمانے اور انہیں ڈرانے دھمکانے کے کام پر مامور ہوتے تھے، آزادی حاصل کرنے کے بعد اس مفہوم اور اس کے تصور کو سرے سے بدلنا چاہیے تھا اور پولیس کے افسروں کے اندازِ فکر و عمل میں بھی تبدیلی آنا

چاہیے تھی مگر ایسا نہیں ہوا۔ پولیس دراصل امن وامان قائم رکھنے اور امن شکن عناصر کو راہ راست پر لانے کے لیے ہوتی ہے اور اس میں بھی افہام وتفہیم اور تعلیم و تربیت کو خاصا دخل ہونا چاہیے۔ تشدد اور خوف و ہراس پھیلانے سے کسی کی اصلاح نہیں ہوتی۔ ایمرجنسی کے دوران بعض پولیس افسروں نے جس درندگی اور بہمیت کا مظاہرہ کیا ہے وہ اب زبان زد عام ہے اور اسی سے اندازہ لگتا ہے کہ آزادی کے ۳۰ سال میں اس بنیادی بات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے اور پولیس کے افسران کو خدمت خلق کا محافظ بنانے کے بجائے اُنہیں ڈرانے دھمکانے کی ایجنسی کا ایجنٹ بنا دیا گیا ہے۔ پولیس کے افسر کو دیکھ کر ہر شریف اور امن پسند انسان کو حفاظت اور اطمینان کا احساس ہونا چاہیے مگر ہوتا یہ ہے کہ پولیس کا نام سُنتے ہی شرفاء پر مُردنی چھا جاتی ہے اور امن شکن عناصر ان سے بالکل خائف نہیں ہوتے، سرکاری گاڑیوں کے بے جا استعمال اور اردلیوں کو نوکروں کے طور پر کام کرانے والے پولیس افسروں کی سوچ کبھی ایسی نہیں ہو سکتی جن سے پولیس کے وجود اور بقائے امن کی ضمانت مل سکتی ہو، یہ ایک اہم مسئلہ ہے اور حکومت کو پولیس کے بنیادی طریق کار میں اصلاح کی طرف فوری توجہ دینی چاہیے، اس اہم کام میں پہلے ہی بہت دیر کر دی گئی ہے۔

☆☆☆

۷/جون ۱۹۷۷ء

سرینگر میں شیعہ سُنی کا سوال

سرینگر کے پارلیمانی حلقہ انتخاب کی یوں تو کئی خصوصیات ہیں لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ نیشنل کانفرنس کی اُمیدوار بیگم شیخ محمد عبداللہ کے مقابلے میں ایک مذہبی فرقے کے رہنما مولوی افتخار حسین انصاری، بحیثیت آزاد اُمیدوار کے کھڑے ہیں۔ میری رائے میں مولوی افتخار صاحب کا شیعہ ہونا محض ایک اتفاق ہے اور ان کے مذہبی منصب کا ان کے موجودہ سیاسی رول سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود پچھلے کئی ہفتوں سے بعض عناصر کی طرف سے ایک خالص سیاسی اور انتخابی معرکے کو فرقہ وارانہ رنگت دینے کی کوشش کی جارہی ہے اور ہماری اطلاعات کے مطابق اس جرم میں دونوں فریق برابر کے شریک ہیں۔ مولوی افتخار حسین انصاری اور ان کے ساتھیوں پر یہ الزام عائد کیا جارہا ہے کہ وہ اپنے شیعہ ہونے کو اس لیے اچھال رہے ہیں کہ انہیں شیعہ رائے دہندگان کے زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل ہوں اور اس مقصد کے لیے وہ کہیں برملا طور اور کہیں خفیہ طریقے پر اپنی مذہبی حیثیت کو اُبھار رہے ہیں۔ ہم کہہ نہیں سکتے کہ ان اطلاعات میں کہاں تک صداقت ہے اور اگر یہ صحیح ہیں تو ان سے مولوی صاحب کا نقصان زیادہ ہوگا یا فائدہ، یہ کہنا مشکل ہے لیکن ہمارے لیے تشویش کی بات یہ ہے کہ نیشنل کانفرنس کے کچھ ذمہ دار اور سرکردہ لیڈروں کے بارے میں یہ شکایت سننے میں آئی ہے کہ وہ مولوی افتخار حسین انصاری کے خلاف اپنی پروپیگنڈا مہم میں

ان کے شیعہ ہونے کو خالص فرقہ وارانہ رنگ میں پیش کر رہے ہیں اور اگر ہماری اطلاعات صحیح ہیں تو مولوی صاحب کے خلاف سب سے زیادہ موثر طریقے پر یہی حربہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس انتہائی غلط طریق کار نے ایک نہایت ہی افسوس ناک صورت حال کو جنم دیا ہے اور شہر میں منظّم طور پر نہ سہی پر اسرار طریقے پر شیعہ اور سُنی تناؤ پیدا کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ فرقہ وارانہ جذبات بھڑکانے کی یہ روش مولوی افتخار حسین انصاری کے حق میں یقیناً مفید ثابت نہیں ہوگی لیکن نیشنل کانفرنسی لیڈروں کو اس شرانگیز مہم کے مضمرات سے آگاہ ہونا چاہیے۔ وہ افتخار حسین انصاری کو شکست دینے کے لیے اپنے ماضی، اپنے سیاسی موقف اور اپنے کردار کو ملوث نہیں کر سکتے۔ انہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ ایک سیاسی تنظیم کی حیثیت سے انتخاب لڑ رہے ہیں اور ان کے امیدوار کی فتح وشکست سے زیادہ اس بات کی اہمیت ہے کہ وہ اپنی تنظیم کے وقار اور اس کے کردار کو برقرار رکھ سکیں۔ اگر کانفرنسی لیڈروں نے ہر قیمت اور ہر جائیز و ناجائیز طریقہ آزما کر اپنے امیدوار کی کامیابی کا پروگرام بنایا ہے تو یہ الگ بات ہے لیکن اگر وہ بیگم صاحبہ کی کامیابی کو اصولوں اور اقدار کی جنگ بنانا چاہتے ہیں تو اُنہیں مولوی افتخار حسین انصاری کی سطح سے اونچا اٹھنا پڑے گا۔ جہاں تک سرینگر کے رائے دہندگان کا تعلق ہے انہیں یہ بات ذہن نشین کرنا چاہیے کہ سرینگر کا انتخابی مقابلہ محض ایک محدود نوعیت کا سیاسی معرکہ ہے اور بس، اس سے نہ شیعوں کا وقار وابستہ ہے اور نہ سُنیوں کا مستقبل۔ یہ الگ سوال ہے کہ سیاسی غرض مندوں نے ہمیشہ مذہب کا اپنے حقیر مفادات کے لیے استعمال کیا ہے۔

☆☆☆

۱۵ر مارچ ۱۹۷۷ء

حکومت یا دُکان

سابق وزیر اعلیٰ جناب شیخ محمد عبداللہ نے دو سال قبل خوراک پر دی جانے والی سبسڈی کو ختم کرنے کا جواز دیتے ہوئے اس ریاست کو ایک دُکان سے تشبیہہ دی تھی۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ جس دُکان کا خرچہ اس کی آمدن سے زیادہ ہو، وہ دُکان کیسے چل سکتی ہے۔ اور آج نہیں تو کل ایسی دُکان دیوالیہ ہو گی۔ ریاست کو دُکان سے تشبیہہ دے کر نظامِ حکومت کو دُکانداری کا نام دینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ریاست کی معشیت اور اقتصادیات کے متعلق کشمیر کے قائداعظم کا تصوّر کیا ہے۔ یہ غالباً ریاست اور سیاست کی تاریخ میں پہلا موقع ہے کہ جب کسی لیڈر نے ریاست کو دُکان اور حکومت کو دُکانداری کا نام دے کر انتظامیہ کی کارکردگی کو نفع اور نقصان کے پیمانوں سے ناپنے کی کوشش کی ہے۔ شیخ صاحب کے اِس دُکاندارانہ نظریئے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ان کے صاحبزادے طارق عبداللہ نے ٹورسٹ ڈیولپمنٹ کارپوریشن کا انتظام سنبھالنے کے فوراً بعد سینکڑوں ملازمین کو صرف اس لیے برطرف کر دیا کہ ان کو بے روزگار بنائے بغیر ٹورسٹ کارپوریشن منافع نہیں کما سکتی۔ باپ بیٹے کی مشترکہ کاوشوں اور ان کی دُکانداری کے نتیجے میں دو سال کے اندر اندر سینکڑوں برسرروزگار نوجوان بے کار ہو گئے لیکن خالص دُکانداری کے معیار پر ریاست منافع کماتی رہی اور شیخ صاحب اپنے آپ کو یہ اطمینان دلاتے رہے کہ ان کی قیادت میں سرکار کچھ کرے نہ کرے، وہ گھاٹے پر نہیں چل رہی ہے۔ ہم نے متعدد بار شیخ صاحب کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی

کہ ریاست اور حکومت کاروباری ادارے نہیں کہ ان کی کارکردگی کو خالص نفع اور نقصان کے معیاروں پر پرکھا جائے لیکن شیخ صاحب کے ذہن پر دُکان اور دُکان داری کی مثال کچھ اس طرح مسلّط ہوگئی تھی کہ وہ پورے دو سال تک اس مخمصے سے باہر نہیں آسکے۔ وہ بار بار اپنا یہی موقف دُہراتے رہے کہ میں کہاں سے لاؤں اور میری یہ دُکان کیسے چلے گی۔

اب شیخ صاحب برسر اقتدار نہیں ہیں اور موجودہ سیاسی صورت حال کے پیش نظر مستقبل میں ان کے برسر اقتدار آنے کا بھی کوئی اندیشہ نہیں اس لیے ہم ان سے مودبانہ گذارش کریں گے کہ وہ اقتصادیات اور معاشیات کے متعلق اپنے نظریات اور تصوّرات کو سائنٹیفک بنیادوں پر مرتب کریں۔ حکومت اور دکانداری میں ایک بنیادی فرق ہے اور جس لیڈر یا وزیر اعلیٰ کو یہ فرق معلوم نہ ہو وہ کسی قیمت پر بھی عوام کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ دُکانداری کا واحد مقصد نفع کمانا ہوتا ہے لیکن ریاست اور حکومت کو نفع ونقصان سے زیادہ عوامی سؤدوبہبؤد کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کے بہت سے ادارے صرف اس لیے گھاٹے پر چلائے جاتے ہیں کہ ان سے عام لوگوں کو سہولیت ملتی ہے اور روزگار فراہم ہوتا ہے اور بہتر زندگی گذارنے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ کہ شیخ صاحب نے اپنے دو سالہ دور اقتدار میں ریاست کے شفاخانوں کو بھی تجارتی اداروں کی طرح نفع ونقصان کی بنیادوں پر چلانے کے لیے غریب تیمارداروں کو خوراک اور دوائی سے محروم کردیا۔ اب جب کہ ان کے اقتدار کا سورج غروب ہوگیا ہے ہم توقع کرتے ہیں کہ ان کے دور اقتدار میں غریب لوگوں سے چھینی ہوئی تمام مراعات انہیں واپس ملیں گی۔

☆☆☆

۱۲/اپریل ۱۹۷۷ء

ایک مخلصانہ مشورہ

نیشنل کانفرنس کی قیادت اتنی تجربہ کار، جہاں دیدہ اور ہمہ دان ہے کہ اس تنظیم کے قائدین محترم کو ہمارا کوئی مشورہ دینا چھوٹا مُنہ اور بڑی بات کے مصداق ہوگا۔ شیر کشمیر اور فخر کشمیر نے گزشتہ چالیس سال کے دوران اتنے سیاسی معرکے سر کیے ہیں کہ انہیں اس بات کا احساس دلانا کہ ۱۹۷۷ء کا سیاسی معرکہ باندازِ دیگر والی بات ہے، سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ان تجربہ کار، سینئر اور جہاں دیدہ بزرگوں کو ایک مشورہ دینا چاہتے ہیں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

آپ ایک سیاسی تنظیم چلا رہے ہیں، پان کی دُکان نہیں چلا رہے ہیں آپ اقتدار کی لڑائی لڑ رہے ہیں، کبڈی کا کھیل نہیں کھیل رہے ہیں۔ سُنا ہے کہ آپ کچھ اصولوں اور کچھ مقاصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اپنی انا اور اپنے خاندانی وقار کی جنگ نہیں لڑ رہے ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق آپ کی خواہش ہے کہ نیشنل کانفرنس کو آئندہ اسمبلی کے انتخابات میں اتنی اکثریت حاصل ہو، کہ آپ کو اپنی حکومت بنانے کا موقع ملے۔ اگر یہ ساری باتیں صحیح ہیں، اور اگر آپ کو واقعی یہ احساس ہے کہ نیشنل کانفرنس ایک سیاسی تنظیم ہے، کواپریٹو دُکان نہیں ہے تو پھر آپ کو چاہیے کہ آپ اپنی جماعت کے سیاسی پروگرام اور اپنے نظریات اور عقاید کی تبلیغ، اپنی سرگرمیوں اور اپنے مخالفین کے پروپگنڈا کا جواب دینے کے لیے باقاعدہ ایک روزنامہ یا ہفت روزہ اخبار جاری کیجیے۔ اس اخبار کی ادارت کسی مہذب، تعلیم یافتہ اور تجربہ کار صحافی کو سونپ دیجیے کہ جو صحافتی زبان میں آپ کے سیاسی پروگرام اور آپ کی سر

گرمیوں کی تشہیر کر سکے۔ ورنہ اِس بات کا خطرہ ہے کہ یومیہ اُجرت اور ماہانہ مشاہرے کے عوض آپ کے کچھ نادان دوست آپ کے موقف اور آپ کے مافی الضمیر کو اس طرح پیش کریں گے کہ آپ کو صرف اپنے پروگرام سے ہی نہیں، اپنے وجود سے بھی نفرت ہو جائے گی۔ پچھلے دو ایک ماہ سے یہی کچھ ہو رہا ہے اور اگلے چند ماہ کے دوران یہ سلسلہ کچھ زیادہ ہی زور پکڑے گا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ آپ کی نظروں سے ادب العالیہ اور اعلیٰ صحافت کے وہ نمونے گذرتے ہیں یا نہیں کہ جو آپ سے منسوب ہو کر بازارِ سیاست میں مفت تقسیم ہو رہے ہیں۔ لیکن قطع نظر اس کے کہ یہ خرافات اور مخلظات آپ کی نظر سے گذرتی ہیں یا نہیں، اس بات کا کوئی علاج نہیں کہ یہ ساری بے ہودگیاں آپ کے اور آپ کی تنظیم کے نام سے وابستہ ہوتی رہیں گی، جب تک کہ آپ باقاعدہ طور اپنی پارٹی کا ایک آفیشل آرگن شائع نہ کریں۔

ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ نیشنل کانفرنس کی صفوں میں پڑھے لکھے انسانوں کی کمی ہے اور ایک روزنامہ یا ہفت روزہ اخبار کے لیے نیشنل کانفرنس کو اول درجے کا کیا، تیسرے درجے کا بھی کوئی صحافی نہیں مل سکتا۔ لیکن اس کے باوجود تنظیم کے لیے ایک آفیشل آرگن کی ضرورت کو زیادہ دیر تک نہیں ٹالا جاسکتا۔ اور نیشنل کانفرنسی قائدین کو اگر بیرونِ ریاست سے بھی کچھ صحافی درآمد کرنا پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ورنہ خطرہ اس بات کا ہے کہ چند ٹکوں کے عوض اپنا قلم بیچنے والے ننگِ صحافت عرضی نویس صورت حال کا فائدہ اٹھا کر نیشنل کانفرنس کے نام اور اس کی شہرت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچائیں گے۔ شیخ صاحب اور بیگ صاحب کو کبھی کبھی اپنے دشمنوں کا مشورہ بھی مان لینا چاہیے۔

☆☆☆

۲۹ر اپریل ۱۹۷۷ء

تشدّد کی مذّمت کیجیے

الیکشن مہم کے دوران ہر اُمیدوار اپنی کامیابی کے لیے جلسے کرتا ہے، اپنی خوبیاں اور اپنے مخالف کی کمزوریاں بیان کر کے ووٹروں کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ جمہوریت نے ہر انسان کو یہ حق دیا ہے کہ خوف وخطر کے بغیر اپنی باتیں ظاہر کر سکے، اپنا حق جتا سکے اور اپنے مخالف کی کمزوریوں کو بے نقاب کر سکے۔ اِس سارے عمل میں جہاں ہر اُمیدوار کو اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی پوری آزادی ہے وہاں اُس پر یہ اخلاقی پابندی بھی ہے کہ وہ اپنے مخالف پر ذاتی حملے نہ کرے۔ کردار کشی کی کوشش نہ کرے، اور ایسے الزامات نہ لگائے جن کی کوئی بنیاد نہ ہو، ایسی صورت میں مدّ مقابل کو بھی حق ہے کہ وہ غلط الزامات کی تردید کرے اور رائے عامہ کو ہموار کر کے اپنے حق میں کرے اور اپنے حریف کو ہرادے۔ جمہوریت کا تقاضا ہے کہ یہ سارا عمل پُر امن ماحول میں ہو، دنگا فساد اور دھینگا مشتی جمہوریت کے اصولوں پر ایک کاری ضرب ہے۔ شیخ محمد عبداللہ نے بھی اپنے انتخابی جلسوں میں برابر انہی خیالات کا اظہار فرمایا ہے اور جہاں اُنھوں نے یہ فرمایا وہاں حاضرین سے جلال میں آ کر یہ بھی پوچھا کہ لوگ جب میری ذات کے خلاف الزامات لگاتے ہیں تو تم لوگ اسے برداشت کیسے کرتے ہو؟ ظاہر ہے کہ یہ سوال کر کے شیخ صاحب نے خود اپنے اس اصول کی نفی کی ہے کہ ہر شخص کو اپنا فی الضمیر ظاہر کرنے اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کا حق حاصل ہے اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سری نگر میں بیگم

شیخ محمد عبداللہ کے حریف مولوی افتخار حسین انصاری کے جلسوں اور جلوسوں پر حملے ہوئے ہیں۔ مولوی صاحب کے کہنے کے مطابق کاغذاتِ نامزدگی داخل کرنے کے روز ہی اُن پر حملہ ہوا اور ان کی ٹوپی چھین لی گئی۔ پھر علم گری بازار میں اُن کے جلسے کو درہم برہم کر دیا گیا اور حبہ کدل میں اُن کی جیپ نذر آتش کر دی گئی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ہماری ہمدردیاں مولوی افتخار حسین کے ساتھ نہیں ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ بیگم صاحبہ بھاری اکثریت سے یہ الیکشن جیت جائیں، ہم مولوی صاحب افتخار حسین پر حملوں کو جمہوریت کے سخت منافی سمجھتے ہیں، کلکتہ میں حال ہی میں جنتا پارٹی کے لیڈر پر حملہ ہوا، تو اس پر سب سے پہلے اظہارِ افسوس کرنے والے وہاں کانگریسی لیڈر تھے۔ مگر کشمیر میں جب مولوی افتخار حسین کی جیپ نذر آتش ہوئی تو نیشنل کانفرنسیوں نے اعلان کیا کہ مولوی صاحب نے اپنی جیپ خود جلوادی تاکہ وہ شہیدوں میں شمار ہوسکیں۔ ان واقعات پر شیخ صاحب کو اپنے جلسوں میں اظہار افسوس کرنا چاہیے کیونکہ تشدّد ہر حال میں برا ہے اور یہ حرکت عام طور پر اُن لوگوں سے سرزد ہوتی ہے جو بوکھلاہٹ کے شکار ہوں۔ شیخ صاحب اور اُن کی پارٹی کو بوکھلانے کی بظاہر کوئی ضرورت نہیں۔ تو کیا اس طرح سے وہ اپنی جمہوریت نوازی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

☆☆☆

۹ / مارچ ۱۹۷۷ء

بیگ صاحب اور راولپنڈی روڈ

حالیہ انتخابی مہم کے دوران مرزا محمد افضل بیگ نے سری نگر راولپنڈی شاہراہ کھولنے کا اتنی بار ذکر کیا کہ بہت سے دیہاتی اس غلط فہمی میں مُبتلا ہو گئے کہ نیشنل کانفرنس کی حکومت کا سب سے پہلا کارنامہ راولپنڈی روڈ کھول کر کشمیر اور ''آزاد کشمیر'' کے درمیان تیس سالہ پرانی دیواروں کو ڈھا دینا ہوگا۔ انتخابی نتائج ظاہر ہونے اور نئی حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد سے بہت سے لوگ آج بھی ریڈیو کی طرف کان لگائے بیٹھے ہیں کہ آج نہیں تو کل نیشنل کانفرنس کی حکومت راولپنڈی روڈ کھولنے کا اعلان کر کے اپنا وعدہ پورا کرے گی۔ نائب وزیر اعلیٰ مرزا محمد افضل بیگ کو بھی غالباً اس بات کا احساس ہے کہ اُنھوں نے انتخابی مہم کے دوران بار بار راولپنڈی روڈ کا تذکرہ کر کے عوامی توقعات کو غیر ضروری طور پر اُبھارا ہے اور اسی لیے انہوں نے پچھلے دنوں ایک تقریب پر تقریر کرتے ہوئے عوام کو یقین دلایا ہے کہ راولپنڈی روڈ کو تجارتی مقاصد کے لیے کھولنے کے سوال کو عنقریب مرکزی حکومت کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ بیگ صاحب بہت ذہین آدمی ہیں۔ لیکن بعض اوقات ذہین آدمی اپنی ذہانت کے جال میں پھنس کر اپنے لیے مشکلات پیدا کرتا ہے۔ بیگ صاحب کو اس بات کا علم ہے کہ راولپنڈی روڈ کھولنے کا معاملہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ اتنا آسان اور سیدھا

سادھا نہیں کہ بیگ صاحب کے کہنے اور ان کے سوال اُٹھانے سے فوری طور حل ہو جائے۔ انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ اس مسئلے کا تعلق ایک پیچیدہ سیاسی مسئلے سے ہے اور جب تک یہ سیاسی مسئلہ حل نہیں ہوتا، راولپنڈی روڈ کھُلنے کا کوئی امکان نہیں۔ لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی بیگ صاحب اگر بار بار اس شاہراہ کو کھولنے کا ذکر کرتے رہیں تو اس بات کا امکان ہے کہ وہ اس جال میں کچھ اس طرح پھنس جائیں کہ پھر اس سے ان کا نکلنا محال ہو جائے۔ وہ اگر اس لیے اس کا ذکر کرتے ہیں کہ انتخابی مہم کے دوران انہوں نے اس کا بار بار تذکرہ کیا ہے تو انہیں شیخ صاحب کے اس قول کو اپنے ذہن میں رکھنا چاہیے کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ جنگ میں اگر انہوں نے راولپنڈی روڈ کا بار بار استعمال کیا تو محبت میں اب انہیں اس کو بھول جانے کا گُر بھی سیکھ لینا چاہیے۔ ورنہ خطرہ اس بات کا ہے کہ وہ اپنی ساری سیاسی زندگی راولپنڈی روڈ پر آوارہ گردی کرنے میں صرف کریں گے۔

☆☆☆

۲۲/جولائی ۱۹۷۷ء

آگیا جی آگیا

شملہ معاہدے میں جب فیصلہ ہوا کہ ہندوستان پاکستان کے تقریباً ایک لاکھ جنگی قیدیوں کو واپس دے گا تو نوائے وقت لاہور نے لکھا کہ پاکستان کی قوم اُن بوالہوسوں کی قوم ہے جو جنرل نیازی کے واپس آنے کے وقت ایک شاندار استقبال کرنے کی تیاری میں لگ گئی ہے۔ جیسے وہ بہت بڑا معرکہ سر کر کے اور ایک بہت بڑا مُلک فتح کر کے آرہے ہوں، نوائے وقت لاہور کی یہ پیش گوئی وہاں صحیح نہیں ہوئی البتہ ہمارے ہاں صحیح ہونے والی ہے کہ جناب شیخ محمد عبداللہ چیف منسٹری سے ہاتھ دھونے کے بعد پہلی بار وادی کشمیر میں تشریف لانے والے ہیں اور نیشنل کانفرنس کے غلام محمد بٹ نے ایک پوسٹر کے ذریعہ عوام سے اپیل کی ہے کہ چونکہ شیخ صاحب ایک بڑا معرکہ سر کر کے تشریف لا رہے ہیں، اس لیے قاضی گنڈ سے سرینگر تک اُن کا زبردست استقبال کیا جائے۔ اس پوسٹر میں شیخ صاحب کو کشمیری عوام کی اُمیدوں کے مرکز، کا نیا خطاب عطا کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ کشمیری عوام کی اُمیدیں یہ ہیں کہ شرپسندوں کے ہاتھوں سے شرفاء محفوظ نہ رہیں اور جو بھی دیانتداری سے اختلاف رائے کی جرأت کرے اُس کا گھر جلا دیا جائے، اُس کا مال لوٹ لیا جائے۔ اُس پر عرصۂ حیات تنگ کیا جائے اور اُس کا جینا محال کر دیا جائے۔ یعنی یہ کہ اقتصادی طور پر تباہ حال ہونے کے بعد اگر اُن میں ابھی تک زندگی کی کوئی رمق باقی ہے وہ بھی ختم ہو جائے، اور وہ اطمینان سے اپنی جان، جانِ آفرین

کے حوالے کر کے اپنی امیدوں کے مرکز کو دُعائیں دے جائیں ۔ بہر حال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شیخ صاحب کی تشریف آوری پر ان کا زبردست استقبال آخر کس خوشی میں کیا جائے گا۔ وہ کون سا عظیم کارنامہ ہے جس کے لیے اُن کے سامنے تنخواہ دار غنڈوں کی جماعت کرتب دکھاتے ہوئے مذموم حرکات کا مظاہرہ کرے گی ۔ جس چیف منسٹری کو حاصل کرنے کے لیے وہ ادنیٰ سے ادنیٰ انسان تک کے سامنے سر بسجود ہوئے ، اس کے چھن جانے پر ان کے پالتو مظاہرہ بازوں کو ماتم کرنا چاہیے ، خوشی کا یہ کون سا مقام ہے ؟ گورنر راج میں شرفاء کو امید ہے کہ امن شکنی اور غنڈہ گردی کی حمایت پولیس نہیں کرے گی بلکہ شر پسند عناصر کے ساتھ سختی سے پیش آئے ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ امن شکن نیشنل کانفرنسیوں کو پولیس کا سہارا نہیں ملے گا اور وہ اپنے عزائم میں کامیاب نہیں ہوں گے ۔ ظاہر ہے کہ آگیا جی آگیا ، کرنے والوں کے لیے بھی اظہار شادمانی کا کوئی موقع نہیں ، پھر اس مسخرہ پن کا کیا جواز ہے کہ پوسٹر میں شیخ صاحب کی تصویر کے ساتھ علامہ اقبالؒ کا یہ شعر بھی لکھا گیا ہے ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

''مردِ مومن'' سے اُن کی مُراد شیخ صاحب ہیں ، تو اُس کا پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہیے ؎

وزیرِ اعظم ، وزیرِ اعلیٰ بھی بنتا ہے بیک جنبش
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

☆☆☆

۷/اپریل ۷۷ ۱۹ء

شیر کشمیر کا ڈرام

شیخ صاحب کے ایک بہت پرانے حریف پنڈت پریم ناتھ بزاز نے جولائی ۷۷ء کے ریاستی اسمبلی کے انتخابات کے موضوع پر اپنی تازہ ترین کتاب Democracy Through Intimidation and Terror میں شیخ صاحب پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ انتخابی مہم کے دوران ان کی سنگین بیماری دراصل ان کی انتخابی حکمت عملی کا ایک حصہ تھی۔ دوسرے الفاظ میں بزاز صاحب نے شیخ صاحب پر دل کے حملے کو محض ان کی اداکاری اور بہانہ بازی سے تعبیر کر کے اس کے وجود سے ہی انکار کر دیا ہے اور واقعات اور دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''بیماری کا بہانہ'' ہاری ہوئی بازی کو عوام کی ہمدردی حاصل کر کے، جیتنے کا ایک کامیاب نسخہ تھا جسے انہوں نے بڑے موثر طریقے پر استعمال کیا۔ بزاز صاحب کو اپنے اس دعویٰ کی صحت کا اس درجہ یقین ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کے ایک پورے باب میں اس موضوع پر بحث کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ جولائی ۷۷ء کے انتخابات میں شیخ صاحب اور ان کی جماعت کی کامیابی کی ایک بنیادی اور اہم ترین وجہ شیخ صاحب کی یہ مصنوعی بیماری تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے دو اہم واقعات کی طرف اپنے

پڑھنے والوں کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ایک یہ کہ جب ۱۳ جون کو پنڈت پریم ناتھ بزاز، مولانا محمد سعید مسعودی اور خواجہ غلام محی الدین قرہ کے ہمراہ شیخ صاحب کی عیادت کے لیے ان کے دولت کدے پر تشریف لے گئے اور وہاں ''شیر کشمیری پیس بریگیڈ'' کے کمانڈر انچیف خواجہ غلام محمد شاہ اور ڈپٹی کمانڈر انچیف محی الدین متو نے ان بزرگوں کی بے عزتی اور بے حرمتی میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہیں کیا، تو ان تینوں اصحاب کے صحیح وسلامت لوٹنے کے صرف ایک گھنٹے کے بعد، شیخ صاحب کا ان کے نام جو معذرت نامہ وصول ہوا اور جس پر شیخ صاحب کے اپنے دستخط تھے وہ عارضہ قلب میں مبتلا کسی شخص کے دستخط نہیں ہو سکتے تھے۔ بزاز صاحب کا دعویٰ ہے کہ دل کی بیماری کے شدید حملے میں مبتلا کسی شخص کے دستخط کبھی اتنے صاف، واضح اور نمایاں نہیں ہو سکتے کہ جتنے اس معذرت نامے پر شیخ صاحب کے دستخط تھے۔اپنے دعویٰ کے جواز میں بزاز صاحب ایک اور ثبوت بھی پیش کرتے ہیں...... وہ کہتے ہیں کہ کیا عجیب اتفاق ہے کہ شیخ صاحب انتخابی نتائج کا اعلان ہونے تک تو اس درجہ بیمار تھے کہ ڈاکٹروں نے انہیں بستر سے ہلنے کی اجازت بھی نہیں دی تھی۔ لیکن جوں ہی تمام انتخابی نتائج کا اعلان ہو گیا اور نیشنل کانفرنس کو ۴۸ نشستیں حاصل ہو گئیں، شیخ صاحب اس درجہ صحت یاب ہو گئے کہ وہ فوراً ایک بھاری اجتماع سے خطاب کرنے کے اہل ہو گئے۔ بزاز صاحب کے خیال میں یہ سارا ڈرامہ دراصل ناراض، برہم اور بیزار کشمیری مسلمانوں کے دلوں میں رحم، ہمدردی اور مروت کے جذبات پیدا کر کے ان سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے کھیلا گیا تھا اور شیخ صاحب کی بیماری جسمانی نہیں، خالص سیاسی تھی۔

مجھے بزاز صاحب کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے اور میں نے آئینہ میں

شائع شدہ طویل تبصرے اور کلکتہ سے شائع ہونے والے انگریزی ہفت روزہ ''سنڈے'' میں ایک مختصر تبصرے میں بزاز صاحب کے اس دعویٰ اور فیصلے کو غلط، ناقابل قبول اور مبالغہ آمیز قرار دیا ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ شیخ صاحب جون ۷۷ء میں واقعی بہت بیمار تھے۔ اور ایک مرحلے پر ان کی بیماری اتنی نازک صورت اختیار کر گئی کہ وہ موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ میرا یہ خیال محض میرے قیاس اور اندازے پر ہی مبنی نہیں بلکہ اس کی بنیاد قریب ترین مشاہدوں کی عینی شہادت اور شیخ صاحب کی معالجوں سے میری ذاتی گفتگو ہے۔ اس کے برعکس بزاز صاحب کے نتائج حقائق سے زیادہ ان کے تعصب اور ان کی نفرت کی پیداوار ہیں۔ شیخ صاحب کی بیماری کے متعلق بزاز صاحب کے دعوے ان کے نتائج اور ان کی تاویلات سے اختلافات کے باوجود میں ان لوگوں سے بھی متفق نہیں ہوں کہ جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ شیخ صاحب پر بیماری کا بہانہ بنانے کی تہمت عائد کرنا کفر ہے یا یہ کہ ان سے کوئی ایسی حرکت منسوب کرنے کا تصور بھی ناممکن ہے۔ شیخ صاحب کی جون ۷۷ء کی بیماری واقعی اصلی تھی اس میں مجھے ذرا بھر بھی شبہ نہیں، لیکن شیخ صاحب نے اپنی طویل زندگی میں کئی بار ایسے ''ڈرام'' کیے ہیں۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس سلسلے میں دو معتبر ترین شہادتیں پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ ایک شیخ صاحب کی اور دوسری راقم التحریر کی۔ آیئے پہلے شیخ صاحب کی شہادت ملاحظہ ہو ہفت روزہ ''محاذ'' کے ایڈیٹر ناز انصاری نے ۱۹۶۴ء میں محاذ کے ''شیر کشمیر نمبر'' کے لیے بابائے قوم سے ایک طویل انٹرویو لیا ہے جو اس خاص نمبر کی زینت ہے، اس انٹرویو میں ایک مقام پر ناز انصاری نے شیخ صاحب سے یہ سوال کیا کہ ''کیا آپ کو اپنے بچپن یا زمانہ طالب علمی کی کوئی

شرارت یاد ہے؟''۔

ناز انصاری کا کہنا ہے کہ ''اس سوال نے شیر کشمیر کے چہرے سے اس متانت اور سنجیدگی کو کافور کر دیا جو پچھلے واقعات سنانے کے دوران پیدا ہوگئی تھی اوراس کی جگہ ایک بے ساختہ مسکراہٹ نے لے لی''۔

قدرے توقف کے بعد شیخ صاحب نے سوال کیا ''وہ بھی لکھیں گے آپ؟''۔ یہ بھی انسان کی فطرت کا ایک خاصہ ہے۔ وہ نو جوانوں خصوصاً بچوں کے لیے یقیناً باعث دلچسپی ہوگا کہ وہ اپنے محبوب رہنما کے بارے میں کوئی دل چسپ اورانوکھا ہو،اس پر شیخ صاحب نے فرمایا..........

''میں ایف ،اے میں تعلیم پا رہا تھا کہ میں نے Test کو Avoid کرنا چاہا اور اس غرض سے اپنے آپ کو بیمار بنالیا۔ چنانچہ بیماری کا شور مچ گیا۔ بات پرنسپل تک پہنچی ، اس نے ڈاکٹر بھجوایا۔ جس نے آ کر نبض وغیرہ دیکھی۔ پھر تھرما میٹر دیا کہ اسے لگاؤ، اب میں بہت پریشان ہوا۔ مگر فوراً ہی ذہن نے کام کیا اور ایک شرارت سوجھی ، میں نے لحاف کے اندر کانگڑی لے رکھی تھی۔ اس کو فوراً اس میں رکھ دیا۔ اب جو ڈاکٹر دیکھتا ہے تو بخار ۱۰۴ ہے۔ وہ گھبرا گیا۔ اس نے پوچھا کیا کھایا تھا، کہیں پنچاب ونجاب تو نہیں گیا تھا۔ انہیں سوالات کے دوران اس نے پوچھا کہ میں نے اندر کانگڑی تو نہیں لے رکھی ہے، خیر پھر اس نے دوا وغیرہ بھجوادی اور میں امتحان سے بچ گیا''۔

''محاذ'' ۱۹ دسمبر ۱۹۶۴ء

یہ رہی شیر کشمیر کی شہادت، اب اس ناچیز کی شہادت ملاحظہ کیجیے:

یہ سال ۱۹۷۴ء کا واقعہ ہے میں انجمن جمعیت اسلام کے سالانہ جلسے میں شرکت کے لیے شیخ صاحب کے ہمراہ بمبئی میں تھا، جہاں شیخ صاحب کی تقریر

کے دوران مسلم لیگیوں نے بڑی بدتمیزی اور بداخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا۔
دوسرے دن مسلم لیگیوں کی اینٹ کا پتھر سے جواب دینے کی غرض سے بمبئی کی کانگریس کمیٹی نے ماہم میں شیخ صاحب کے اعزاز میں ایک زبردست جلسے کا اہتمام کیا اور جس کے لیے انہوں نے شیخ صاحب سے باقاعدہ منظوری حاصل کی۔ دن بھر کانگریسی کارکن شہر بھر میں جلسے کا اعلان کرتے رہے۔ اور شام کو ایک لاکھ کے قریب لوگ شیخ صاحب کی تقریر سننے کے لیے ماہم کے جلسہ گاہ میں جمع ہو چکے تھے۔ بمبئی کے جلسے شام نو بجے بعد شروع ہوتے ہیں۔ اس لیے پروگرام کے مطابق ہمیں ساڑھے آٹھ بجے اپنی قیام گاہ سے جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہونا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب کسی نے یہ اطلاع دی کہ ماہم کے جلسے میں بھی مسلم لیگی شیخ صاحب کے خلاف مظاہرہ کریں گے۔ شیخ صاحب نے جونہی یہ خبر سُنی، انہوں نے جلسے میں شرکت کا اپنا پروگرام منسوخ کر دیا۔ میں نے انہیں عین وقت پر جلسے میں عدم شرکت کے نتائج اور منتظمین جلسہ کی رسوائی کا احساس دلانے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن بے کار، انہوں نے حتمی طور پر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جلسے میں شریک نہ ہوں گے۔ اس لیے میری منت، سماجت اور میرا استدلال کسی کام نہ آیا۔ بالآخر میں نے ان سے یہ پوچھا کہ آخر منتظمین جلسہ اور حاضرین کو نہ آنے کا کیا سبب بتایا جائے تو شیخ صاحب نے بغیر کسی تکلف کے کہا کہ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ وہ بیمار ہو گئے ہیں اور ڈاکٹر نے انہیں مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔

چار و ناچار میں شیخ صاحب کی مصنوعی بیماری کا پیغام لے کر ماہم پہنچا۔ اور جب میں نے بمبئی پردیش کانگریس کمیٹی کے صدر کو یہ اطلاع دی کہ شیخ صاحب نہ آسکیں گے تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔ جلسہ گاہ میں لاکھ بھر لوگوں کو دیکھ

کر میرے بھی اوسان خطا ہو گئے۔ لیکن بالآخر میں نے محاذ سنبھال ہی لیا۔ اور حاضرین تک بڑی خوبصورتی کے ساتھ شیخ صاحب کی ''بیماری'' کا پیغام پہنچا دیا۔ اس کے بعد میں نے ایک گھنٹے کی تقریر میں مسلم لیگیوں پر وہ تابڑ توڑ حملے کیے کہ صدر جلسہ نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ''شمیم صاحب نے ہمیں شیخ صاحب کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔

ان دو واقعات کے تذکرے کا مقصد شیر کشمیر کے عقیدت مندوں، ان کے سیاسی مخالفوں، اس اخبار کے قارئین اور خود شیر کشمیر کو یہ یاد دلانا ہے کہ جس طرح وہ سیاسی، سماجی اور مذہبی شعبوں میں شیر کشمیر کہلانے کے مستحق ہیں اسی طرح وہ ''کشمیری ڈام'' میں بھی شیر کشمیر ہیں، اور انہوں نے تاریخ کے ہر اہم موڑ پر ایسا ایسا ڈام کیا ہے کہ تحریک آزادی اور تاریخ کشمیر کے اہم ترین حادثات اور واقعات کو ان کے ''ڈام'' سے منسوب کیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

ان کے تازہ ترین ڈام کی مثال ان کا یہ سنسنی خیز، حیرت انگیز اور نا قابل یقین بیان ہے کہ انہوں نے کبھی بھی کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کی حقیقت کو چلنج نہیں کیا ہے، ان کے ڈام کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے کہ وہ آج جماعت اسلامی کے سید علی گیلانی سے مخاطب ہو کر یہ کہتے ہیں کہ اگر وہ الحاق کی حقیقت کو دل سے تسلیم نہیں کرتے، تو انہیں اس کا برملا اظہار کر کے اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میں نہیں جانتا کہ اُردو، انگریزی، ہندی، لاطینی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں ایک لیڈر کے اس رویے کے لیے کون سا لفظ موزون اور مخصوص ہے لیکن کشمیری لغت میں اس کے لیے صرف ایک لفظ مخصوص ہے اور وہ ہے ''ڈام''۔

شیر کشمیر کے ڈام کی تاریخ اتنی دلچسپ اور متنوع ہے کہ اس پر ایک نہیں کئی

کتابیں لکھی جا سکتی ہیں ۔ اس لیے شیر کشمیر پر ڈرام کا الزام لگانے والوں کو گردن زدنی قرار دینے سے پہلے حالات ، واقعات اور تاریخ کی شہادت پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

میں ایک بار پھر اپنے اس دعوے کو دہرانا چاہتا ہوں کہ جون ۷۷ء میں شیخ صاحب واقعی بہت بیمار تھے ۔ ان پر دراصل دل کی بیماری کا شدید حملہ تھا اور اور اس بیماری پر مصنوعی ہونے کی تہمت عائد کرنا پنڈت پریم ناتھ بزاز کے شخصی تعصب کا آئینہ دار ہے لیکن شیخ صاحب کے لیے بیماری کا بہانہ کر کے امتحان اور آزمائش سے بچنا کوئی نئی یا غیر متوقع بات نہیں ۔ جو شخص ایف ، اے ، کے معمولی امتحان سے بچنے کے لیے بیماری کا بہانہ اور کانگڑی کی مدد لے سکتا ہے اس کے لیے اپنی زندگی کے سب سے بڑے امتحان یعنی انتخابات میں بیماری کا ڈرامہ کھیلنا کوئی بہت بڑی بات یا مشکل کام نہیں ، لیکن میں پھر اپنے موقف کو دہرانا چاہتا ہوں کہ جون ۱۹۷۷ء کی بیماری اصل تھی اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے اثرات ابھی تک موجود ہیں ۔

☆☆☆

۲۴ر ستمبر ۱۹۷۸ء

ش احمد کی ڈائری

اخبار نویسی اور صحافی

ابھی چند دن پہلے ریاستی ہائی کورٹ کے ڈویژن بینچ کے سامنے ہتک عزت کے ایک مقدمے میں فریق مخالف کے وکیل کی بحث کا جواب دیتے ہوئے میں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اخبار شائع کرنے والا ہر شخص صحافی کہلانے کا مستحق نہیں ۔ قانون ، زبان اور صحافت کی باریکیاں سمجھنے والے سبھی لوگ تو میرے استدلال کی نزاکت سمجھ گئے ، لیکن شہر کے کچھ نائیوں اور نانبائیوں نے میرے نام زبردست ، احتجاجی خطوط لکھ کر یہ الزام عائد کیا ہے کہ میں نے یہ کہہ کر کہ اخبار شائع کرنے والا ہر نائی اور نانبائی صحافی نہیں کہلا سکتا ، ان کے پیشے کی توہین کی ہے ۔ میں احتجاج کرنے والے ان دوستوں اور بزرگوں کو اطمینان دلانا چاہتا ہوں کہ میرے دل میں ان کے یا ان کے پیشے کے تئیں ہرگز کوئی نفرت یا حقارت کا جذبہ نہیں اور میں ان پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو بھی اتنا ہی محترم اور معزز سمجھتا ہوں کہ جتنا کارخانے داروں ، وکیلوں ، تاجروں ، اسمبلی کے ممبروں اور اخبار نویسوں کو ، میرے استدلال کا مطلب یہ

ہے کہ جس طرح چھری چلانے والا ہر شخص قصائی اور روٹیاں بیچنے والا ہر انسان نانبائی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، اسی طرح قلم چلانے والا ہر شخص صحافی کہلانے کا مستحق نہیں ہے، ہر فن اور ہر پیشے کی اپنی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں اور جب تک انسان کے اندر یہ خصوصیات یا مہارت پیدا نہیں ہوتی صرف ان پیشوں سے وابستگی ہی اسے اس برادری کا رکن بنانے کے لیے کافی نہیں۔

اب اس سلسلے میں ایک تازہ ترین مثال کا جائیزہ لیجیے۔

عید الفطر کے دن عید گاہ میں تقریباً ایک سو سے زاید حاضرین کی موجودگی میں ریاست کے ٹرانسپورٹ اور خوراک وسپلائی کے وزیر خواجہ غلام محمد شاہ نے ایک اخبار نویس کو غیر ذمہ دارانہ اور خانہ ساز خبریں شائع کرنے پر زبردست جھاڑ دی۔ شاہ صاحب نے سخت غصے کے عالم میں اخبار نویس سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں اخبار والوں سے نہیں ڈرتا اور میں ان کو ٹھیک کر دوں گا۔

یہاں موجود سامعین کا کہنا ہے کہ شاہ صاحب تقریباً پانچ منٹ تک اخبار نویس کو تاڑتے رہے۔ میرے جاسوسوں نے اسی وقت مجھے خبر دی اور باوجود اس کے کہ اس اخبار نویس سے میرے ہزار اختلافات ہیں، میں نے شاہ صاحب کے اس انتہائی آمرانہ، اور غیرِ ذمہ دارانہ رویے کے خلاف شدید ردِ عمل کا اظہار کیا۔ میرا خیال تھا کہ مذکورہ اخبار نویس اس افسوس ناک واقعہ کو اپنے اخبار میں شائع کر کے ریاست کے اخبار نویسوں کو یہ موقع دیں گے کہ وہ اخبارات کی آزادی کو لاحق اس نئے خطرے کے خلاف احتجاج کریں۔ مجھے یقین تھا کہ اخبار نویس اس معاملے کو مقامی صحافیوں کی انجمن کے سامنے پیش کر کے ان سے مداخلت کی درخواست کرے گا اور اس طرح ریاستی حکومت میں ہٹلریت اور چنگیزیت کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو منظر عام پر لا کر

ارباب اقتدار واختیار کو یہ احساس دلایا جائے کہ اخبار نویس ان کے ملازم نہیں کہ جو ان کی بدعنوانیوں اور بد کرداریوں کی پردہ پوشی کریں لیکن میرا خیال اور میرے سبھی اندازے غلط ثابت ہو گئے۔ اخبار نویس نے نہ صرف یہ کہ اس خبر کو اپنے اخبار میں شائع نہیں کیا بلکہ جب ہم نے وقوعہ کے تیسرے روز اسے اپنے اخبار میں شائع کیا۔ تو انہوں نے چوتھے روز اس کی تردید کر ڈالی۔ یہ واقعہ جس اخبار نویس کے ساتھ پیش آیا، وہ شہر کے ایک مقبول اخبار سے وابستہ ہے وہ اپنے آپ کو بڑا اگر انڈیل اور زبردست صحافی سمجھتا ہے۔ اس نے ریاست بھر کے پٹواریوں، نائب تحصیلداروں، استادوں، ٹریفک انسپکٹروں اور ٹیلی ویژن ڈیلروں کو اپنی صحافت سے مرعوب ہی نہیں ہراساں بھی کر دیا ہے۔ لیکن وزیر موصوف کی ایک ہی دھونس سے ان کے اوسان خطا ہو گئے اور بھری محفل میں بے عزت ہونے کے باوجود وہ قسمیں کھاتے رہے کہ واللہ! ان کے ساتھ کچھ نہیں ہوا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ایسے لوگ اگر پچاس سال تک بھی قلم چلاتے رہیں تو کیا آپ ان کو صحافی کا رتبہ دینے کے لیے تیار ہوں گے؟ جو شخص سرکاری اشتہارات یا مراعات کے لیے اپنی بے عزتی کے حادثے پر پردہ ڈالنے کے لیے جھوٹ بولے، وہ دوسروں کے حقوق اور ان کی عزت کے لیے لڑنے کا حوصلہ کہاں سے لائے؟ یہ حوصلہ صرف صحافی میں ہوتا ہے ...... ہر اخبار نویس میں نہیں!۔

جیسی روح ویسے فرشتے

ریاستی حکومت نے قانون ساز کونسل میں ایک سوال کا تحریری جواب دیتے ہوئے اخبارات کو دیے جانے والے سرکاری اشتہارات کے متعلق اپنی

پالیسی کی مزید وضاحت کی ہے ۔ اشتہارات کی تقسیم کے لیے وضع کردہ رہنمایانہ اصولوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت سرکاری اشتہارات کو اشتہارات اوران میں درج مواد کی پبلسٹی کے لیے نہیں بلکہ اخبارات کی حوصلہ افزائی اور حوصلہ شکنی کے لیے استعمال کررہی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ جو اخبارات صحیح اورصحت مند قسم کی صحافت کا نمونہ پیش کریں سرکاری اشتہارات کے ذریعے ان کی حوصلہ افزائی کی جائے گی ۔ اور جو بقول حکومت کے ''غیر ذمہ دارانہ ذاتی حملوں اور بلیک میلنگ'' والی تحریریں شایع کریں گے انہیں اشتہارات سے محروم کر کے ان کی حوصلہ شکنی کی جائے گی ،حکومت کی یہ پالیسی صحیح ہے یا غلط؟ اس سے سرکاری اشتہارات کی پبلسٹی پر کیا اثر پڑے گا؟ اور صحت منداور غیر صحت مند صحافت کا فیصلہ کرنے کا اختیار کس کو حاصل ہے؟ یہ اور اس قسم کے بہت سے سوالات اُس عذرداری کا موضوع ہیں ۔ کہ جو'' آئینہ'' کی طرف سے ریاستی ہائی کورٹ کے سامنے ہے ۔ اور جس کا حتمی فیصلہ بالآخر سپریم کورٹ کو کرنا ہوگا ۔لیکن فی الحال حکومت کے قائم کردہ معیار کو ہی صحیح مان کر اس بات کا جائیزہ لیجیے...... کہ شیخ صاحب کی حکومت کس حد تک ایمان داری اور دیانت داری کے ساتھ اپنے ہی وضع کردہ اصولوں کا احترام کررہی ہے، حکومت کا دعویٰ ہے کہ جو اخبارات، غیر ذمہ دارانہ کیچڑ اچھال، بلیک میلنگ، کردارکشی اور ذاتی حملوں سے پر تحریریں شائع کریں، ان اخبارات کو سرکاری اشتہارات نہیں دئے جائیں گے ۔حکومت کے اس جواب کے ساتھ مختلف اخبارات کو پچھلے ایک سال کے دوران دیے گئے اشتہارات کی تفصیل دی گئی ہے اوراس تفصیل میں دو نام قابلِ ذکر ہیں ۔ایک نیشنل کانفرنس کے سرکاری ترجمان ''نوائے صبح'' کا اور دوسرے جماعت کے غیر سرکاری ترجمان روز

نامہ ''ولر'' کا۔ بدقسمتی سے ان دونوں اخبارات کا حلقۂ اشاعت نیشنل کانفرنس کے حلقہ پریذیڈنٹوں تک محدود ہے۔ اس لیے ریاست کے اخبار بین حلقے ان کے نام نامی سے بھی مانوس نہ ہوں گے۔ لیکن اس وقت ان کی اشاعت سے زیادہ مجھے ان کے صحافتی معیار سے دل چسپی ہے اور خاص طور پر اخبار ولر کی صحافتی شان سے۔ یہ اخبار شاہی خاندان کا بڑا محبوب اور من پسند اخبار معلوم ہوتا ہے اور اس نے ابھی حال ہی میں شیر کشمیر کی یاد میں ایک خصوصی نمبر بھی شائع کیا ہے۔ اس اخبار کو پچھلے ایک سال کے دوران ۲۰ ہزار روپے کے اشتہارات دیئے گئے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شیخ صاحب کی نظروں میں صحیح رپورٹنگ، صحت مند صحافت اور تعمیری نکتہ چینی کا مثالی نمونہ ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ریاست کی صحافتی تاریخ میں اتنا گھٹیا، غلیظ اور بے ہودہ اخبار آج تک شائع نہیں ہوا ہے۔ زبان اور بیان، لب و لہجے اور معیار کے اعتبار سے اسے اخبار کہنا، اخبار کی بھی توہین ہے اور اخبار نویسوں کی تذلیل بھی۔ اس کا ایک ایک فقرہ کردار کشی، بلیک میلنگ اور انتہائی گھٹیا قسم کے ذاتی حملوں کا اشتہار ہوتا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ شاہی خاندان کے نفاست پسند اور باذوق افراد کو بھی یہ اخبار پڑھ کر اُبکائیاں آتی ہوں گی۔ لیکن اس کے باوجود یہ محکمہ اطلاعات اور ریاستی حکومت کے من پسند اخبارات کی صف اول میں شامل ہے کیونکہ اس کی کردار کشی، بلیک میلنگ، ذاتی حملوں اور گھٹیا زبان کا نشانہ شیر کشمیر اور ان کے چہیتے غلام محمد شاہ نہیں بلکہ ان کے سیاسی مخالفین ہیں۔ شیر کشمیر کے یہی دوہرے معیار ان کی عظمت کو گھن کی طرح کھا رہے ہیں اور ان کی بدقسمتی اور محرومی کی اس سے بڑھ کر کیا مثال ہو سکتی ہے کہ ان کا دفاع کرنے والوں میں جی، ایم، ڈار جیسا صحافتی چنڈال سب سے پیش پیش ہے

کسی نے سچ کہا ہے جیسی روح ویسے فرشتے۔

بیگ صاحب کا اعترافِ گناہ

ریاست کے نائب وزیر اعلیٰ مرزا محمد افضل بیگ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی اخلاقی جرأت اور ہمت کا ثبوت دے کر ریاستی اسمبلی میں ایک سرکاری بل پر بحث کا جواب دیتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے ۲۲ سال کی آوارگی کے بعد الحاق کو جزوی، مشروط، اور عارضی کہنے سے توبہ کر لی ہے اور اب الحاق کے متعلق ان کا دل صاف ہو گیا ہے۔ میں نے شیخ صاحب اور بیگ صاحب دونوں بزرگوں سے بہت پہلے ہی استدعا کی تھی کہ وہ ایمان داری سے اور کھل کر اس بات کا اعتراف کریں کہ ہم سے غلطی ہوئی ہے اور ہم ۲۲ سال تک اس قوم کو ایک غلط راستے پر لے جا کر ایک غلط منزل کی طرف اس کی رہنمائی کرتے رہے۔ میرے اس مشورے کا محرک میرا یہ عقیدہ ہے کہ انسان تو ایک معمولی سی چیز ہے۔ غلطیاں پیغمبروں سے بھی سرزد ہوئی ہیں، اس لیے سیاسی رہنما چاہے وہ کتنا ہی بلند قامت اور بلند پایہ کیوں نہ ہو، غلطیوں سے مبرا نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اگر شیخ صاحب بھی اپنی غلطی کا اعتراف کریں تو اس سے ان کا مرتبہ کم ہونے کی بجائے بڑھ جائے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ بیگ صاحب میں اتنی ہمت اور جرأت تو پیدا ہو گئی کہ انہوں نے بھری محفل میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شیخ صاحب کس دن درگاہ شریف حضرت بل میں جا کر باقاعدہ اس بات کا اعلان کریں گے کہ اے کشمیر کے بدقسمت لوگو! میں بائیس سال تک تم لوگوں کی غلط رہنمائی کرتا رہا تمہیں ایک غلط منزل کی طرف پکارتا رہا۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا

ہے، تم چاہو تو مجھے معاف کردو، چاہو تو مجھے سزا دو۔

میں شیر کشمیر کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کی قوم ایک آواز ہو کر انہیں معاف کر دے گی۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اپنے اندر اتنی اخلاقی جرأت اور ہمت پیدا کر دیں۔

شیر کشمیر اور انسٹی چیوٹ

مجھے یقین ہے کہ میری ہی طرح اس اخبار کے ہر قاری کو یہ جان کر بے حد تعجب ہوگا کہ جناب شیخ محمد عبداللہ نے صورہ میں اپنا رہائشی مکان، شیر کشمیر میڈیکل انسٹی چیوٹ کو سترہ سو روپے ماہوار کرایہ پر دے رکھا ہے، جو انسٹی چیوٹ، زندگی میں ہی، ان کی یادگار قائم کرنے اور ان کی بے شمار قومی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کے نام سے منسوب کیا گیا ہے اور جس کے لیے شیخ صاحب امیروں سے ہی نہیں، غریبوں سے بھی چندہ وصول کرنے میں لگے ہوئے ہیں اس انسٹی چیوٹ کو شیخ صاحب اپنا خالی مکان بھی نہیں دے سکتے یہ بڑے تعجب ہی کی نہیں بڑے افسوس کی بھی بات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انسٹی چیوٹ کے چیف انجینئر مسٹر عبدالسلام شیخ نے شیخ صاحب کو یہ اطمینان دلایا ہوگا کہ اپنے مکان کے لیے کرایہ وصول کرنا کوئی معیوب بات نہیں بلکہ قواعد و ضوابط کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس معاملے میں اگر عبدالسلام شیخ کا مشورہ قبول کرنے کی بجائے شیخ صاحب مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح کی زندگی سے سبق حاصل کرتے تو ان کا فیصلہ یقیناً مختلف ہوتا۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ دولت اور جائیداد کے لیے شیخ صاحب کی بھوک اور ہوس میں کمی ہونے کی بجائے روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مولانا آزاد

روڈ اور گپکار روڈ پر واقع متعدد مکانات، دھن جی بھائی بلڈنگ کے بے شمار دوکانات اور وادی کے طول وعرض میں بکھرے ہوئے رقبہ جات کے باوجود شیخ صاحب کا صورہ میں اپنے آبائی مکان سے کرایہ وصول کرنا، ناپسندیدہ اور غیر مستحسن ہی نہیں، قابلِ اعتراض بھی ہے۔ کیا بابائے قوم نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی ہے کہ وہ اتنی ساری دولت اور جائیداد کا کیا کریں گے۔

☆☆☆

۲۰؍ستمبر ۱۹۷۸ء

ش احمد کی ڈائری

بدا چھا بدنام بُرا

طالب علمی کے زمانے میں ایک اُردو محاورے سے آشنائی ہوئی تھی۔ ''بدا چھا بدنام بُرا''۔ لیکن بہت دنوں تک اس کے معانی سمجھ میں نہیں آئے۔ بار بار دل پوچھتا کہ بدنام کے مقابلے میں بد اچھا کیونکر ہوسکتا ہے۔ اب جوں جوں زندگی کا تجربہ وسیع ہوتا جارہا ہے، اس محاورے کی معنویت، گہرائی اور بلاغت کے اسرار کھلنے لگے ہیں۔ بے چارے بخشی غلام محمد مرحوم اتنے بدنام تھے کہ وہ جو بھی کچھ کرتے، ان کے مخالف اور ان کے نکتہ چین، اس میں ان کی بدنامی اور رسوائی کا کوئی نہ کوئی پہلو نکالتے۔ ان پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ انہوں نے نیشنل کانفرنس اور حکومت پر اپنے پورے خاندان کو مسلط کر دیا ہے اور وہ ریاست میں خاندانی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ الزام بالکل بے بنیاد بھی نہ تھا۔ بخشی صاحب کے چچیرے بھائی بخشی عبدالرشید پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے اور نیشنل کانفرنس کے جنرل سکریٹری بھی۔ ان کے ایک بھائی ضلع سرینگر میں نیشنل کانفرنس کے عہدیدار بھی تھے۔ لیکن عملی سیاست میں بخشی صاحب کے علاوہ زیادہ تر بخشی عبدالرشید مرحوم کا ہی عمل دخل رہتا تھا۔ اس کے باوجود پورے ملک میں شہرہ تھا کہ بخشی صاحب نے نیشنل کانفرنس کو اپنے خاندان کی چراگاہ بنادیا ہے۔ اس کے برعکس جب سے بابائے قوم، قائد اعظم

حضرت شیر کشمیر نے حکومت کا کاروبار اور نیشنل کانفرنس کی قیادت سنبھالی ہے۔ ان کے خاندان کا ایک ایک فرد حکومت اور سیاست میں سرگرم نظر آتا ہے۔ ان کے داماد خواجہ غلام محمد شاہ حکومت میں وزیر بھی ہیں اور انہیں محکمے بھی چن چن کر دیے گئے ہیں اور نیشنل کانفرنس کے ایک اہم ''کار آلیا'' کا کرتا دھرتا بھی، شیخ صاحب کی اہلیہ محترمہ ممبر پارلیمنٹ ہونے کے علاوہ بیک وقت حکومت اور جماعت نیشنل کانفرنس کی ایک اہم ''نیتا'' ہیں اور شیخ صاحب سے بھی زیادہ سرگرم، شیخ صاحب کے صاحبزادے ڈاکٹر فاروق عبداللہ والدِ محترم کے نام پر بننے والے میڈیکل انسٹی چیوٹ کے ڈائریکٹر بھی ہیں اور نیشنل کانفرنس کے ایک اہم ترین قائد بھی۔ شیخ صاحب کے ایک بھتیجے شیخ نذیر تو نیشنل کانفرنس کے اہم ترین عہدیداروں میں ہیں لیکن دوسرے بھتیجے شیخ عبدالرشید جنگلات کے ایک بہت بڑے ٹھیکدار ہونے کے علاوہ حکمران جماعت کے بڑے بارسوخ اور زوردار لیڈر ہیں۔ ایسے زوردار کہ انہوں نے ابھی حال ہی میں شیخ صاحب سے نوجوانوں کو آگے بڑھنے کے مواقع دیے جانے کی اپیل کی ہے۔ رشتہ داروں اور خاندان کے تمام افراد کو کاروبار سیاست میں شریک کرنے کا یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ نیشنل کانفرنس کے لیے جب جنرل سیکریٹری کی تلاش ہوئی، تو اس کے لیے بھی خاندان کے خزانے سے ہی ایک جوہر غلام محی الدین شاہ کا انتخاب ہوا۔ شاہ صاحب کی سب سے بڑی قابلیت اور اہلیت یہ ہے کہ وہ خواجہ غلام محمد شاہ کے برادر زادے ہیں۔ ریاستی عوام کی بدقسمتی اور بدبختی یہ ہے کہ شیخ صاحب نے اپنے دوسرے فرزند طارق عبداللہ کو نیشنل کانفرنس میں کوئی منصب دینے کی بجائے اسے ریاست کی ٹورازم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کی سرداری بخش دی، جہاں وہ ملازموں اور

سیاحوں دونوں کے لیے وبال جان بنے ہوئے ہیں ۔ اقرباءنوازی اور کنبہ پروری کی ان مثالوں کا مقابلہ بے چارے بخشی صاحب کی خاندان پرستی سے کیجیے تو بدا چھا بدنام برا کی معنویت سمجھ میں آجائے گی۔

بخشی مرحوم پر دوسرا الزام یہ تھا کہ وہ موسیقی کے رسیا تھے۔راگ ورنگ کی محفلیں سجاتے تھے، اور گانا بجانا والوں کی سرپرستی کرتے تھے اوراس میں کوئی شک نہیں کہ بخشی صاحب کو صوفیانہ موسیقی کا بڑا شوق تھا، اوران کے دور میں بچہ نغمہ کو جہاں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ وہاں ہمیں حبیب پینٹر، عزیز وارثی اور شنکر شمبھو جیسے مشہور قوالوں کی قوالیاں سننے کا بھی موقع ملا اور ہندوستان کے مشہور شعراء کا کلام بلاغت نظام بھی، لیکن یہ بات ان کے حق میں کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں کبھی روایتی آداب اور سماجی اخلاقیات کی حدُود سے تجاوز نہیں کیا۔اب ان کے مقابلے میں قائداعظم شیر کشمیر کے ذوق وشوق کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ انہیں نہ صوفیانہ کلام سے کوئی دل چسپی ہےاور نہ چھکری سے کوئی رغبت ۔انہیں نہ اُردو مشاعروں سے کوئی لگاؤ اور نہ قوالی سے کوئی مس، البتہ وہ رنگین تمدنی پروگراموں کے بڑے رسیا ہیں ۔اوراسی لیے کلچرل اکادمی کے زیراہتمام اب ہر سال دوڈھائی لاکھ روپے سالانہ کی لاگت سے رقص وموسیقی کے خصوصی پروگرام مرتب کر کے دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ ان پروگراموں کے لیے خصوصی طور پر کشمیر کی خوبصورت اورنو جوان لڑکیوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ان کے لیے شوخ اور رنگین لباس خاص طور پر بنوائے جاتے ہیں اور پھر کشمیر کی ثقافت کے نام پر دہلی، کلکتہ، بمبئی، لکھنؤ، پٹنہ اور دوسرے شہروں میں پروگرام پیش کیے جاتے ہیں ۔ ان پروگراموں کی خصوصیت یہ ہے کہ بابائے قوم ہر بڑے شہر میں پروگرام کا افتتاح کرنے کے لیے

بہ نفسِ نفیس تشریف لے جاتے ہیں اور جب تک ہمارے تمدنی وفود ریاست سے باہر رہتے ہیں قائداعظم بھی ان تمدنی پروگراموں میں شرکت کے لیے ریاست سے باہر ہی رہتے ہیں۔ اب بے چارے بخشی غلام محمد کے گناہوں کا مقابلہ شیر کشمیر کی دل چسپیوں سے کیجیے۔ تو شیخ صاحب کے مقابلے میں وہ زاہد خشک دکھائی دیں گے اور اپنے شیر کشمیر رِند پارسا، لیکن اس کے باوجود بخشی صاحب کے نام کے ساتھ رقص و موسیقی وابستہ ہے اور شیخ صاحب کی ذاتِ اقدس کے ساتھ کشمیر کی عزت و آبرو کا مقام...... اسی کو کہتے ہیں بد اچھا بدنام بُرا۔

شیرِ ہندی

ریاست کے مکھیہ منتری شریمان شیخ محمد عبداللہ ہندی کی حمایت میں تامل ناڈو کے چیف منسٹر جی رام چندرن سے کچھ اس طرح الجھ گئے ہیں کہ جیسے اب ان کی باقی ماندہ زندگی کا مقصد، کشمیریوں کو عزت و آبرو کا مقام دلانے کے بجائے ہندی بھاشا کو عزت و آبرو کا مقام دلانا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ جس شدت اور تلخی کے ساتھ وہ ہندی کے پرچارک اور ہندی زبان کی مقبولیت کے دعویدار بنے ہوئے ہیں، شری مرار جی ڈیسائی، راج نرائن اور جن سنگھ کے بڑے بڑے نیتا بھی اتنی شدت کے ساتھ ہندی کا مقدمہ پیش نہیں کر رہے ہیں۔ ریاست کے لوگ اور ملک کی جنتا دونوں ہی ہندی کے اس پریم پجاری کے جوش و خروش اور ولولے کے متعلق حیران و پریشان ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ بیٹھے بیٹھے اپنے شیر کشمیر شیر ہندی کیوں کر بن گئے۔

تامل ناڈو کے چیف منسٹر کے نام اپنے دوسرے انگریزی مکتوب میں قبلۂ محترم نے ان سے یہ شکوہ کیا ہے کہ انہوں نے شیخ جی کو یہ طعنہ کیوں دیا کہ وہ

چونکہ مرکز کی مالی امداد کے محتاج ہیں اس لیے مرکزی حکومت کی ہر صحیح اور غلط پالیسی کی حمایت کرنے پر مجبور ہیں، میری ذاتی رائے میں شری رام چندرن کا یہ الزام غلط اور بے جا ہے اور میں یہ شہادت دینے کے لیے تیار ہوں کہ شیخ صاحب نے مرکز کی مالی امداد کے خوف یا لالچ سے ہندی کی حمایت کا بیڑا نہیں اٹھایا ہے۔ ایسا ہوتا تو پھر بات سمجھ میں آسکتی تھی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ بابائے قوم نے ہندی کی حمایت میں جو شجاعت آمیز موقف اختیار کیا ہے اس کا عقل، منطق، معقولات یا فہم وادراک سے کوئی تعلق نہیں نہ اس میں کوئی سوچ شامل ہے اور نہ کوئی عقیدہ، صرف ان کے من کی ایک ترنگ ہے اور بس ....اور اپنے من کی ترنگ کو ریاست کی سیاست بنانا، شیخ جی کا بہت پرانا اسٹائل ہے۔ اب چونکہ انہوں نے اپنے آپ کو ہندی سے وابستہ کر دیا ہے۔ اس لیے اب آج سے ان پر یہی دھن سوار رہے گی۔

قائداعظم نے ہندی کے پرستاروں سے اپیل کی ہے کہ وہ ہندی بھاشا کو مشکل بنانے کی بجائے اسے سہل بنائیں۔ اب بابائے قوم کو یہ کون سمجھائے کہ ہندی کو آسان اور عام فہم بنایا جائے تو وہ اُردو بن جاتی ہے اور ہندی کے عاشق یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے اپنے شیر کشمیر کو ریلوے سٹیشن کو دھک منڈل، نکٹائی کو کنٹھ لنکوٹ اور سیلنگ فین کو ہوا چھت گھیما کہنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ہندی سے ان کا یہ عشق انہیں بہت مہنگا پڑے گا اور ایک دن وہ اُردو میں غالبؔ کا یہ شعر دہرانے پر مجبور ہو جائیں گے

عشق نے ہم کو نکما کر دیا　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

☆☆☆

۲۰ر جون ۱۹۷۸ء

مجاہدین آزادی کا کوٹا

سرینگر میڈیکل کالج میں ایم بی، بی، ایس کے پانچ سالہ کورس کے لیے ۷۵ مخصوص نشستوں میں سے ۷۳ کامیاب اُمیدوارں کے ناموں کا اعلان کیا گیا۔ سال گزشتہ کی طرح اب کی بار بھی اُمیدواروں کا انتخاب قابلیت اور دوسرے مقررہ معیاروں کی بنیاد پر کیا گیا ہے اور یہ طریق کار یقیناً بہت مستحسن اور اطمینان بخش ہے، اس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ ذاتی اثر ورسوخ اور سیاسی سفارش کے سہارے سیٹوں کی تجارت بند ہوگئی ہے اور اب صرف وہی اُمیدوار منتخب ہو جاتے ہیں کہ جو اس انتخاب کے لیے مقررہ معیار پر پورے اترتے ہیں۔ پچھلے سال ہم نے اُمیدواروں کی مکمل فہرست معہ ان کے نمبرات شائع کردی تھی اور فہرست پر ایک نگاہ ڈالنے سے یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ انتخاب کرنے والوں نے صرف قابلیت اور دوسری مقررہ اہلیتوں پر ہی اُمیدواروں کو چُنا ہے۔ اب کے بار کامیاب اُمیدواروں کے ساتھ ان کے نمبرات کی فہرست مہیا نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ امیدواروں کے انتخاب میں صرف ان کے نمبرات ہی کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے میں امید کرتا ہوں کہ اب کی بار بھی میڈیکل کالج کے اُمیدواروں کے انتخاب میں صرف قابلیت اور اہلیت کو ہی مدنظر رکھا گیا ہوگا۔ لیکن اس فہرست میں مجاہدین آزادی کے لیے مخصوص دو نشستوں کے لیے منتخب شدہ امیدواروں کا

نام درج نہیں ہے جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یا تو ان دو نشستوں کے لیے ابھی موزون امیدواروں کا انتخاب نہیں ہوا ہے یا فی الحال ان ناموں کی تشہیر نا معلوم وجوہات کی بناء پر ملتوی کر دی گئی ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو، عوام کے دلوں میں شک وشبہ پیدا ہونے لگا ہے کہ ان دو نشستوں پر کچھ منظور نظروں کا انتخاب ہونے والا ہے۔ اور اسی لیے ان کے لیے منتخب یا نامزد امیدواروں کے اسمائے گرامی کا اعلان نہیں ہوا ہے۔ گذشتہ سال بھی مجاہدین آزادی کے لیے مخصوص ان نشستوں پر ایک ہی خاندان کے دو امیدواروں کے انتخاب نے عام لوگوں کو بدظن ہونے کا موقع دیا تھا۔ اور اب کی بار بھی چہ مہ گوئیاں ہونے لگی ہیں کہ ان نشستوں پر ارباب اقتدار کے کچھ اور نورِ نظر یا منظور نظر امیدواروں کو نامزد کیا جائے گا۔ ان نشستوں پر نامزدگی کا حق چونکہ وزیر اعلیٰ کو حاصل ہے اس لیے ہم ان سے یہ توقع رکھیں گے کہ نامزدگی کرتے وقت وہ ان مجاہدین آزادی کو نظر انداز نہیں کریں گے کہ جو نان شبینہ کو محتاج ہیں اور جنہوں نے بھیک مانگ کر اپنے بیٹوں کو صرف اس امید پر تعلیم دلائی ہے کہ وہ ایک دن ڈاکٹر بنیں گے، اب کی بار یہ ریوڑیاں صرف اپنوں میں ہی نہیں بٹنی چاہئیں۔

☆☆☆

اگست ۱۹۷۷ء

مجاہدین آزادی...... ماڈل ۱۹۷۵ء

چراغ بیگ کو غیر معتبر ذرائع سے یہ معتبر خبر موصول ہوئی ہے کہ ریاستی حکومت نے اُن مجاہدین آزادی کی سوانح حیات لکھنے کے لیے ایک خفیہ کمیٹی قائم کی ہے کہ جن کے عزم و ایثار اور جنگ آزادی میں نمایاں کارناموں کی تفصیلات ابھی تک محکمہ سراغ رسانی کی ڈائریوں میں ہی پوشیدہ ہے۔ آزادی کے ان نئے اور گمنام مجاہدوں میں وزیر تعمیرات شری صونم نربو اور وزیر تعلیم ٹھاکور دیوی داس کا نام سرفہرست ہے۔ خفیہ کمیٹی نے ان کے بارے میں جو تفصیلات اور معلومات حاصل کی ہیں ان کی ایک کاپی ہمیں اتفاق سے مل گئی ہے اور ہم اسے باقاعدہ اشاعت سے پہلے ہی اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں (ادارہ)

صنم نربو:

نربو صاحب کے دل میں بچپن سے ہی آزادی کی سچی تڑپ موجود تھی۔ وہ ابھی بارہ سال کے بچے ہی تھے کہ جب انہوں نے پہلی بار شیر کشمیر کا نام سنا، اور نام سنتے ہی وہ اس پر کچھ ایسے فریفتہ ہو گئے کہ پھر وہ ساری زندگی اسی نام

کی مالا جپتے رہے۔ وہ بیس سال کے ہو گئے۔ تو انہوں نے لداخ میں باضابطہ نیشنل کانفرنس کی شاخ قائم کی اور دن رات نیشنل کانفرنس کے پرچار میں مصروف ہو گئے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب لداخ تو کیا جموں اور کشمیر میں بھی نیشنل کانفرنس کا نام لینا جرم تھا۔ لیکن صونم نربو کے جوش، ان کے جذبے اور ان کی جوانی کے سامنے سب کچھ ہیچ تھا۔ ان کے دل میں بس ایک ہی لگن تھی کہ وہ یہ کہ جموں و کشمیر اور لداخ ڈوگرہ راج کے ظلم سے آزاد ہو۔ اور ریاست پر شیر کشمیر کی قیادت میں ایک عوامی حکومت قائم ہو۔ پھر ایک دن نربو صاحب کا جوش اور ان کا جذبہ رنگ لایا۔ انہیں اپنی سیاسی سرگرمیوں کے جرم میں گرفتار کیا گیا اور وہ اڑھائی سال تک لداخ کی ایک ویران جیل میں نظر بند رہے۔ اڑھائی سال کی اس نظر بندی نے نربو صاحب کے حوصلے پست کرنے کے بجائے ان کے دل میں آزادی کی خواہش کو تیز کر دیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ مادرِ وطن کو ڈوگرہ مہاراجے کے تسلط سے آزاد کرنے کی جدوجہد میں شریک ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب نربو صاحب کے دوسرے ساتھی ڈوگرہ حکومت سے وظیفے حاصل کر کے ڈاکٹری، انجینئرنگ اور دوسرے شعبوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لیکن نربو صاحب پر تو شیر کشمیر کے نام نے جادو کر دیا تھا۔ اور وہ اسی نام کی مالا جپتے رہے۔ پھر ۱۹۴۶ء میں کوئٹ کشمیر کی تحریک شروع ہوئی ...... اور ریاست میں تحریک شروع ہونے کے تین ماہ بعد جب یہ خبر لداخ پہنچی تو صونم نربو نے وہاں کوئٹ لداخ کی تحریک شروع کر دی۔ وہ خود انڈر گراؤنڈ چلے گئے لیکن انہوں نے تحریک منظّم کر کے پورے لداخ میں آگ لگا دی۔ سینکڑوں نوجوان گرفتار ہو گئے۔ درجنوں بری طرح مجروح اور بہت سں لوگ ڈوگرہ راج کے ظلم سے بچنے کے لیے وہاں سے فرار

ہو گئے۔ یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب لداخ میں لوگ نربو صاحب کو بلبل لداخ کے نام سے یاد کرنے لگے۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی آئی تو نربو صاحب نے جلدی جلدی اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرلی اور وہ محکمہ پی، ڈبلیو، ڈی میں انجینئر ہو گئے۔ لیکن ۱۹۵۳ء میں جب بخشی غلام محمد نے شیخ صاحب کی حکومت کو بر طرف کر کے انہیں گرفتار کرلیا تو نربو صاحب نے ملازمت سے استعفیٰ دے کر بخشی صاحب کی حکومت کے خلاف ایک گوریلا تحریک منظّم کرنے کا بیڑا اٹھایا، بخشی صاحب نے انہیں کئی بار بلاوے بھیجے لیکن بہادر اور بلند ہمت نربو نے نہ صرف بخشی صاحب سے ملنے سے انکار کر دیا بلکہ اُنہیں یہ پیغام بھیج دیا کہ جب تک شیر کشمیر جیل میں ہیں، میں تمہاری حکومت کے خلاف بر سرِ پیکار ہوں گا۔ اس کے بعد بخشی صاحب نے صونم نربو کو گرفتار کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن بلبل لداخ کا گلشنِ کشمیر میں گرفتار ہونا اتنا آسان نہ تھا کہ جتنا بخشی صاحب کی پولیس کو نظر آتا تھا۔ یہ ان ہی دنوں کی بات ہے کہ صونم نربو کشمیر سے فرار ہو کر منگولیا پہنچے اور انہوں نے وہاں محاذ رائے شماری کی ایک شاخ منظّم کر کے کشمیر کی آزادی کے لیے اپنی جدو جہد جاری رکھی۔ یہ منگولیا میں اُن کی سرگرم جدو جہد ہی کا نتیجہ تھا کہ بین الاقوامی دباؤ اتنا بڑھ گیا کہ اندرا گاندھی شیخ صاحب سے مفاہمت کے لیے مجبور ہو گئیں۔ اسی لیے جب فروری ۱۹۷۵ء میں شیخ صاحب نے زمامِ اقتدار سنبھالی تو انہوں نے صونم نربو کو منگولیا سے بلوا کر اپنی کابینہ کا وزیر بنالیا۔ وزیر بننے کے بعد نربو صاحب پھر اپنی پرانی تنظیم نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گئے اور انہوں نے سڑکیں اور مکانات تعمیر کرنے کے بجائے نیشنل کانفرنس کی از سر نو تعمیر کو اپنی منزل اور اپنا مقصد قرار دیا۔ ۱۹۷۷ء کے اسمبلی انتخابات میں نربو صاحب نے لداخ میں نیشنل کانفرنس کا

جھنڈا بلند کر کے اندار گاندھی کی کانگریس کو چاروں شانے چت گرادیا۔ اور وہ ایک بار پھر نیشنل کانفرنس کی حکومت میں وزیر بن گئے۔ نربو صاحب کی اس عزت افزائی کے صرف دو اسباب ہیں! ایک نیشنل کانفرنس سے ان کی بہت پرانی وابستگی، دوسرا شیخ صاحب کی ذات سے ان کا بے پناہ عشق۔

ٹھاکر دیوی داس

روایت ہے کہ ٹھاکر صاحب جب آج سے پچاس برس قبل رام بن (جموں) کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تو انہوں نے پیدا ہوتے ہی ''شیر کشمیر زندہ باد'' کا نعرہ بلند کر کے سارے رام بن کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ پھر جب وہ ایک ہفتے کے ہو گئے تو انہوں نے اپنی توتلی زبان میں ''کشمیر چھوڑ دو'' کے نعرے بلند کرنا شروع کر دئے اور دور دراز علاقوں کے لوگ اس عجیب وغریب بچے کو دیکھنے کے لیے رام بن آنے لگے کہ جو اس کم سنی میں بھی گہرا سیاسی شعور رکھتا تھا۔ ٹھاکر صاحب کے بچپن سے منسوب یہ معجزے حقیقت ہیں یا افسانہ، لیکن اس میں کوئی شک نہیں وہ کہ سنِ شعور کو پہنچتے ہی تحریک حریت کشمیر سے گہرے طور وابستہ ہو گئے۔ یہ قصہ ہم نے ایک بچپن کے دوست سے سُنا ہے کہ وہ جب بارہ تیرہ برس کے تھے تو انہوں نے صرف شیخ صاحب کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے رام بن سے سرینگر تک کا سفر پیدل طے کیا اور سرینگر پہنچ کر جب انہیں معلوم ہوا کہ شیخ صاحب جموں گئے ہیں تو اسی وقت وہاں سے پیدل جموں کے لیے روانہ ہو گئے۔ افسوس کہ ان کے تین دن بعد جموں پہنچنے سے پہلے ہی شیخ صاحب کشمیر کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ اس ایک واقعے سے ٹھاکور صاحب کے دل میں شیخ صاحب کی عقیدت کا

اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ غالباً ۱۹۴۶ء کا قصہ ہے۔ ٹھاکر دیوی داس ان دنوں کالج کے طالب علم تھے۔ شیخ صاحب کوئٹ کشمیر تحریک کے سلسلے میں گرفتار کر لیے گئے تھے اور نوجوان ٹھاکر کا دل مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف نفرت سے لبریز تھا۔ ایک دن مہاراجہ بہادر کی سواری جموں کے روگھناتھ بازار سے گذر رہی تھی اور ٹھاکور پان کی ایک دکان پر کھڑا پان چبا رہا تھا جونہی مہاراج کی سواری پان کی دکان کے سامنے سے گذری، ٹھاکر صاحب نے آؤ دیکھا نے تاؤ وہ جھٹ سے مہاراجہ کی موٹر کے بونٹ پر سوار ہو کر شیر کشمیر زندہ باد اور کشمیر چھوڑ دو کے نعرے بلند کرنے لگے۔ مہاراجہ کی سیکورٹی اور پولیس کے افسران ٹھاکور کی دیدہ دلیری سے بہت بدحواس ہو گئے اور انہوں نے ٹھاکر کو موٹر سے اتارنے کے لیے اسے کھینچنا شروع کر دیا، لیکن ٹھاکور دیوی داس کے دل میں آزادی کی سچی لگن اور تڑپ تھی اس نے مہاراجہ سے مخاطب ہو کر کہا:

''مہاراجے! جب تک شیر کشمیر کو نہیں چھوڑو گے دیوی داس تمہاری موٹر سے نیچے نہیں آئے گا''۔ عینی مشاہدین کا کہنا ہے کہ جب تک مہاراجہ نے شیخ صاحب کو چھوڑنے کا وعدہ نہیں کیا، ٹھاکور دیوی داس اُس کی موٹر سے نیچے نہیں آئے۔

۱۹۵۳ء کے لگ بھگ ٹھاکر صاحب ایل، ایل، بی کے لیے ریاست سے باہر تھے، لیکن انہیں جب معلوم ہوا کہ بخشی صاحب نے شیخ صاحب کو گرفتار کیا تو انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کے نام اس مضمون کا تار دیا

''ارے او کشمیری پنڈت! یہ سب تمہاری سازش ہے، مجھ کو امتحان سے فارغ ہونے دے، میں آکر تم سے نپٹ لوں گا''۔

بخشی صاحب کے نام ایک طویل خط میں ٹھاکر نے لکھا:

”بخشی ! تم نے جو کچھ کیا اچھا نہیں کیا، میں امتحان میں مصروف نہ ہوتا، تو آ کر تمہیں گولی مار دیتا، لیکن بچو، مجھ سے بچ کر کہیں نہ جاؤ گے“۔

امتحان سے فارغ ہو کر جب ٹھاکر واپس آئے تو انہوں نے بظاہر وکالت شروع کر دی، لیکن وہ خفیہ طور محاذ رائے شماری کے ممبر بن گئے۔ اور انہوں بخشی غلام محمد کے خلاف ایک زبردست تحریک منظّم کی، یہ ان ہی دنوں کا واقعہ ہے کہ جب انہوں نے مرزا محمد افضل بیگ کا نام سنا، لیکن بیگ صاحب سے ان کی کیا بنتی، وہ تو براہِ راست شیخ صاحب پر عاشق تھے۔ ۱۹۵۶ء میں جب بخشی صاحب نے شیخ صاحب کے خلاف سازش کا مقدمہ چلانا شروع کر دیا تو ٹھاکر صاحب نے شیخ صاحب کو پیغام بھیجا کہ میں اس مقدمے میں آپ کی طرف سے مفت وکالت کرنا چاہتا ہوں۔ شیخ صاحب نے تو ہاں کر دی۔ لیکن جب بیگ صاحب کو اس کا پتہ چل گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ آدمی بخشی کا جاسوس معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ ٹھاکر ہو کر آپ کی مفت وکالت کرنے پر کیوں آمادہ ہوتا، بیگ صاحب کو کیا معلوم تھا کہ دیوی داس کے جسم اور اس کی روح پر شیر کشمیر کا ہی نام لکھا ہوا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب بلراج پوری، اوم صراف اور امرت ملہوترہ شیخ صاحب کے خلاف مقدمہ سازش میں گواہاں استغاثہ کے طور پر پیش ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ کچھ دنوں بعد ریاستی اسمبلی کے لیے انتخابات کا اعلان ہوا تو ٹھاکر صاحب بخشی صاحب کے امیدوار مرحوم اسد اللہ میر کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ وہ انتخابات تو ہار گئے لیکن انہوں نے جموں کے چپے چپے میں شیخ صاحب اور محاذ رائے شماری کا پیغام پہنچا دیا۔ پھر ایک دن انہیں کسی سرکاری جاسوس نے اطلاع دی کہ صادق صاحب کی حکومت شیخ صاحب کے

خلاف ایک اور جھوٹا مقدمہ چلانے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی ٹھاکر دیوی داس نے ہائی کورٹ جج بننے کی کوششیں کیں تاکہ جب شیخ صاحب کے خلاف مقدمہ دایر ہو، تو وہ ہائی کورٹ جج کی حیثیت سے انہیں بری کر دیں۔ الغرض ان کا ریاستی ہائی کورٹ کا جج بننا بھی تحریک حریت اور شیر کشمیر کی ذات سے ان کی گہری وابستگی اور عقیدت کا نتیجہ تھا۔ اس لیے جب فروری ۱۹۷۵ء میں شیخ صاحب خود ریاست کے وزیر اعلیٰ ہو گئے اور ان کے خلاف مقدمے کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہا۔ تو شیخ صاحب نے ٹھاکور صاحب کو اپنی کابینہ میں شامل کر کے قانون اور عدل وانصاف کا محکمہ سونپ دیا ۱۹۷۷ء کے اسمبلی انتخابات میں جب بہت سے لوگ نیشنل کانفرنس کو چھوڑ کر جنتا پارٹی اور دوسری پارٹیوں میں شامل ہو گئے، ٹھاکر صاحب چٹان کی طرح نیشنل کانفرنس کے ساتھ کھڑے رہے لیکن نیشنل کانفرنس سے اپنی گہری وابستگی کو انہوں نے ایک سرکاری راز کی طرح اس وقت تک چھپائے رکھا کہ جب تک اسمبلی میں نیشنل کانفرنس کو برابر ۴۸ نشستیں حاصل نہ ہوئیں۔ اس کے بعد انہوں نے پورے ڈھائی لاکھ کے مجمع میں نیشنل کانفرنس سے اپنی باقاعدہ وابستگی کا اعلان کر دیا۔

☆☆☆

۲۱/اگست ۱۹۷۷ء

اصلی مجرم کون

دہلی سے شائع ہونے والے ایک انگریزی جریدے On Looker میں مسز اندرا گاندھی، مسٹر سنجے گاندھی، شمیم احمد شمیم اور مسز گاندھی کے پرائیوٹ سیکریٹری مسٹر آر کے دھون کی ایک تصویر شائع ہوئی ہے، جس میں ان چاروں کے چہرے سے بے حد افسردگی ٹپکتی نظر آتی ہے۔ اس تصویر کو جالندھر سے شائع ہونے والے ایک کثیر الاشاعت اخبار ہند سماچار نے اپنی ایک اشاعت میں Reproduce کر کے اس کے نیچے یہ لکھ دیا کہ یہ تصویر ۱۲ جون کو سابق پردھان منتری کے نواس استھان پر اس وقت لی گئی، کہ جب مسز گاندھی کے خلاف راج نرائن کی دائیر کردہ عذرداری کا فیصلہ سُنایا گیا تھا۔ اس انکشاف کے بعد ''ہند سماچار'' نے یہ بھی لکھا کہ شری شمیم احمد شمیم اور شری سنجے گاندھی بہت اداس نظر آرہے ہیں۔ شری دھون کے مطابق اس وقت جو بھی اصحاب شریمتی اندرا گاندھی سے ملنے گئے تو انہوں نے آپ کو یہی مشورہ دیا کہ آپ کے مستعفی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ادھر روز نامہ ہند سماچار نے آن لکر میں شائع شدہ تصویر Reproduce کر کے اس پر اپنا نوٹ جما دیا اور ادھر سرینگر سے شائع ہونے والے ایک روزنامے کی مدیر کی باچھیں کھل گئیں

کہ شمیم صاحب پر اندرا نوازی اور شیخ نوازی کا تصویری ثبوت مل گیا ہے اور اس نے تصویری انکشاف کے عنوان سے کچھ مزید انکشافات کیے۔ ''ہند سماچار'' نے اشارتاً اور ان کے نقل نویس نے براہ راست شمیم صاحب پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ وہ ۱۲ جون کو مسز گاندھی کے خلاف الٰہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے پر وزیر اعظم کے ہاں ان سے یہ کہنے کے لیے گئے تھے کہ آپ ہرگز مستعفی نہ ہوں اور وہ چونکہ بے حد افسردہ اور غمگین نظر آتے ہیں اس لیے ثابت ہوا کہ انہیں مسز گاندھی کے مقدمہ ہار جانے کا بڑا غم تھا۔ میں نے اس سلسلے میں جو تحقیقات کی اس سے یہ ثابت ہوا کہ یہ تصویر واقعی ۱۲ جون کی ہے لیکن یہ مسز گاندھی کی رہائش گاہ پر نہیں، پرتھوی راج روڈ پر واقع کشمیر ہاؤس میں لی گئی ہے۔ یہ اُس وقت کی تصویر ہے کہ جب کہ مسٹر درگاہ پرشاد دھر کی لاش پنت ہاسپٹل سے کشمیر ہاؤس لائی گئی تھی اور مسز گاندھی اپنے صاحبزادے سنجے کے ہمراہ ان کی لاش پر پھول چڑھانے کے لیے آئی تھیں۔ اتفاقاً شمیم صاحب بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ فوٹو گرافرس نے وزیر اعظم اور ان کے صاحب زادے کی بہت سی تصویریں لیں، ایک تصویر میں شمیم صاحب بھی سما گئے، یہ ہے تصویر کی حقیقت اور اس کا افسانہ، لیکن فرض کیجیے کہ یہ تصویر واقعی مسز گاندھی کے نواس استھان پر ہی لی گئی ہوتی، اور یہ بھی مان لیجیے کہ شمیم صاحب کو مسز گاندھی کے مقدمہ ہار جانے کا بڑا افسوس تھا اور وہ حسرت ویاس کی تصویر بنے ان کے غم میں شریک تھے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ انہوں نے مسز گاندھی کو ہرگز مستعفی نہ ہونے کا مشورہ دیا ہوگا۔ لیکن ان تمام باتوں سے ہمارے ان پڑھ دوست کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ۱۲ جون کو مسز گاندھی نے مقدمہ ہارا تھا، ایمرجنسی نافذ کرنے کا اعلان نہیں کیا تھا۔ ۱۲ جون کیا شمیم صاحب تو ۲۴ جون تک مسز گاندھی کے حامی

تھے۔ مسز گاندھی سے ان کا اختلاف ۲۶ جون کے بعد شروع ہوا اور ایمرجنسی نافذ ہونے کے بعد انہوں نے ایک دن بھی مسز گاندھی کی حمایت نہیں کی۔ ہند سماچار اور اس کے نقل نویس دونوں کو اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ تصویر ۱۲ جون کی ہے اور ۱۲ جون کو مسز گاندھی کی حمایت کوئی سیاسی یا اخلاقی جُرم نہیں تھا۔ ہاں ۲۶ جون کے بعد جن صحافیوں نے ایمرجنسی، مسز گاندھی اور سنجے گاندھی کی تعریفیں کی ہیں وہ صحافتی بددیانتی اور اخلاقی پستی کے مجرم ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں۔

☆☆☆

۱۹/اگست ۱۹۷۷ء

پبلک سیکورٹی آرڈی ننس کے خلاف شدید ردعمل کا سیاسی اور نفسیاتی پس منظر

ریاستی حکومت نے پبلک سیکورٹی آرڈی ننس کے اپنے احمقانہ اور بزدلانہ فعل کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ''تعلقات عامہ'' کے محاذ پر ایک زبردست مہم شروع کر دی ہے۔ اخباری کانفرنسیں منعقد کی جا رہی ہیں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر انٹرویو دیے جا رہے ہیں۔ بیک گراؤنڈ میٹریل تیار کر کے اسے سرکردہ صحافیوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ بیرونِ ریاست کے اخبار نویسوں کو سرکاری مہمان بنا کر بلایا جاتا ہے اور پھر ان کی خاطر داریاں کی جاتی ہیں۔ نیشنل کانفرنسی کارکنوں اور یوتھ فیڈریشن کے ''غازیوں'' کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ آرڈی ننس کو بر وقت، برمحل، موزون اور اشد ضروری قرار دے کر اخبارات کے نام بیانات جاری کریں۔ انسپکٹر جنرل پولیس کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر سے دراندازی اور جاسوسی کے واقعات میں غیر معمولی اضافے کا دعویٰ کریں۔ بیرون ریاست عام لوگوں کے مذہبی جذبات ابھارنے اور ان میں خوف و ہراس پیدا کرنے کی غرض سے پاکستان کی طرف سے لاحق فرضی خطرات کے الارم بجائے جا رہے ہیں۔ غرض کالے قوانین کی اس گٹھری کو انصاف اور اخلاق کی پوٹلی ثابت کرنے کے لیے شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ سے لے کر محی الدین شاہ تک حکومت اور کانفرنس کے سبھی منصب دار ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ ناجائز آرڈی ننس کو جائز ثابت کرنے کی

موجودہ مہم کا آغاز ۸ نومبر کو اس اخباری کانفرنس سے ہوا کہ جس کو بیک وقت شیخ صاحب، بیگ صاحب اور ٹھاکر دیوی داس نے خطاب کیا۔ اس اخباری کانفرنس میں شامل ہونے والے اخبار نویسوں کا کہنا ہے کہ ایک مرحلے پر ان کے تیکھے سوالات کا جواب دیتے ہوئے وزیر تعلیم ٹھاکر دیوی داس اس قدر سٹ پٹائے کہ انہوں نے کہا کہ ''یہ اخباری کانفرنس ہے قانون ساز اسمبلی نہیں کہ جہاں ہم ہر بات کا جواب دینے کے پابند ہوں''۔

اس کانفرنس میں پہلی بار ہمارے محبوب قائداعظم جناب شیر کشمیر نے اپنی قوم کو پاکستان کی طرف سے لاحق خطرات کا احساس دلا کر چوکنا رہنے کی اپیل کی اور کہا کہ جب تک ہندوستان اور پاکستان کے درمیان باہمی تنازعات کا کوئی فیصلہ نہیں ہوتا، اس سرحدی ریاست میں پبلک سیفٹی آرڈی ننس جیسے سخت قوانین کی ضرورت باقی رہے گی۔ اس سلسلے میں بیگ صاحب نے اپنی روایتی ظرافت اور ستم ظریفی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ جنگ بندی لاین کے اس پار سے آئے دن مویشی ادھر کو آجاتے ہیں اور ان کا پیچھا کرتے ہوئے کچھ لوگ ناجائز طور سرحد پار کر کے ہماری طرف آجاتے ہیں، ایسے ہی لوگوں سے نپٹنے کے لیے پبلک سیفٹی آرڈی ننس کا نفاذ ضروری ہے۔ اس کے بعد بیگ صاحب نے وادی میں اور ٹھاکر دیوی داس نے جموں میں اپنی دفاعی مہم جاری رکھی اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

ریاستی حکومت کے منصب دار اور حکمران جماعت کے عہدیدار پبلک سیکورٹی آرڈی ننس کے خلاف ملک بھر کے شدید ردِعمل سے بیک وقت حیران اور پریشان نظر آتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ملک کے کسی کونے سے اس قانونی بہیمیت کے حق میں کوئی آواز کیوں بلند نہیں ہوتی۔ جنتا پارٹی کی

بات تو رہنے دیجیے، جس اندرا گاندھی، برہمانند ریڈی اور جیوتی باسو کو ہمارے محبوب قاید نے اپنا ذاتی مہمان بنا کر ان کی خاطر داری میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی وہ بھی اپنے میزبان کے اس قدم کی حمایت یا وکالت کے لیے آگے نہیں آتے۔ جیوتی باسو نے حمایت تو کیا اس کی مخالفت میں بڑا زوردار بیان بھی دے دیا۔

ہمارے حکمرانوں کو اگر ملک کی سیاست، اس کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں کا ذرہ بھی اندازہ ہوتا، تو وہ اس معاملے میں اپنی بے کسی اور بے بسی پر حیران نہیں ہوتے۔ انہیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ مارچ ۱۹۷۷ء کے انقلاب نے ملک کا موڈ بدل دیا ہے اور یہ ملک، سلامتی، سالمیت اور تحفظ کے نام پر کوئی ایسا قانون برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ جو حکمرانوں کے ہاتھ میں غیر معمولی اختیارات دے کر عدالتوں کے حق سماعت اور دائیرہ کار کو محدود کر دے۔ مسز گاندھی نے ایمرجنسی کے بیس ماہ کے دوران ان غیر معمولی اختیارات کا جس بے دردی کے ساتھ استعمال کیا ہے، اس کے بعد سے ہر حکمران کی نیت، اس کے خلوص اور اس کی معصومیت پر سے عام لوگوں کا اعتبار اٹھ گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے ہاتھوں میں غیر معمولی اختیارات کے مہلک ہتھیار دے کر اپنی تقدیر اور آزادی کو خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں۔ بیرونِ ریاست ریاستی حکومت کے پبلک سیفٹی ایکٹ کے خلاف شدید عوامی ردعمل کا یہی سبب اور جواز ہے اور آج کے ہندوستان میں کوئی سیاسی جماعت یا لیڈر اس قسم کے کالے قوانین کی حمایت کر کے اپنے منہ پر کالک ملنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔

ریاست میں کالے قوانین کی اس گٹھری کے خلاف عوامی ناراضگی اور بیزاری کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اسے شیخ محمد عبداللہ کی حکومت نے ہماری

پیٹھ پر لا دیا ہے۔ شیخ صاحب سے سیاسی اختلافات اور ان کی ذات سے بغض رکھنے والے لوگ بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ایسے ہی قوانین کے خلاف جدو جہد سے ہوا ہے اور گذشتہ چالیس بتالیس سال سے وہ بار ہا ان ہی کالے قوانین کا شکار رہے ہیں۔ حد یہ ہے کہ اگست ۵۳ء میں انہیں اسی سخت قسم کے احتیاطی نظر بندی قانون کے تحت گرفتار کیا گیا کہ جسے انہوں نے صرف چند ماہ پہلے وطن دشمن عناصر اور پاکستانی تخریب کاروں سے نپٹنے کے لیے نافذ کیا تھا۔ اس کے بعد برابر ۱۹۷۲ء تک وہ کسی نہ کسی ایسے ہی کالے قانون کے تحت نظر بند اور جلاوطن کیے جاتے رہے، اور ان کے ساتھ ہی ہزاروں لوگوں کو کالے قوانین کی یہ کالی شربت نوش کرنا پڑی۔ شیخ صاحب کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد جائیز طور پر عام لوگوں کو یہ توقع تھی کہ وہ سب کام چھوڑ کر سب سے پہلے ایسے قوانین کو منسوخ کریں گے کہ جن کی آڑ لے کر ان کے پیش روؤں نے سینکڑوں نوجوانوں کو اپنی زندگی کے بہترین سال جیل خانوں اور زندانوں میں گذارنے پر مجبور کر دیا، اور جن کا سہارا لے کر خود شیخ صاحب کو جلاوطن اور نظر بند کیا جاتا رہا۔ خود شیخ صاحب اور بیگ صاحب نے گذشتہ بائیس سال کے دوران بارہا اس امر پر افسوس اور گہرے رنج کا اظہار کیا تھا کہ کشمیر کی روح کو کالے قوانین میں جکڑ کر یہاں کے لوگوں کے لیے آزادی، عزت اور آبرو کی زندگی ناممکن بنا دی گئی ہے۔ اس لیے ہر شخص یہی آس لگائے بیٹھا تھا کہ موقع ملتے ہی ہمارا شیر یہ ساری زنجیریں کاٹ کر ہمیں آزادی، عزت اور آبرو کا مقام عطا کرے گا۔ اس مخصوص سیاسی، ذہنی اور نفسیاتی پس منظر میں جب ریاستی عوام نے یہ سنا کہ شیر کشمیر نے یہ زنجیریں کاٹنے کی بجائے اس میں مزید کچھ گرہیں لگا دی ہیں تو ان کی حیرت

میں مایوسی، ناراضگی اور بیزاری کا عنصر بھی شامل ہو گیا، اور وہ یہ سوچنے لگے کہ کیا اسی مقصد اور اسی انجام کے لیے وہ گذشتہ بیس پچیس سال سے مسلسل قربانیاں دیتے آئے ہیں۔ شیخ صاحب نے اپنے عمل سے نہ صرف لوگوں کو اپنے سے بدظن ہونے کا موقعہ دیا بلکہ انہوں نے اپنے اس فیصلے سے بخشی غلام محمد، خواجہ غلام محمد صادق اور سید میر قاسم کے گناہوں کی بھی بخشش کرا دی، کیونکہ ریاستی عوام بجا طور پر یہ سوچ رہے ہیں کہ اگر شیخ محمد عبداللہ اپنی غیر معمولی شخصیت، بے پناہ مقبولیت اور لامحدود سیاسی طاقت کے باوجود کالے قوانین کا سہارا لیے بغیر حکومت کا کاروبار نہیں چلا سکتے، تو بے چارے بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق نے کون سا قصور کیا تھا! شیخ صاحب اسی بات کو نہیں سمجھتے اور بیگ صاحب اسی بات پر اپنی وکالت کا پردہ ڈال کر لوگوں کو ذہنی انتشار میں مبتلا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ کیا ریاستی عوام کے مقدر پر ہمیشہ کے لیے کالے قوانین کے کالے بادل چھائے رہیں گے اور اگر شیخ محمد عبداللہ کے دور میں بھی ان قوانین سے چھٹکارا حاصل نہیں ہو سکتا تو پھر اس قوم کو اس مصیبت سے کب نجات ملے گی۔ تعجب اس بات کا ہے کہ ایک طرف شیخ صاحب مرکزی قوانین کا جائیزہ لے کر ان قوانین کو کالعدم کرنا چاہتے ہیں کہ جن کی وجہ سے ریاستی عوام کی آزادی اور اندرونی خودمختاری مجروح یا محدود ہوئی ہے اور دوسری طرف وہ خود ایسے قوانین نافذ کر رہے ہیں کہ جن سے فرد کی آزادی، شہریوں کے بنیادی حقوق اور اخبارات کی آزادی پر بڑی ناروا پابندیاں عاید کر دی گئی ہیں؟ پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا ہمارے قائد اعظم اسی خیال سے سپریم کورٹ کے دائیرہ کار اور حق سماعت کو محدود کرنا چاہتے ہیں کہ ریاست مین نافذ کیے جانے والے ان کالے قوانین کے خلاف

کہیں شنوائی نہ ہو سکے؟ اگر ان کے ذہن میں آزادی اور اندرونی خود مختاری کا یہی تصور ہے تو ہم ایسی آزادی اور خود مختاری کو دور سے سلام کرتے ہیں، کیا ایسے ہی قوانین کے تحفظ کے لیے وہ دفعہ ۳۷۰ کے تحت حاصل شدہ خصوصی حیثیت کو ہر قیمت پر بحال رکھنا چاہتے ہیں؟ اور کیا ایسے ہی قوانین کے نفاذ سے ریاستی عوام میں خودی، خودداری اور غیرت کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے؟ افسوس اس بات کا ہے کہ آج ہم مرکزی حکومت یا غیر نمائندہ ریاستی حکومتوں سے شکایت نہیں کر سکتے۔ کہ انہوں نے ریاستی عوام کی کمر پر کالے قوانین کی گٹھری لادھ دی ہے بلکہ آج صورتِ حال بالکل الٹ ہے اور آج مرکزی حکومت اور قیادت ریاست کی ایک نمائندہ حکومت اور ریاستی عوام کے سب سے مستند اور معتبر رہنما سے شکایت کر رہے ہیں کہ وہ ریاستی عوام کو کالے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ کر ان کی آزادی کو غصب اور ان کی عزت کو مجروح کر رہے ہیں۔ یہ صرف شیخ صاحب کی بدقسمتی نہیں، ریاستی عوام کی بدبختی ہے کہ جن رہنماؤں کے ہاتھ میں انہوں نے اپنی زنجیریں توڑنے کے لیے اعتماد اور عقیدت کی تلواریں دی تھیں وہ ان کی زنجیریں توڑنے کی بجائے ان کے وجود کو زخمی کرنے میں مصروف ہیں اور اس کے لیے جواز یہ دیا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ ان کی عزت اور عصمت کو بچانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ اسے انگریزی کے ایک محاورے کے مطابق زخموں پر نمک کا اضافہ کہتے ہیں۔

شیخ صاحب کی وضاحت، بیگ صاحب کی وکالت اور ٹھاکر دیوی داس کی مدافعت کے بعد اب نیشنل کانفرنس کے ایک اور قائد محی الدین شاہ نے اس آرڈی ننس کی ضرورت اور معقولیت کے بارے میں کچھ نادر خیالات ظاہر کیے ہیں، انہوں نے جموں سے جاری کردہ ایک بیان میں ہمیں یہ اطمینان

دلانے کی کوشش کی ہے کہ ہمیں کالے قوانین کے اس معجون مرکب سے اس لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ انہیں استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بقول ان کے یہ قوانین صرف احتیاطی طور کتاب میں درج کیے گئے ہیں اور جب تک شیر کشمیر کی ذات ہمارے درمیان موجود ہے ہمیں کسی اندیشے میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ کبھی ان کا غلط استعمال نہیں کریں گے ۔ میں خواجہ محی الدین شاہ کو ذاتی طور پر جانتا ہوں اور میں اس بات کی شہادت دینے کے لیے تیار ہوں کہ وہ اپنے برادر اکبر خواجہ غلام محمد شاہ کے مقابلے میں بڑے شریف اور بھلے مانس آدمی ہیں ۔ میری سیاسی لغت کے اعتبار سے وہ ''سیاسی معصوم'' ہیں اور ان کے اس بیان سے ان کے بھولے پن اور ان کی سیاسی معصومیت کی تصدیق ہوتی ہے ۔ شاہ صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ ہر ظالمانہ، جابرانہ اور بے ہودہ قانون کو پاس کرتے وقت یہی دلیل دی جاتی ہے کہ اولاً اس کا استعمال ہی نہیں کیا جائے گا اور اگر کبھی استعمال کرنے کی نوبت آئی تو اس کا غلط استعمال نہیں ہوگا۔

مسز اندرا گاندھی نے جب MISA کا کالا قانون پاس کیا تھا تو انہوں نے بھی پارلیمنٹ اور ملک کو یہی وشواس دلایا تھا کہ جب تک وہ اور ان کی جماعت برسر اقتدار ہیں اس کا غلط استعمال نہیں کیا جائے گا۔ لیکن شاہ صاحب جانتے ہیں کہ پاس ہونے کے فوراً بعد ہی اس کا کیسا غلط اور بے جا استعمال ہوا۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ شیخ صاحب کے ہوتے ہوئے اس قانون کے غلط استعمال کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قطع نظر اس بات کے کہ شیخ صاحب کے ہاتھوں ایسے قوانین کا غلط استعمال ہوا ہے اور محی الدین شاہ کی خوش فہمی حقائق سے زیادہ ان کی عقیدت کی پیداوار ہے۔ میں مانتا ہوں کہ شیخ صاحب

کے ہوتے ہوئے اس قانون کا غلط یا ناجائز استعمال نہیں ہوگا۔لیکن اس بات کی ضمانت کیا ہے کہ شیخ صاحب کا سایہ ہمارے سروں پر آئندہ چالیس یا پچاس سالوں تک قائم رہے گا۔اللہ تعالیٰ انہیں عمر دراز عطا کرے کہ ان کے دم قدم سے ان کے عاشقوں کی ہی نہیں، ان کے مخالفوں کی رنگینیاں بھی قائم ہیں۔لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہمارے درمیان موجود رہ کر، ہماری حفاظت اور ہماری عزت و آزادی کی ضمانت بنے رہیں گے۔کیا یہ ممکن نہیں کہ جس قانون کو انہوں نے بقول شاہ صاحب احتیاطاً قانون کی کتاب میں درج کر رکھا ہے، اسے ان کے بعد کوئی غلام محمد شاہ یا کوئی محی الدین اپنے ذاتی مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کرے۔ٹھیک جس طرح شیخ صاحب کے بنائے ہوئے نظر بندی کے قانون کو بخشی صاحب نے خود ان ہی کے خلاف استعمال کیا تھا، کیا اس بات کا امکان خارج از بحث ہے کہ مستقبل میں کوئی شخص شیخ صاحب کے بنائے ہوئے کالے قانون کو خود شیخ صاحب یا کسی دوسرے سیاسی مخالف کے لیے استعمال کرے۔سوال اس بات کا نہیں ہے کہ قانون کے استعمال کرنے کی ضرورت پڑے گی یا نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ حکومت کے اسلحہ خانوں میں اس قسم کا آتش گیر مواد جمع کرنے سے ایک ایسی روایت اور ایسا ماحول قائم ہو جاتا ہے کہ جسے اندرا گاندھی، بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد شاہ جیسے لوگ، لوگوں کو جلانے اور جھلسانے کے۔لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ پبلک سیکورٹی آرڈی ننس کے خلاف ہمارے اور ہماری طرح سوچنے والے لوگوں کے اندیشوں کی یہی اصولی بُنیاد ہے۔

☆☆☆

۱۶ر نومبر ۱۹۷۷ء

اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کیجیے

شیخ صاحب کے نام ش احمد کا دردناک خط

محترم شیخ صاحب

آپ کی ناسازیٔ طبع کی خبریں اور افواہیں سننے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک آپ مکمل طور روبہ صحت نہیں ہوتے۔ میں آپ کی شان میں کوئی گستاخی نہ کروں گا۔ لیکن ریاستی اسمبلی میں آپ کی تقریروں کی روداد اور آپ کی کارکردگی کا احوال سن کر جہاں یہ محسوس ہوا کہ آپ کی جسمانی علالت کی بے بنیاد خبریں محض آپ کے دشمنوں کی اڑائی ہوئی افواہیں ہیں، وہاں یہ بھی اندازہ ہوا کہ آپ جسمانی طور نہ سہی، ذہنی طور پراگندہ، سیاسی طور پژمردہ اور اخلاقی اعتبار سے صرف بیمار ہی نہیں بلکہ حالتِ نزع میں گرفتار ہیں۔ آپ کے نام یہ خط لکھنے کی تحریک، اسی احساس نے دی ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ اپنے معمول کی تمام مصروفیات ترک کر کے میرے اس محبت نامے کا مطالعہ کریں گے، میں آپ سے اس کے جواب کا اس لیے مطالبہ نہ کروں گا کہ آپ کے سیکریٹریٹ تو کیا آپ کی پوری تنظیم میں بھی ایسا آدمی نہیں کہ جو خط کا جواب دینا تو کجا خط پڑھنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ اپنے اردگردان پڑھوں

اور ادھ پڑھوں کا ہجوم جمع کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

ابوالفاروق!

آپ نے اس اخبار میں شائع ہونے والے میرے درجنوں خطوط پڑھ کر یہ اندازہ لگایا ہوگا کہ آپ کی ذات، سیاست، سٹائل، کنبہ پروری اور بے اصولے پن پر سخت قسم کی تنقید کرنے کے باوجود میں آپ کی سحر انگیز شخصیت اور سیاسی عظمت کا معترف ہوں۔ میں سخت اشتعال اور غیض و غضب کے عالم میں بھی اس حقیقت سے منکر نہیں ہوا ہوں، کہ آپ ایک زندہ تاریخ ہیں اور آپ کی ذات ہماری جدو جہد آزادی کا عنوان اور ہمارے خوابوں اور امنگوں کی علامت رہی ہے۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ بات کہتا ہوں کہ آپ کے چھوٹے پن، آپ کی تنگ نظری اور انتقام گیری اور میرے خلاف کسٹوڈین اور کسٹوڈین جنرل کی سطح پر گھٹیا قسم کی سازشوں میں شریک رہنے کے باوجود، میرے دل میں آپ کی ذات کے نہیں، لیکن آپ کی ذات کی علامتی حیثیت کے تئیں عقیدت و احترام کا ایک جذبہ آج بھی موجود ہے، اور اس کا تعلق آپ کے اس تاریخی کردار سے ہے کہ جس کی تعمیر میں طارق، فاروق اور مصطفیٰ کا پسینہ نہیں، اس ریاست کے لاکھوں نوجوانوں کا لہو صرف ہوا ہے۔ پچھلے کئی ماہ سے آپ اپنی ملازمت کے تحفظ اور اپنے خاندان کو ہیلی کاپٹر کی سواریاں کروانے کے لیے، جس بے دردی، بے رحمی اور بے اعتنائی کے ساتھ اپنی شخصیت کی اس علامتی حیثیت اور اپنے تاریخی کردار کی عظمت کو پامال کرنے میں مصروف ہیں اس نے میرے دل میں اس جذبے کو بھی مجروح کر دیا ہے کہ جو مخالفت، مخاصمت، باہمی دشمنی اور نفرت کی تُند و تیز ہواؤں کے باوجود

ابھی تک محفوظ اور صحیح وسالم تھا۔

ابوالطارق!

ہندوستان کی تاریخ کے سب سے گھٹیا وزیراعظم مرار جی ڈیسائی کو صبح کا تارا، اور دورِ حاضر کا واحد گاندھیائی لیڈر قرار دے کر آپ نے نہ صرف خوشامد، چاپلوسی اور ابن الوقتی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا، بلکہ کشمیر کے نوجوانوں کی قومی غیرت، ان کے جذبہ حمیت اور خودی کو بھی شدید طور مجروح کر دیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ آپ چونکہ اپنی عظمت، اپنے قد و قامت اور اپنے بے پناہ عوامی اعتماد کے بل بوتے پر ہندوستانی وزیروں کی مدح سرائی اور چاپلوسی کر کے ان کی خوشنودی اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کی مجبوریوں اور پابندیوں سے آزاد ہیں، اس لیے آپ باوقار طرزِ عمل اور خود دارانہ تکلم کے نئے معیار قائم کر کے بخشی غلام محمد، خواجہ غلام محمد صادق اور میر قاسم کی قائم کردہ روایت کو ختم کر دیں گے۔ لیکن مرار جی ڈیسائی کے سرینگر کی سرزمین پر قدم رکھنے کے لمحے سے لے کر ان کے یہاں سے چلے جانے تک آپ نے اپنے پورے خاندان کو لے کر ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں جو کچھ کیا، خود دار کشمیری نوجوان کے لیے اس کا تصور بھی روح فرسا ہے۔ دریائی جلوس کے اعزاز سے لے کر شیر کشمیر پارک کی قصیدہ گوئی تک آپ کی ہر ادا اور آپ کا ہر جملہ شیر کشمیر کے بجائے اس دیہاتی پٹواری کی یاد دلاتا رہا کہ جو اپنی رشوت خوری اور کمزوری پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں نائب صاحب کی راہ میں آنکھیں بچھاتا ہے۔ اسے مرغے کھلاتا ہے اور روانگی کے وقت نائب صاحب کی بیوی بچوں کے لیے اخروٹ سیب اور انڈوں کی تھیلیاں بھیجتا ہے۔ سوچیے کہ جس قوم نے

آپ کو بادشاہ نہیں شہنشاہ بنا دیا تھا، اس قوم کے ساتھ آپ نے کتنی بڑی نا انصافی کی ہے۔ میں اسے آپ کے اخلاقی زوال کی علامت سمجھتا ہوں۔

ابوالمصطفیٰ!

ذہنی پراگندگی، اخلاقی زوال اور سیاسی انحطاط کا جو عمل جولائی ۷۷ء کے انتخابات میں آپ کی کامیابی کے فوراً بعد شروع ہوا تھا وہ اس تیزی اور برق رفتاری کے ساتھ جاری ہے کہ آپ کے دوست تو الگ آپ کے دشمن بھی اس کے نتائج اور انجام سے کانپنے لگے ہیں۔ ۹ ستمبر کو ریاستی اسمبلی میں شاہراہ قراقرم کے سوال پر بحث کا جواب دیتے ہوئے آپ نے جس بزدلی، بے ہمتی اور بے اصولے پن کا ثبوت دیا ہے، اس نے میرے ہی نہیں، آپ کے بہت سے پرستاروں کے دل میں بھی آپ کی عزت و توقیر کم کر دی ہے۔ اس شام ایک غیر ریاستی اخبار نویس نے جب مجھے یہ طعنہ دیا کہ آج ہم نے آپ کے شیر کشمیر کا اصلی قد دیکھ لیا ہے، تو یقین کیجیے کہ آپ سے کوئی سیاسی ذاتی اور جذباتی وابستگی نہ ہونے کے باوجود میں بڑا شرمسار ہوا، اس مسئلے پر یوں تو آپ کی ساری تقریر آپ کے اخلاقی انحطاط اور ابن الوقتی کی آئینہ دار ہے لیکن آپ کا یہ دعویٰ کہ آپ ۱۹۵۱ء میں ریاستی اسمبلی کے سامنے پیش کردہ اپنے موقف سے کبھی منحرف نہیں ہوئے اور نہ آپ نے کبھی ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کے سیاسی جواز اور اس کی آئینی حیثیت کو چیلنج کیا، ایک سیاسی لیڈر کے اخلاقی زوال کی انتہا ہی نہیں، ایک عظیم ادارے Institution کی موت کا بھی اعلان تھا۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کس خوف، اور کس کے ڈر سے اپنی ۲۵ سالہ جدوجہد، تاریخ اور ماضی کی تکذیب کر کے مرار جی ڈیسائی اور اٹل بہاری

باجپائی کا پیارا بننے کی کوشش کرر ہے ہیں؟ وہ کون سی ایسی مجبوری ہے کہ جو آپ کو اتنی بڑی غلط بیانی اور دروغ مصلحت آمیز کی ترغیب دے رہی ہے؟ میں مانتا ہوں کہ آج آپ کی صحت وہ نہیں ہے کہ جو تھی، میں جانتا ہوں کہ بڑھاپے کے بڑھتے ہوئے قافلے نے آپ کی سوچ، آپ کی ہمت اور آپ کے حوصلوں پر اپنے جھنڈے لہرانا شروع کر دئے ہیں لیکن اپنی زندگی کے اس عظیم الشان سفر کو پنشن پانے والے سرکاری ملازموں کی طرح، حاکموں کی خوشنودی کر کے ملازمت میں توسیع کی کوششوں پر ختم کرنے کا کیا جواز ہے؟

قائداعظم

آپ کہتے ہیں کہ میں پچھلے ۲۷ سال سے اپنے موقف، یعنی ہندوستان سے الحاق پر ثابت قدمی سے قائم تھا۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ نے آزاد اور خود مختار کشمیر کے لیے امریکہ کی امداد طلب کرنا تو الگ رہا، امریکی سفیر لائی ہنڈرسن کی اس تجویز کو ناقابل عمل قرار دے کر رد کر دیا۔ آپ اعلان کرتے ہیں کہ ۱۹۴۹ء کو پاکستان کے ساتھ جنگ بندی کا اعلان کرنے سے پہلے آپ سے مشورہ نہیں کیا گیا۔ آپ کا اصرار ہے کہ آپ نے جن اصولوں کی بناء پر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے الحاق کیا تھا۔ آپ آج بھی اس پر سختی سے قائم ہیں میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر ۱۹۵۳ء سے ۱۹۷۵ تک کس جرم کی پاداش میں قوم کو مسلسل عذاب اور اذیت میں مبتلا رکھا گیا؟ اگر آپ کے سبھی دعوے صحیح ہیں تو پھر رائے شماری، حق خود داریت اور ''تیسرا راستہ'' کے ان خوب صورت مگر کھوکھلے نعروں کا کیا جواز تھا کہ جو ۲۵ سال تک اس قوم کے نونہالوں کو بہلاتے اور تڑپاتے رہے؟ میں آپ کی ایک ہزار تقریروں کے

ڈیڑھ ہزار حوالے دے کر آپ کے ان دعوؤں کی تردید کرنے میں آپ کا اور اپنے قارئین کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ لیکن مجھے یہ بتایئے کہ اگر آپ ۱۹۵۱ء کے اپنے موقف سے منحرف نہیں ہوئے تھے۔ تو ۱۹۶۸ء میں حضوری باغ کے ایک بھاری اجتماع کے سامنے جے پرکاش نرائن سے مخاطب ہو کر آپ نے انتہائی اشتعال انگیز لہجے میں یہ بات کس پس منظر میں کہی تھی۔

"جے پرکاش بابو! آزادی دی نہیں جاتی، آزادی چھین لی جاتی ہے"

یہ آپ کس آزادی کا ذکر کر رہے تھے، کس سے آزادی چھیننے کی بات کر رہے تھے، اور پھر بے چارے جے پی سے مخاطب ہو کر یہ بات کیوں کر رہے تھے؟ میں آپ کو یاد دلاؤں کہ جے پی نے اس دن صبح مجاہد منزل میں صرف اتنی سی بات کہی تھی کہ ہندوستانی وفاق کی چار دیواری میں رہتے ہوئے کشمیر کے کسی بھی منصفانہ حل کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے تیار ہوں، جے پی نے یہی بات اس جلسہ عام میں بھی دہرائی تھی اور آپ اس بات پر خفا تھے کہ اس نے کشمیر کے ہندوستانی وفاق کا حصہ رہنے کی شرط کیوں عاید کی تھی۔ یاد آ گیا نا آپ کو؟ اب بتایئے کہ ریاستی اسمبلی میں ۹ ستمبر کے آپ کے معافی نامے کا اس اعلان جنگ سے کیا تعلق ہے کہ جو آپ نے صرف دس سال قبل حضوری باغ میں کیا تھا؟

ٹھیک اسی طرح آپ نے سالہا سال تک اپنے آپ کو ہندوستانی شہری کہلانے سے نہ صرف اجتناب کیا بلکہ اپنے پاسپورٹ تک میں اپنے آپ کو ہندوستانی شہری کی بجائے کشمیری ڈیکلیر کیا۔ اس بات پر ہندوستان بھر میں ہنگامے ہوتے رہے لیکن آپ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ یہ الگ سوال ہے کہ

ریاست کے وزیراعلیٰ بن جانے کے بعد سے آپ نے اپنے دوشاہزادوں طارق اور فاروق کو ہندوستانی شہریت دلانے کے لیے بڑی محنت اور بڑی دوڑ دھوپ کی ۔ میں پوچھتا ہوں کہ وزیراعلیٰ بننے سے پہلے اپنی شہریت کو مسئلہ بنانے کا کیا جواز تھا اور وزیراعلیٰ بننے کے بعد اپنے بیٹوں کو ولایت سے وطن لوٹ کر ہندوستان کا شہری بننے کی ترغیب دینا، کس اصول اور آدرش کی تکمیل تھی اور پھر بھی یہ دعویٰ کہ میں کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کے اپنے موقف سے کبھی منحرف نہیں ہوا۔

تقدیر کے شہنشاہ!

گذشتہ ۲۵ سال کے دوران آپ کی ہزاروں تقریریں ، بیانات ، ارشادات اور فرمودات ملک کے اخبارات ، رسائل ، جرائد اور سینکڑوں کتابوں میں اس طرح محفوظ ہیں کہ انہیں جھیل ڈل کا سارا پانی بھی مٹا نہیں سکتا۔اس لیے آنکھیں بند کر کے ان کے وجود سے انکار کرنا ذہانت کی نہیں، حماقت کی نشانی ہے۔ بہادری کی نہیں ، بزدلی کی علامت ہے۔اس لیے یہ کوششیں ترک کر دیجیے ، اپنی کھوئی ہوئی اخلاقی جرأت ، اپنی جوانی کی ہمت اور اپنے بڑھاپے کی ساری غیرت کو مجتمع کرے اس بات کا اعلان اور اعتراف کیجیے کہ بعض ناگزیر وجوہات اور افسوس ناک حالات کی وجہ سے آپ کو ۲۵ برس تک ایک ایسا موقف اختیار کرنا پڑا کہ جسے بعد کے حالات اور واقعات نے اگر غلط نہیں، تو ناممکن العمل ثابت کر دیا۔اور بدلے ہوئے حالات اور عالمی سطح پر رونما ہونے والی بعض اہم تبدیلیوں کی روشنی میں ہم نے اپنے موقف اور سیاسی حکمت عملی کو بدل کر نئی حقیقتوں کو تسلیم کر لیا ہے۔دوٹوک الفاظ

میں اس بات کو قبول کر لیجیے کہ بعض ناگوار حالات کی بناء پر ۱۹۵۳ء میں کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کے فیصلے پر آپ کا اعتماد اور اعتقاد ختم ہو گیا تھا اور آپ نے اس فیصلے کو بدلنے کے لیے پورے پچیس برس تک پورا زور لگایا لیکن حالات کے سامنے آپ کی کچھ پیش نہ چلی۔ اس لیے آپ نے اپنے موقف کی غلطی اور اپنی حکمت عملی کی ناکامی کا اعتراف کر کے بدلے ہوئے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ اس بات کو تسلیم کرنے میں بھی کوئی مضایقہ نہیں کہ آپ ۱۹۵۰ء میں یا اس کے بعد کشمیر کو آزاد اور خود مختار بنانے کے سلسلے میں سوچتے رہے لیکن جب بین الاقوامی حالات اور برصغیر کی سیاسی کش مکش نے آپ پر یہ واضح کر دیا کہ یہ خیال ناممکن العمل ہے تو آپ نے اس کو ترک کر دیا۔ آپ کے ان اعترافات سے آپ کا اخلاقی مرتبہ بھی بلند ہوگا آپ کا اعتبار بھی بڑھے گا اور آپ بار بار اپنا معافی نامہ پیش کرنے اور رشی کمار کوشل کے سامنے بیان صفائی دینے کی زحمت سے بچ جائیں گے۔ جہاں تک آپ کی اپنی قوم کا سوال ہے، اس قوم کو تو آپ کی ذات سے عشق ہے۔ اس کی سمجھ میں آپ کی سیاست آئی ہی کب ہے جو آج آجائے گی۔ آپ اپنی قوم کے ردعمل سے بالکل بے نیاز ہو کر حق بات کہنے سے اپنی ناکامیوں کا اعتراف کیجیے۔ اپنی شکست کا اعلان کیجیے۔ اپنے بدلے ہوئے موقف کے بارے میں غلط تاویلیں پیش کرنے سے باز آیئے۔ تو آپ کی دنیا بھی سنور جائے گی اور عاقبت بھی، دوسرا راستہ بزدلی کا ہے، بے غیرتی کا ہے۔ جھوٹ اور فریب کا ہے، اور یہ راستہ شیروں کو نہیں، لومڑیوں اور مرغیوں کو زیب دیتا ہے۔

میرے شیر کشمیر!

وقت بہت کم ہے، زندگی اور موت کا درمیانی فاصلہ قریب سے قریب تر

ہوتا جا رہا ہے۔ ایک بار پھر شیر بن کر گرجئے۔ دیہاتی پٹواری کی طرح نائب تحصیلداروں کی خوشامد نہ کیجیے۔ آپ کی ذات کے ساتھ جو طلسم وابستہ ہے، اسے نہ توڑیئے۔ اپنی شخصیت کے علامتی کردار کو تباہ نہ کیجیے۔ کیونکہ ہمارے پاس اور کوئی ایسا سرمایہ نہیں کہ جس کی بنیاد پر ہم اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کا لہو گرما سکیں۔ آپ اگر صرف فاروق کی جان نشینی کے لیے اتنی بڑی قیمت ادا کر رہے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم آپ کے فاروق کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے لیکن خدارا اپنی عزت، اپنی غیرت، اپنی شبیہہ اور اپنے طلسم کو مجروح نہ کیجیے۔

میں ہوں آپ کا

ش۔ احمد

☆☆☆

۱۲ر ستمبر ۱۹۷۸ء

بیگ صاحب کا انکشاف

نائب وزیر اعلیٰ میرزا محمد افضل بیگ کی ظرافت ان کی سب سے بڑی طاقت بھی ہے اور سب سے بڑی کمزوری بھی۔ یہ ان کی ظرافت ہی کا کرشمہ ہے کہ وہ پچھلے چالیس سے برابر شیخ صاحب کے ہم سفر، ہمدم اور ہم رکاب رہے ہیں۔ وہ بڑے سے بڑے حادثے کو بھی اس طرح پی جاتے ہیں کہ جیسے شربت روح افزا پی رہے ہوں۔ انتہائی سنجیدہ اور رنج دہ واقعات کو ہنسی مذاق میں اڑانا صرف ان کی شخصیت کا ہی خاصہ نہیں، ان کی سیاسی حکمت عملی کا بھی حصہ ہے اور اس کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنی ظریفانہ حس کی تسکین کے لیے وہ کبھی کبھی اس قسم کی لطیفہ گوئی پر اُتر آتے ہیں کہ ان کے مذاق پر پھکڑ پن کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ اسی نوعیت کا ایک لطیفہ ابھی پرسوں انہوں نے دہلی میں سماچار کے نمائندے کو بھی سنایا۔ بیگ صاحب نے ایک نہایت ہی سنجیدہ بیان کے دوران یہ شگوفہ چھوڑ دیا کہ ریاست کے حالیہ انتخابات میں نیشنل کانفرنس کی فتح سیکولرازم کی فتح ہے۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ بیگ صاحب کا لطیفہ سن کر سماچار کے نمائندے پر کیا گذری ہوگی لیکن قیاس غالب ہے کہ وہ بیگ صاحب کے اس انکشاف پر ہنستے ہنستے بے ہوش ہو گیا ہوگا۔ ادھر اپنے شہر میں جس کسی نے بیگ صاحب کا یہ لطیفہ سنا، وہ بیگ صاحب کی ظرافت اور ان کی قوت اختراع کی داد دئے بغیر نہ رہ سکا۔ جموں و

کشمیر کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ نیشنل کانفرنس نے حالیہ انتخابات کے دوران بے تحاشا قرآن اور اسلام کا نام استعمال کیا۔ دیہات میں لوگوں سے کہا گیا کہ جنتا پارٹی کو ووٹ دینا گیتا کو ووٹ دینے کے مترادف ہے اور نیشنل کانفرنس کی کامیابی اسلام کی کامیابی ہے۔ بہت سی خواتین سے جب پوچھا گیا کہ انہوں نے کس کو ووٹ دیا تو انہوں نے بڑی معصومیت سے جواب دیا کہ ہم نے اپنے دین کو ووٹ دیا۔ نیشنل کانفرنسی کارکنوں نے معصوم اور بھولے بھالے دیہاتیوں کو قرآن ہاتھ میں دے کر ان سے وعدہ لیا کہ وہ صرف نیشنل کانفرنس کو ووٹ دیں گے۔ جنتا پارٹی کے متعلق کھلم کھلا یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ یہ جن سنگھی ہیں اور اگر یہ پارٹی یہاں کامیاب ہوئی، تو پھر مسلمانوں کو عید قربان پر قربانی کی اجازت نہیں ہوگی۔ نیشنل کانفرنس کے ذمہ دار ترین رہنماؤں نے پبلک جلسوں میں لوگوں سے کہا کہ جنتا پارٹی تمہیں سندور کا ٹیکہ لگوانے پر غور کرے گی۔ خود بیگ صاحب نے بھی اس گمراہ کن مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اب بڑی معصومیت سے کہتے ہیں کہ نیشنل کانفرنس کی فتح سیکولرازم کی فتح ہے، یہ ہے بیگ صاحب کی لطیفہ گوئی کا کمال اور ان کی ذہانت وظرافت کی انتہا۔

☆☆☆

۱۳راگست ۱۹۷۷ء

ش، احمد کی ڈائری

ہر چہ بر خود مہ پسندی

یہ ستمبر ۱۹۷۶ء کی بات ہے، نئی دہلی کے سرکاری اور سیاسی حلقے پارلیمنٹ کے اندر اور باہر میری گستاخیوں پر سیخ پا تھے، وزیر اعظم اندرا گاندھی نے صدر کے ایڈریس پر شکریے کی تحریک پر بحث کا جواب دیتے ہوئے خاص طور پر میری قابلِ اعتراض سرگرمیوں کا تذکرہ کیا تھا، مسز گاندھی نے کہا تھا، ہمارا خیال تھا کہ اس آنریبل ممبر کی شرارتیں اس ایوان تک ہی محدود ہیں لیکن ہمیں اطلاع ملی ہے کہ یہ صاحب اپنی ریاست میں بھی شر انگیز سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ مسز گاندھی کا اشارہ، پردیش کانگریس اور ایمرجنسی کے خلاف میری اخباری مہم کی طرف تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اعلیٰ سطح پر میری گرفتاری کے بارے میں غور وخوض شروع کیا گیا ہے۔ لیکن میرے گرفتار کیے جانے سے پہلے شیخ صاحب کو اس کی اطلاع دینا ضروری سمجھا گیا اور یہ کام کانگریس کے اس وقت کے صدر شری دیو کانت بروا کو سونپ دیا گیا۔ انہی دنوں شیخ صاحب کسی کام سے دہلی گئے اور وہاں کچھ کانگریسی ممبران پارلیمنٹ نے ان سے ملاقات کی، بقول شیخ صاحب بعض کانگریسی ممبران نے اس بات کا سخت شکوہ کیا کہ میں ایمرجنسی اور مسز گاندھی کی مخالفت میں پیش پیش ہوں اور میں حکومت کی برائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ کانگریسی ممبران پارلیمنٹ کی شکایت کا مقصد یہ تھا کہ شیخ صاحب مجھے ضبط ونظم میں رکھنے کی

ذمہ داری لے کر مجھے خاموش اور محتاط رہنے کی ہدایت کریں گے، لیکن غیر متوقع طور پر شیخ صاحب نے انہیں زبردست جھاڑ دی۔ انہوں نے میری طرف سے معذرت پیش کرنے کی بجائے میری زبردست وکالت کی اور کہا ”اگر شمیم جیسا نوجوان آپ کے ساتھ نہیں ہے تو یہ آپ کی کمزوری اور نااہلیت ہے اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ میں اس کو اپنے ساتھ رکھنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کا مقرر ہے۔ بہت اچھا لکھنے والا ہے اور ہر بات پر خود سوچنے کی صلاحیت رکھنے والا ہے۔ ایسے نوجوانوں کو آپ زبردستی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ اسے اپنے نکتہ نظر کا قائل کریں اور اپنے اخلاق سے اسے اپنا ہم خیال بنائیں۔ میری رائے میں اگر وہ آپ کے ساتھ نہیں ہے تو یہ آپ کی ناکامی ہے۔ بعد میں یہی بات شیخ صاحب نے مسٹر برو اور مسٹر اوم مہتہ سے بھی کہی۔ اور اس طرح میری گرفتاری کا مسئلہ ٹل گیا۔ یہ واقعہ مجھے شیخ صاحب نے ان ہی دنوں سنایا تھا اور بعد میں کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کے چیف وہپ مسٹر وکرم مہاجن نے اس کی تصدیق کی تھی۔

ستم ظریفی ملاحظہ کیجیے کہ ایک سال بعد جب شیخ صاحب کو خود میری مخالفت اور بغاوت کا سامنا کرنا پڑا تو انہوں نے حکم دیا کہ ”آئینہ“ کے اشتہارات بند کر دو، اس کا دفتر چھین لو، اس کو اپنے گھر سے بے گھر کر دو، اس کے نام اگر کوئی سرکاری رقم بقایا ہے تو اسے جیل میں بند کر دو، اسے اگر سابقہ حکومتوں نے زمین کا کوئی پلاٹ دیا ہے تو وہ اس سے واپس لے لو۔ یعنی جس طرح ممکن ہو سکے، اس کا جینا حرام کر دو، اب شیخ صاحب کو کون بتائے کہ انسانوں کی زندگی اور ان کے رزق کا اختیار اللہ تعالیٰ نے کسی وزیر اعلیٰ کو سونپنے کی بجائے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اس لیے شیخ صاحب کے ان غیر جمہور

پسندانہ اقدامات کے باوجود وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔ ایک سال قبل شیخ صاحب نے کانگریسی لیڈروں کو میری نسبت جو کچھ کہا تھا وہ آج انہیں یاد نہ ہوگا اس لیے اس کی یاددہانی کے لیے اس واقعے کا ذکر کیا ہے۔

انقلابات زمانہ

پچھلے آٹھ دس سال کے دوران مرزا محمد افضل بیگ اور غلام محمد بھدرواہی ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ ریاست کے سیاسی اور سماجی حلقوں میں ان کی دوستی اور قربت کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ بیگ صاحب اور خواجہ غلام محمد شاہ کے درمیان ہر معرکہ آرائی میں بھدرواہی صاحب، بیگ صاحب کے ساتھ ہوا کرتے تھے اور شاہ صاحب کی نگاہوں میں بھدرواہی ہی ہر فتنے کا باعث اور اس کی بنیاد تھے۔ بیگ صاحب بھدرواہی صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے اور مجھے اس بات کا ذاتی علم ہے کہ بھدرواہی صاحب بھی شیخ صاحب کے مقابلے میں بیگ صاحب کو زیادہ محبوب رکھتے تھے، بیگ صاحب سے اس قربت اور وفاداری کے نتیجے میں بھدرواہی صاحب کو کئی بار انعام واکرام سے محروم ہونا پڑا اور صرف اس گناہ کی پاداش میں ان سے کم تر درجے کے سیاسی کارکنوں کو ان پر فوقیت دی گئی۔ ۱۹۷۶ء میں نیشنل کانفرنس کی جنرل سیکریٹری شپ سے بھدرواہی صاحب کا استعفیٰ بھی اُن کی بیگ صاحب سے وفاداری کا ہی ایک مظاہرہ تھا اور خود شیخ صاحب کا تاثر بھی یہی تھا کہ بھدرواہی نے بیگ کے اشارے پر استعفیٰ دیا ہے۔ غرض بیگ اور بھدرواہی کو لازم وملزوم اور ایک جان دو قالب سمجھا جاتا تھا لیکن یہ حکایت اب ڈیڑھ سال پرانی ہو چکی ہے، اس ڈیڑھ سال کے دوران بھدرواہی

صاحب، بیگ صاحب سے ٹوٹ کر شاہ صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو چکے ہیں اور اب وہ بیگ صاحب کی بجائے شاہ صاحب کو اپنا مرشد، مربی اور محافظ مانتے ہیں۔ وہ کھلم کھلا بیگ صاحب کی کمزوریوں، کوتاہیوں اور ان کی بے وفائی اور بے مروتی کی حکایات سناتے پھرتے ہیں اور خواجہ غلام محمد شاہ کی پوشیدہ خوبیوں اور ان کی دوست نوازی کے افسانے دہراتے رہتے ہیں۔ بھدرواہی صاحب کی بیگ دشمنی کا اب یہ عالم ہے کہ شاہ صاحب کے کیمپ میں انہوں نے اب باضابطہ طور بیگ دشمنی کی مہم سنبھالی ہے اور شاہ صاحب اور شیخ صاحب دونوں اس بات پر خوش نظر آتے ہیں کہ بیگ صاحب ہی کی بلی اب بیگ صاحب کو میاؤں کر رہی ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق بھدرواہی صاحب کو کابینہ میں شریک ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ بیگ صاحب کے اثر سے آزاد ہو جائیں۔ وزیر ہونے کے فوراً بعد جب انہوں نے شاہ صاحب کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا تو انہیں پارلیمانی امور کے بے ضرر محکمے کی بجائے شاہ صاحب نے اپنی تحویل میں لے کر ٹرانسپورٹ کے محکمے کا انچارج بنا دیا۔ بھدرواہی صاحب کی وفاداری اگر اس رفتار سے قابل اعتبار رہی تو مستقبل قریب میں ان کے پورے وزیر ہونے میں یقیناً کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہے گا۔ ادھر بیگ صاحب کے قریبی حلقوں کا کہنا ہے کہ وہ بھدرواہی صاحب کی اس تبدیلی پر پریشان ضرور ہیں لیکن حیران نہیں ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ سمجھ دار لوگ ایک ایک کر کے انہیں چھوڑتے جا رہے ہیں اور وقت آ رہا ہے کہ جب خواجہ عبدالصمد تیلی کے علاوہ ان کے ساتھ کوئی نہ ہوگا

انقلابات ہیں زمانہ کے!

نیا جانشین

تین چار سال قبل محترم شیخ صاحب اپنی ہر تقریر اور ہر جلسے میں بیگ صاحب کو اپنا جانشین نامزد کیا کرتے تھے۔ شاہی مسجد ہو یا درگاہ شریف، حضرت بل، مجاہد منزل ہو یا لال چوک، شیخ صاحب محل بے محل، وقت بے وقت بیگ صاحب کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا فرض انجام دیتے، یہ اُن دنوں کی بات ہے کہ جب قائد اعظم کشمیری عوام کی بے غیرتی اور بے حسی پر آنسو بہا کر اپنی لاش کو بحیرہ عرب کی لہروں کے سپرد کیے جانے کی وصیت کیا کرتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی بیگ صاحب کی جانشینی کا بھی اعلان کرتے، شیخ صاحب کے جانشین نامزد کرنے کی اس روش پر ہم نے ان دنوں سخت احتجاج کیا تھا کہ اس سے بادشاہوں اور جاگیرداروں کی روایات تازہ ہو جاتی ہیں، لیکن قبلۂ محترم بیگ صاحب پر ان دنوں اس بُری طرح عاشق تھے کہ وہ ہمارے احتجاج اور اعتراض کے باوجود انہیں اپنا جانشین نامزد کرتے رہے۔
یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب نہ شیخ صاحب کے اقتدار میں آنے کا کوئی امکان نظر آتا تھا اور نہ ان کے مضبوط دل پر بیماری کا کوئی حملہ ہوا تھا۔ لیکن ۱۹۷۵ء میں وزیر اعلیٰ بن جانے اور ۱۹۷۷ء میں عارضۂ قلب میں مُبتلا ہونے کے بعد سے شیخ صاحب نے بیگ صاحب کی جانشینی کے موضوع کو کچھ اس طرح بھلا دیا ہے کہ غالباً اب بیگ صاحب اور میرے علاوہ کسی کو یہ بات یاد بھی نہ ہوگی۔ اس موضوع پر شیخ صاحب کو غالباً بیگ صاحب سے زیادہ موزوں اور بہتر جانشین مل گیا ہے اور اسی لیے وہ اپنی پرانی وصیت کو کالعدم قرار دے کر نئی وصیت کرنے کے لیے موقع اور محل تلاش کر رہے ہیں۔

۲۴ رمئی ۱۹۷۸ء

عیداور سیاست

عیدالضحیٰ کا فلسفہ قربانی، ایثار اور خدا کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے کے اس جذبے کی تجدید سے تعلق رکھتا ہے کہ جس کا مظاہرہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی پیش کر کے کیا تھا۔ اس دور میں جب کہ ہمارے حکمران اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی خاطر اپنی قوم کے مفادات اور اپنا ایمان تک قربان کر دیتے ہیں، عیدالضحیٰ کی اہمیت اور معنویت کچھ اور زیادہ بڑھ گئی ہے لیکن افسوس کہ اس مقدس اور متبرک تقریب پر بھی ہمارے حکمران اپنی روح کو غسل دینے کی بجائے اداکاری، ریاکاری اور سیاست گری کا بازار گرم کر کے غریب عوام کو مسلسل ترغیب دینے کے اپنے شغل سے باز نہیں آتے۔ عیدگاہوں میں، عید کے موقع پر سیاسی تقریریں اور مظاہرے کرنے کی روایت بھی بابائے قوم جناب شیخ محمد عبداللہ نے شروع کی ہے اور اب ان کی دیکھا دیکھی نیشنل کانفرنس حکومت کا ہر وزیر اور نمبردار عیدگاہوں میں قوم سے خطاب کرنا اپنا پیدائشی حق اور فرض منصبی سمجھنے لگا ہے۔ ٹھیک جس طرح محترم شیخ صاحب اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ عیدگاہ میں نماز عید ادا کرنے والا ہر شخص ان کا ذاتی وفادار اور ان کی بدلتی ہوئی سیاست کا مستقل خریدار ہے۔ اسی طرح ہر گاؤں اور ہر قصبے میں ان کے پیچھے نماز عید کے ہر مقتدی کو نیشنل کانفرنس کا والنٹیر سمجھ کر اس سے خطاب شروع کر دیتے ہیں اور نتیجہ یہ کہ ہر عیدگاہ سیاست کی آماجگاہ اور فلسفہ عید کی قربان گاہ بن جاتا ہے۔ سرینگر میں عید کے دن کاوڈارہ کے قریب دو مخالف سیاسی گروہوں کا تصادم اور اننت ناگ میں مرزا محمد افضل بیگ اور غلام نبی کوچک کی معرکہ آرائی اسی سیاست گری اور جنگ زرگری کا ایک حصہ ہے۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمارے لیڈران کرام کم از کم عید کے دن نمازِ عید میں شرکت کرنے والے مسلمانوں کو اپنی تقریروں کے کڑوے گھونٹ پلانے سے احتراز کریں؟ کیا یہ ضروری ہے کہ اس متبرک دن پر بھی ہمارے سیاسی رہنما اور سرکاری وزیر اپنی ذات، سیاست اور حکومت کا پرچار کر کے عید گاہوں کے تقدس اور ان کی پاکیزگی کو مجروح کردیں۔ شیخ صاحب ساری زندگی مذہب اور سیاست کو انسانی زندگی اور فکر کے دو الگ الگ شعبے قرار دیتے رہے ہیں لیکن جب سے وہ وزیر اعظم ہو گئے ہیں وہ درگاہ شریف حضرت بل اور عید گاہ دونوں مقامات پر اپنی حکومت کی وکالت اور اس کی پالیسیوں کی وضاحت کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ کیا انہیں اپنے محکمۂ اطلاعات کی کارکردگی پر اعتماد نہیں کہ جو وہ خود افسر اطلاعات بن کر اپنی حکومت کی کاروائیوں اور کارکردگیوں کا ڈھنڈورہ پیٹتے پھرتے ہیں، ہمیں ان کے اطلاعاتی رول پر کوئی اعتراض نہ ہوتا اگر وہ اس مقصد کے لیے خانقاہوں، زیارت گاہوں اور عید گاہوں کو استعمال نہ کرتے۔

دوہرے معیار

عید الضحیٰ کے دن عید گاہ میں ریاست کے وزیر اعظم جناب شیخ محمد عبداللہ نے جو تقریر دلپذیر ارشاد فرمائی وہ زندگی، سیاست اور حکومت میں ان کے دوہرے معیار روں کی ایک اچھی مثال ہے۔ شیخ صاحب نے اہالیان شہر سے مخاطب ہو کر کہا کہ، سردی کا موسم آ گیا ہے اور موسم سرما میں آپ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور ان مشکلات پر قابو پانے کے لیے آپ کو اپنے اندر خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کے علاوہ صبر اور ضبط کا جذبہ پیدا کرنا

چاہیے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے سے سردی کی شدت کم کیسے ہوگی اور خدا اعتمادی کے سہارے کوئلوں کی فراہمی اور برقی رو کی دقت کے مسائل کیوں کر حل ہوں گے۔ بجائے اس کے کہ شیخ صاحب لوگوں کو یہ اطمینان دلاتے کہ ان کی حکومت نے موسم سرما کی تمام ضروریات کی بہم رسانی کے تسلی بخش انتظامات کیے ہیں انہوں نے بڑی چالاکی سے اس محاذ پر اپنی حکومت کی نااہلی اور ناکامی کی ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دی ہے یہی وجہ ہے کہ خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کے علاوہ انہیں صبر وضبط کی بھی تلقین کی گئی ہے کیونکہ بقول شیخ صاحب ہر مشکل پر قابو پانا انسان کے بس کی بات نہیں۔ موسم سرما کے لیے وادی میں رہنے والے بدنصیب لوگوں کو ضروریات زندگی فراہم کرنا ریاستی حکومت کی کم سے کم ذمہ داریوں میں شامل ہے اور شیخ صاحب کی پیشرو حکومتیں خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کا سہارا لیے بغیر ان فرائض اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو چکی ہیں۔ لیکن بابائے قوم اپنی حکومت کی ناکامیوں پر خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کا پردہ ڈال کر بیک وقت ایک ٹکٹ میں دو مزے لے رہے ہیں۔ ایک اپنی حکومت کی ناکامی اور نامرادی کا جواز پیش کرنے کا مزا اور دوسرا اپنی خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کا پروپاگنڈا، شیخ صاحب کا دوسروں کو خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کا درس دینے کی اس ادا کا اس پس منظر میں جائزہ لینا چاہیے کہ موسم سرما کی قہر سامانیوں کا خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کے بل بوتے پر مقابلہ کرنے کے لیے ان کے اپنے خاندان کا ایک بھی فرد یہاں موجود نہ ہوگا اور خود جموں میں ان کی سرکاری قیام گاہ میں بجلی کی ایک خصوصی لائین صرف اس لیے لگا دی گئی ہے کہ وہاں تین تین چار چار ہزار واٹ کے بجلی کے درجنوں ہیٹر چوبیس گھنٹے جلتے رہیں۔ انہیں یا

ان کی کابینہ کے کسی رکن کو موسم سرما کی بے اعتدالیوں اور من مانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے خود اعتمادی یا خدا اعتمادی کی اس لیے ضرورت نہیں ہوگی کہ ان میں سے کسی کو کوئلہ، بالن یا راشن خریدنے کی مصیبت برداشت نہ کرنا پڑے گی شیخ صاحب شاید اپنی وہ تقریر بھول چکے ہیں کہ جو انہوں نے اقتدار کے پنجرے میں بند ہونے سے دو یا تین سال قبل سرینگر میں کی تھی اور جس میں انہوں نے بجلی کی چوری کا جواز دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر حکومت کوئلے، بالن، اور مٹی کا تیل فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے تو پھر عام لوگ بجلی کی چوری نہ کریں تو کیا کریں گے۔ اس وقت شیخ صاحب نے لوگوں کو خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کے سہارے اپنے جسم اور چولہے گرم کرنے کا مشورہ نہ دیا تھا لیکن آج انہیں قدم قدم پر خدا یاد آ رہا ہے۔

ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا

مجاہدین آزادی کا نیلام

شیخ صاحب اور ان کے صاحبزادے طارق عبداللہ دونوں کو سرکاری ملازمین کا سیاسی سرگرمیوں اور ٹریڈ یونین کاروائیوں میں حصہ لینا سخت ناپسند ہے۔ باپ نے اس جُرم میں ایک درجن سے زاید کم تنخواہ پانے والے سرکاری ملازمین کو ملازمت سے برطرف کر کے انہیں کسی قیمت پر بحال نہ کرنے کی قسم کھائی ہے اور بیٹے نے باپ کے نقش قدم پر چل کر ٹورسٹ ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے سو سے زاید افراد کو صرف اس لیے بے کار اور بے روزگار بنا دیا ہے کہ وہ کم تنخواہ پانے والے ملازمین کی فیڈریشن سے وابستہ ہو کر اپنے جائیز حقوق کے لیے جدوجہد کرتے تھے۔ باپ بیٹے کا اصول، صحیح ہے یا غلط اس

وقت اس سے بحث نہیں لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ دونوں ہی اپنے اس اصول کے نفاذ اور استعمال میں بھی بے اصولی اور جانبداری کا مظاہرہ کرتے آئے ہیں۔ طارق عبداللہ ایک سرکاری ملازم ہونے کے باوجود انگریزی اخبارات میں بڑی باقاعدگی سے سیاسی معاملات اور نزاعی مسائل پر مراسلے شائع کرتے رہتے ہیں اور اُس وقت انہیں یہ یاد نہیں رہتا کہ سرکاری قواعد و ضوابط کی رو سے ایسا کرنا ناجائز ہے۔ جہاں تک کارپوریشن کے چیئرمین یعنی ان کے والد محترم کا تعلق ہے ان کے بارے میں سُنا ہے کہ وہ اخبارات میں اپنے صاحبزادے کے خطوط پڑھ کر پھولے نہیں سماتے کہ ان کے خاندان میں بھی پچاس سال بعد ایک صاحب قلم پیدا ہوا ہے۔ سرکاری ملازموں کو سیاست میں دخل دینے کی آزادی صرف طارق عبداللہ تک ہی محدود نہیں۔ شیخ صاحب کے ایک اور چہیتے افسر صدرالدین مجاہد صاحب کو بھی خصوصی طور پر یہ آزادی دی گئی ہے اور مجاہد صاحب ہر اعتبار سے سرکاری ملازم ہونے کے باوجود ہر سیاسی مسئلے اور معاملے میں ٹانگ اڑاتے رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے مجاہد صاحب نے اپنے آپ کو کسی فریڈم فائٹرس آرگنائزیشن کا صدر منتخب کروایا ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ فریڈم فائٹری کی یہ زرہ بکتر پہن کر وہ ہر سطح کی سیاست گری کے لیے آزاد ہیں۔ مقامی سیاست میں مجاہد صاحب جس بے رحمی اور بے دردی کے ساتھ مجاہدین آزادی کا استعمال اور استحصال کرتے آئے ہیں۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور حق یہ ہے کہ ان سے جہاں تک ممکن ہو سکا ہے، انہوں نے مجاہدین آزادی کا کفن بیچ کر اپنی سیاسی دوکان اور سرکاری تنخواہ چالو رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔ لیکن وہ ملکی سیاست میں بھی مجاہدین آزادی کے نام اور کام کے دام وصول کرنے میں پیش پیش

ہیں ۔ ایمر جنسی کے دوران شیخ صاحب کے اس کاغذی مجاہد نے ایمر جنسی، مسز گاندھی اور سنجے گاندھی کی مدح میں زمین و آسمان کے قلابے ملا کر مجاہدین آزادی کا نام بدنام کیا۔ پھر مارچ ۷۷ء میں مسز گاندھی کی انتخابی مہم میں ان کی حمایت کے لیے مجاہدین آزادی کا ایک طوفانی دستہ بھیجنے کی پیش کش کی۔ لیکن جب مسز گاندھی ہار گئیں اور مرکز میں جنتا حکومت قائم ہو گئی تو مجاہد صاحب اپنے مجاہدین آزادی کو لے کر کچھ عرصہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر رفتہ رفتہ مرارجی ڈیسائی اور مرکزی سرکار کی قصیدہ خوانی شروع ہو گئی جو ابھی تک جاری ہے۔ اب حال ہی میں صدر الدین مجاہد نے مجاہدین آزادی آرگنائزیشن کے صدر کی حیثیت سے مسز گاندھی کو چک مگلور میں ان کی کامیابی پر مبارک بادی کا تار دیا ہے۔

یہ سب کچھ سیاست نہیں تو اور کیا ہے، اور کیا صدر الدین مجاہد فریڈم فائٹرس ایسوسی ایشن کا صدر ہونے کی حیثیت سے ہر سرکاری قانون، ضابطے یا پابندی سے بالا ہیں؟ مجاہد صاحب کی یہ سیاسی سرگرمیاں چونکہ شیخ صاحب کو راس آتی ہیں اس لیے وہ ان سے باز پرس کرنے کی بجائے ان کی حوصلہ افزائی کریں گے۔ چاہے ایسا کرتے ہوئے سرکاری ڈسپلن اور نظم ونسق کی دھجیاں فضائے آسمانی میں کیوں بکھر نہ جائیں لیکن صدر الدین مجاہد کی خانہ ساز آرگنائزیشن سے وابستہ مجاہدین آزادی کو سوچنا چاہیے کہ مجاہد صاحب ان کے ایثار اور اپنی صدارت کو بیچ کر کب تک ان کو رسوا کرتے رہیں گے۔ وہ جس طور اور جس طریقے پر مجاہدین آزادی کی تجارت کر رہے ہیں اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے مجاہدین آزادی بھک منگے ہیں کہ جو ہر بڑی ڈیوڑھی پر سلام بجالا کر اپنی روزی روٹی کا بندوبست کر رہے ہیں۔ مجاہدین آزادی کا یہ تصور

بھیانک بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔

رفیق صادق کا خط

''آئینہ'' کی ایک حالیہ اشاعت میں عالم خاک کی ڈاک کے عنوان تلے خواجہ غلام محمد صادق مرحوم کے نام ان کے ایک مداح کا خط شائع ہوا تھا۔ جس میں مصنف نے لطیف پیرایے میں ان کے صاحبزادے رفیق صادق کی سیاست پر ایک ہلکا سا طنز کیا تھا۔ رفیق صاحب نے اپنے اس ذکرِ خیر پر برہم ہو کر شمیم صاحب کے نام ایک بڑا زوردار خط لکھا ہے جو ہم املا و انشاء اور زبان کی تمام غلطیوں کے ساتھ من وعن شایع کر رہے ہیں۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ خط مزاحیہ ہے، طنزیہ ہے یا تنقیدی، امید ہے کہ قارئین اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے میں ہمیں مدد دیں گے۔ خط کا متن یہ ہے۔

پیارے شمیم

تسلیم

فطرتاً بشر ہوں اور ہر بشر کی طرح دل رکھتا ہوں۔ ویسے بھی کوئی شخص اپنے والدین کو نہیں بھول سکتا۔ لیکن آپ کی طفلگی اور بے ظرفی نے مجھے میرے والد محترم کی یاد عید سے دو روز قبل دِلا کر بہت جذبات میں الجھا دیا۔ جس کے نتیجے میں آپ کی توقعات کے خلاف ایک دو روز قبل ہی مرحوم والد محترم مجھے خواب میں ملے، ان کی زبانی کہ آپ نے اُن سے مجھ سے پہلے ہی خواب میں ملاقات کی ہے، سُن کر میرے حیرت کی حد نہ رہی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آپ انتہائی موقعہ پرستی کا ثبوت دے کر خواب دیکھنے میں بھی پہل کریں گے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے اپنے والد محترم کو اپنے سیاسی شعور اور

سیاسی دوراندیشی پر بالکل مطمئن پایا۔لیکن جہاں تک آپ کا تعلق ہے ان کو آپ کی پینترے بازی، مصلحت پسندی اور آپ کی طِفلانا سیاسی اچھل کود پر توقعات کے مطابق حیران دیکھا انہوں نے آپ کو اندرا جی کا ساتھ دینے کے لیے کہا تھا لیکن آپ کو یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی کہ اگر اندرا جی اور شیخ صاحب کا آپس میں ساتھ نہ ہوتا۔تو میں اندار گاندھی کیا سنجے گاندھی، بنسی لال ، وی سی شکلا اور گنڈ دراوٗ کے صف اول کے سپاہی میں ہوتا۔ میں نے اپنے والدمحترم سے خواب میں وعدہ کیا ہے کہ میں مستقبل میں شمیم صاحب کو موقعہ پرستی ، مصلحت پسندی اور طِفلانا سیاسی اچھل کود سے باز رکھوں گا ۔ مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ ایسی حرکتوں سے باز رہیں گے تا کہ میں اپنے والد محترم کو خواب میں دیئے ہوئے وعدے کو پورا کر سکوں۔

شکریہ

آپ کا

رفیق صادق

۱۱ر نومبر ۱۹۷۸ء

۱۵ر نومبر ۱۹۷۸ء

☆☆☆

اقتدار کا نشہ

سنٹرل بیورو آف انوسٹی گیشن نے شری لیش پال کپور، ممبر پارلیمنٹ، مسز گاندھی کے پرائیوٹ سیکریٹری مسٹر آر، کے دھون اور ان کے والد محترم اور برادرِ اصغر کو گرفتار کر کے ملک بھر میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے کو جو صرف چھ ماہ قبل سیاسی طاقت اور اقتدار کے سب سے بڑے مظہر سمجھے جاتے تھے اور جن کے نام سے زمین بھی کانپتی تھی۔ لیکن زمانے کی ایک معمولی سی گردش نے انہیں اقتدار و اختیار کی بلندیوں سے اٹھا کر ذلّت اور رسوائی کی گہرائیوں میں پھینک دیا ہے۔ ان کے خلاف عائد شدہ الزامات صحیح ہیں یا غلط، یہ فیصلہ تو وقت ہی کرے گا لیکن ان کے عبرت ناک انجام سے ان تمام لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے کہ جو اقتدار کو ہمیشہ رہنے والی چیز سمجھ کر اس کے زعم میں بڑی بڑی حماقتیں کر جاتے ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اقتدار کے مرکزوں سے ان کی قربت ان کے ہر جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے کافی ہے، جو آخری وقت تک اس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس پر کسی کی نگاہ نہیں پڑتی۔ مسز اندرا گاندھی کے انجام کا آغاز اس وقت ہوا تھا کہ جب اس نے اندر کمار گجرال اور پی، این ہکسر جیسے ذہین، قابل اور باصلاحیت لوگوں کو نظر انداز کر کے لیش پال کپور اور مسٹر دھون جیسے خوشامدی اور تنگ نظر لوگوں کو اپنے گرد جمع کرنا شروع کر دیا۔ ایسے کم تر لوگوں کی خوبی یا خاصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ جس

کے گرد حلقہ ڈالتے ہیں اُسے وہی کچھ دیکھنے اور سننے پر مجبور کرتے ہیں کہ جو اس کے کانوں اور آنکھوں کو اچھا لگے۔ مسز گاندھی کے المیے کا تجزیہ کیا جائے تو ان کے زوال کی تہہ میں بہت سے یش پال کپور اور دھون تیرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ مسز گاندھی نے ان کم سواد اور حقیر افراد کے لیے صرف اپنا ہی نہیں، اس ملک کا مستقبل بھی خطرے میں ڈال دیا۔ ان لوگوں کے خلاف جو سنگین الزامات عاید کیے گئے ہیں اگر یہ صحیح ثابت ہوئے تو مسز گاندھی کا خود قانون کی زنجیروں سے بچنا محال ہے۔ یہی نہیں انڈین نیشنل کانگریس کے مستقبل پر بھی ان واقعات کا سایہ پڑنا ناگزیر ہے اور اس بات کا اندیشہ ہے کہ مسز گاندھی کی سلطنت کو ڈبُونے والے یش پال اور دھون اپنے داغ دار ماضی کے بوجھ سے انڈین نیشنل کانگریس کو بھی غرق کر دیں گے۔ مجھے امید ہے کہ اپنی ریاست کے یش پال اور دھون بھی ان واقعات سے سبق حاصل کر کے محتاط رہنے کی کوشش کریں گے۔

☆☆☆

جولائی ۱۹۷۷ء

قصّہ فارسٹ لاج کا

اس میں کوئی شک نہیں کہ ریاستی جنتا پارٹی کو الاٹمنٹ کی معیاد ختم ہونے کے بعد فارسٹ لاج پر قابض رہنے کا کوئی قانونی اور اخلاقی حق حاصل نہیں تھا اور اس میں بھی دورائیں ممکن نہیں کہ قانونی اعتبار سے ریاستی حکومت نے جنتا پارٹی کے یتیموں کو فارسٹ لاج سے زبردستی بیدخل کر کے اپنے جائیز حقوق کا استعمال کیا ہے۔ مجھے اس بات سے بھی انکار نہیں کہ ریاستی حکومت نے یہ عمارت خالی کرانے کے لیے ضابطے کے وہ سبھی لوازمات پورے کیے ہیں جن کو پورا کیا جانا ضروری تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا زندگی کا کاروبار صرف قوانین اور ضابطوں کے سہارے چلتا ہے یا چل سکتا ہے۔ افراد کی طرح حکومتیں بھی ذاتی تعلقات میں ایک رکھ رکھاؤ، ایک تکلف اور ایک قرینے کا اہتمام کرتی ہیں اور بعض اوقات، قانون، آئین اور ضابطوں کے باوجود بعض اشخاص یا اداروں کے تئیں ایسا برتاؤ کرتی ہیں کہ جس کا بظاہر کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ مثال کے طور مرکزی حکومت نے نئی دہلی میں شیخ صاحب کو ایک نہایت ہی حقیر کرایہ پر کوٹلہ لین میں ایک کوٹھی الاٹ کی ہے۔ اس کوٹھی کے ساتھ تقریباً دس کنال زمین ہے اور عام حالات میں اُس کا کرایہ دو ہزار روپے ماہانہ سے کم نہ ہوگا لیکن شیخ صاحب غالباً اس کا کرایہ تین سو روپے ماہوار ادا کرتے ہیں، شیخ صاحب پچھلے تین سال سے ایک بار بھی اس کوٹھی میں

نہیں رہے ہیں اور نہ ان کے آئندہ یہاں رہنے کا کوئی امکان ہے لیکن اس کے باوجود بھی کسی شخص کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ دہلی میں مکانات کی سخت قلت کے پیش نظر شیخ صاحب سے یہ استدعا کرے کہ وہ یہ مکان خالی کر دیں، ایسا نہ ہوا ہے اور نہ ہوگا اور نہ ہونا چاہیے۔ حکومتوں کے لیے بعض افراد یا جماعتوں کو یہ رعایت دنیا کوئی نئی بات نہیں۔

ابھی دو ماہ قبل کی بات ہے کہ جب شیخ صاحب اس درجہ بیمار ہو گئے کہ بیگم شیخ محمد عبداللہ کا سری نگر پہنچنا بہت ضروری بن گیا، بدقسمتی سے بیگم صاحبہ ان دنوں بھدرواہ کے ایک دور افتادہ علاقے میں نیشنل کانفرنس کی انتخابی مہم میں مصروف تھیں لیکن ریاستی حکومت نے فوراً ایک ہیلی کاپٹر کا انتظام کر کے بیگم صاحبہ کو سرینگر پہنچایا۔ اس مرحلے پر بیگم صاحبہ کے لیے ہیلی کاپٹر کا انتظام کرنا نہ حکومت کے فرائض میں شامل تھا اور نہ قانون میں اس کے لیے کوئی دفعہ مخصوص تھی۔ حکومت نے شیخ صاحب کے منصب اور ان کے مرتبے کے پیش نظر یہ انتظام اور اہتمام کرنا ضروری سمجھا اور میری دانست میں ایسا ہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ فارسٹ لاج پر جنتا پارٹی کا کوئی قانونی استحقاق نہیں تھا، لیکن اگر شیخ صاحب یہ امر مدنظر رکھتے ہوئے کہ پارٹی کا یہ دفتر پارٹی کنوینر مولانا مسعودی کی رہائش گاہ بھی ہے، فارسٹ لاج سے جنتا پارٹی کو بیدخل کرنے میں اتنی عجلت نہ کرتے تو ان کی عزت اور شہرت میں اضافہ ہوتا، انھوں نے فارسٹ لاج کو خالی کرا کر کوئی بہت بڑا کام انجام نہیں دیا ہے، اپنے آپ کو ایک بہت چھوٹے کارنامے سے منسوب کیا ہے۔

☆☆☆

۲۰ ستمبر ۱۹۷۷ء

عدل نوشیروانی

نہ معلوم نئے دور کے کس سقراط نے ریاستی حکومت کے بقراطوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ ریاستی اسمبلی کے حالیہ انتخابات میں سرکاری ملازموں کی جانبداری کا جائزہ لینے کے لیے ایک عدد کمیشن کے تقرر کا اعلان کر دے اور ریاستی حکومت نے اس کارِ نیک میں کسی قسم کی تاخیر کیے بغیر انور احمد آفتاب کو بطور کمیشن کے نامزد کر دیا۔ آفتاب صاحب کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ تین ماہ کے اندر اندر اپنی رپورٹ پیش کر دے تاکہ حکومت جانبدار سرکاری افسروں کے خلاف مناسب کاروائی کر سکے ۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ آفتاب صاحب حقیقت کی تہہ تک پہونچنے کے لیے کونسا طریق کار اختیار کریں گے ۔ کیونکہ انتخابی مہم کے دوران سرکاری افسروں کی سرگرمیوں کا نہ کہیں کوئی باقاعدہ ریکارڈ ہے اور نہ اس بات کا کوئی امکان ہے کہ سرکاری ملازم خود اپنے خلاف شہادت ثبوت فراہم کریں۔ ان حالات میں مجرم سرکاری افسروں کو تختۂ دار پر لٹکانے کی صرف ایک صورت نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ جانب داری کے مجرم ہر سرکاری افسر کے خلاف تین یا اس سے زائد نیشنل کانفرنسیوں کا بیان قلم بند کر کے اسے اپنی صفائی پیش کرنے کو کہا جائے ۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی صفائی میں ان الزامات سے یا تو انکار کرے گا یا نئے حکمرانوں کے خوف سے اقبال جرم پر مجبور ہو جائے گا۔ اس طرح شیخ صاحب کی حکومت عدلِ نوشیرواں کی ایک نئی مثال قائم کرے گی۔

ہم کمیشن کے قیام کے اصل مقصد سے بخوبی واقف ہیں اور ہمیں معلوم

ہے کہ ریاستی حکومت اسمبلی میں اتنی بھاری اکثریت حاصل کرنے کے باوجود سرکاری ملازموں سے اس درجہ بدظن کیوں ہے، لیکن ہمیں حیرت اس بات پر ہے کہ موجودہ حکومت کے رہنما اتنے کھُردرے اور کھوکھلے طریقے پر اپنی رسوائی کا سامان کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ کیا انہیں اس بات کا علم نہیں کہ حالیہ انتخابات کے دوران اکثر سرکاری ملازمین نے کھلم کھلا نیشنل کانفرنس کا ساتھ دیا اور کیا انہیں اس بات کا اندازہ نہیں کہ انور احمد آفتاب صاحب کے لیے ایسے افسروں کے خلاف شہادت حاصل کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر دور حاضر کے نوشیرواں عادل سرکاری افسروں کے خلاف جانبداری کے الزامات کی تحقیقات پر منحصر ہیں تو اس کا مقصد کچھ چھوٹے چھوٹے ملازموں کو ہراساں کر کے بڑے بڑے افسروں کو مرعوب کرنا ہے۔

اس کمیشن کے قیام سے شیخ صاحب کی حکومت نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اقتدار کے زعم اور اپنی اکثریت کے بل بوتے پر وہ کسی حقیر سے حقیر اور چھوٹے سے چھوٹے مخالف کو بھی معاف کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ سکول ماسٹروں، پٹواریوں، کلرکوں اور چپراسیوں کو تو خوف زدہ کریں گے، لیکن ان میں بڑے بڑے افسروں کو ناراض کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمیشن بنیادی طور ایسے چھوٹے چھوٹے افسروں کے خلاف تحقیقات کرے گا کہ جن کی بساط سیاست پر کوئی بساط ہی نہیں۔ میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کمیشن کسی سرکاری افسر پر نیشنل کانفرنس کے حق میں جانبداری کا الزام ثابت نہیں کر سکے گا اور اگر حسن اتفاق سے کسی خوش قسمت پر یہ الزام ثابت ہو بھی جائے تو اس کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہوگا۔ ☆☆☆

۱۷ اگست ۱۹۷۷ء

غریب پاکستان پر الزام

پاکستان موت اور زندگی کی کش مکش میں مبتلا ہے۔اس کا سیاسی ڈھانچہ درہم برہم ہو چکا ہے اور پاکستانی عوام کی مایوسی، ان کی محرومیاں اور ان کے ٹوٹے ہوئے خواب ایک دل گداز اور رُوح فرسا منظر پیش کر رہے ہیں۔ وہاں کے جمہوری ادارے فوجی حاکموں نے اپنے پاؤں تلے روند دیے ہیں اور ملک ایک ایسے اقتصادی بحران سے گزر رہا ہے کہ اگر صورتِ حال میں جلد ہی کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا نہ ہو جائے تو پاکستان ایک ملک کی حیثیت سے ختم ہو جائے گا۔اس وقت وہاں جمہوری عمل کے بحال ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا اور کوئی شخص آسانی کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ چند ماہ کے دوران وہاں کیا ہوگا۔ لیکن ہماری ریاست کے محبوب رہنما اور وزیر اعظم بابائے قوم جناب شیر کشمیر فرماتے ہیں کہ کشمیر کی سرحدوں کو پاکستان کی طرف سے خطرہ لاحق ہے، اس لیے یہاں ایسے قوانین کا ہونا ضروری ہے کہ جو پاکستانی تخریب کاروں کا قلع قمع کرنے کے لیے استعمال کیے جائیں۔انہوں نے پبلک سیفٹی ایکٹ کا جواز پیش کرتے ہوئے اخبار نویسوں کو بتایا کہ” پاکستان کے موجودہ حالات بہت خطرناک ہیں اور یہ معلوم نہیں کہ وہاں کیا ہو، ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ کر بیٹھیں۔اس لیے ہمیں خبر دار رہنا چاہیے۔محترم شیخ صاحب کو کشمیری عوام کو کالے قوانین کا یہ تحفہ عنایت کرنے کے لیے کوئی معقول

بہانہ تراشنا چاہیے تھا کیوں کہ پاکستان کے موجودہ حالات کے پیش نظر یہ بات کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ پاکستان کشمیر میں کسی قسم کی شرارت یا شرانگیزی کرسکتا ہے، خاص طور پر اپنے گذشتہ تجربات نے انہیں کچھ زیادہ ہی محتاط بنا دیا ہے اور ایک مدت سے وہ عملاً کشمیر سے دستبردار ہو گئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حالیہ انتخابات میں کشمیری عوام سے اس وعدے پر ووٹ لیے گئے تھے کہ برسر اقتدار آتے ہی راولپنڈی کا راستہ کھول دیا جائے گا لیکن صرف چار ماہ کے بعد لوگوں کو راولپنڈی کے خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے ریاستی عوام کی زبان بندی، نظر بندی اور گوشمالی کے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ میری ناچیز رائے میں شیخ صاحب نے اپنے سنگین جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے غریب پاکستان پر یہ الزام عاید کیا ہے کہ وہ کشمیر میں گڑبڑ پیدا کرسکتا ہے۔

☆☆☆

۹ رنومبر ۱۹۷۷ء

کوآپریٹو انتخابات

کوآپریٹو اداروں کے انتخابات کے سلسلے میں نئی حکومت نے جو روش اختیار کی ہے اس سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ نیشنل کانفرنس کی قیادت اور حکومت اسمبلی کے حالیہ انتخابات میں اپنی غیر معمولی کامیابی کے بعد بھی بے اعتمادی اور بدحواسی کا شکار ہے۔ ریاست کی تیس سالہ تاریخ گواہ ہے کہ نیشنل کانفرنس کی موجودہ قیادت اس وقت بھی آزادانہ اور غیر جانبدرانہ انتخابات کروانے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھی کہ جب سیاسی اور تنظیمی اعتبار سے اس کا پلہ بھاری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۱ء میں آئین ساز اسمبلی کے انتخابات میں ۷۵ کے ۷۵ ممبر بلا مقابلہ کامیاب ہو گئے۔ بلا مقابلہ کامیابی کے اس سلسلے کو بعد میں بخشی صاحب اور صادق صاحب نے سیاسی فلسفے اور حکمت عملی کے طور پر استعمال کیا اور اس طرح ریاست میں انتخابات کے عمل کا سارا وقار اور اعتبار خاک میں مل گیا۔ تیس سال بعد جنتا پارٹی کی حکومت نے انتخابی عمل کے تقدس اور اعتبار کو بحال کر کے ریاست میں آزادانہ اور غیر جانبدارنہ انتخابات منعقد کرائے اور ریاستی عوام کے دل میں بجا طور پر یہ امید پیدا ہوگئی کہ جمہوریت اور آزادنہ انتخاب کے جس نظام کو جبر و تشدد اور زور زبر دستی سے آلودہ کر دیا گیا ہے وہ ان تمام آلائشوں سے پاک ہو کر ریاست کی سیاسی زندگی میں ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ بحال ہوگا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ امید پوری نہیں ہوگی اور افسوس اس بات کا ہے کہ انتخابی عمل کے تقدس اور اس کے اعتبار کو مجروح کرنے کا کام وہ ہاتھ انجام دے

رہے ہیں کہ جن سے یہ توقع تھی کہ وہ پرانے زخموں پر مرہم رکھ کر ہمیں جمہوریت، آزادی اور انصاف کے آداب سکھائیں گے۔

کوآپریٹو اداروں کے انتخابات سے نہ اس ریاست کا سیاسی مستقبل وابستہ ہے اور نہ اس کی اندرونی خودمختاری، اس لیے اگر یہ انتخابات ایمان داری اور غیر جانبداری سے کرائے جاتے تو یقیناً نیشنل کانفرنسی حکومت کی شہرت اور اس کے وقار میں اضافہ ہو جاتا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئی حکومت کو اپنی شہرت اور وقار سے زیادہ اس بات کا خیال ہے کہ اس جماعت کے کتنے کارکنوں کے لیے روزگار اور کاروبار کے وسائل مہیا ہوتے ہیں۔ کابینہ میں ۲۴ وزیروں کی بھرتی بھی اسی منصوبے کا حصہ ہے اور ان کے لیے تعلقات عامہ کے افسر مقرر کرنے میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے، اب قصبوں اور دیہاتوں میں کاروبار مہیا کرنے کا موقع ہاتھ آیا ہے تو اسے ہاتھ سے کیوں جانے دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ نیشنل کانفرنس کے اکثر کارکنوں کو قواعد وضوابط کی پروا کیے بغیر کوآپریٹو اداروں پر مسلط کرنے کی کاروائی کی جارہی ہے اور مفصلات سے موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق رجسٹرار کوآپریٹو نے رٹیرننگ افسروں کو واضح طور پر بے ایمانی کی ہدایات دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جن قواعد کی رو سے بقایا داروں میں تین سالہ پرانے عہدہ داروں کو انتخابات کے نا اہل قرار دیا گیا ہے وہ نیشنل کانفرنس کے بلا مقابلہ امیدوار بن کر آج ہر کوآپریٹو سوسائٹی پر چھا جانے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو حکومت کوآپریٹو اداروں کے انتخابات بھی ایمان داری سے نہیں کر سکتی اس سے سیاسی اور سماجی زندگی کے کس شعبے میں ایمان داری کی توقع کی جا سکتی ہے؟

☆☆☆

۳۱ ر جولائی ۱۹۷۷ء

عبرتناک.........سبق آموز

ہندوستان میں مسز اندرا گاندھی، پاکستان میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور سری لنکا میں مسز بندرانائیکے کے انجام سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ رائے عامہ کو نظر انداز کر کے اقتدار کو اپنے ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرنے کا نسخہ بالآخران لوگوں کے لیے زہر قاتل ثابت ہو جاتا ہے کہ جو اسے آبِ حیات سمجھ کر پیتے ہیں۔ مسز گاندھی، مسٹر بھٹو اور بندرانائیکے تینوں ایک جمہوری نظام کی پیداوار تھے اور تینوں جمہوری طریقے سے برسر اقتدار آ کر اپنے اپنے ملک کے سربراہ بن گئے۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ تینوں نے برسر اقتدار آ کر اقتدار پر مستقل طور پر قابض رہنے کے لیے اس نظام کو ہی تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی کہ جس کے ذریعے اور سہارے وہ اپنے اپنے ملکوں کی تقدیر کے مالک بن گئے تھے۔ مسز گاندھی اور مسز بندرانائیکے کے سٹائل اور طریق کار میں اتنی گہری مماثلت تھی کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ ان میں کون دوسرے کے نقش وقدم پر چل رہا ہے۔ اب مسز بندرانائیکے کے انجام سے یہ مماثلت کچھ اور زیادہ گہری ہوگئی ہے اور یہ بات حتمی طور پر ثابت ہوگئی ہے کہ بیسویں صدی کی اس آخری چوتھائی میں زور وزبردستی اور غنڈہ گردی کے ذریعے عوام کو زیادہ دیر تک دبائے رکھنا ممکن نہیں۔ مسٹر بھٹو نے بھی پچھلے چھ سال کے دوران اپنے سیاسی مخالفوں کے ساتھ جس قسم کا برتاؤ کیا، وہ یقیناً جمہوری اقدار اور

روایات کے سراسر منافی تھا۔ اس پر طرہ کہ انہوں نے انتخابات کے مقدس عمل کو بھی اس درجہ بدنام اور بے اعتبار کر دیا کہ پاکستان میں جمہوریت کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ افسوناک بھی ہے اور سبق آموز بھی۔

ہندوستان، پاکستان اور سری لنکا میں حالیہ انقلابات سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ اقتدار رہنے والی شے نہیں ہے۔ یہ ایک قومی امانت ہے اور جو شخص اس میں خیانت کا گنہگار ہو وہ کچھ دنوں کے لیے بچ سکتا ہے ہمیشہ کے لیے نہیں اور بالآخر اسے عوامی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو کر اپنے عمل کا حساب دینا پڑتا ہے۔ جو لوگ اقتدار کو اپنی ذاتی وجاہت، اپنے خاندانی مفادات یا اپنے عزیز و اقارب کی خاطر مدارات کے لیے استعمال کرتے ہیں یا اقتدار کو دائمی سمجھ کر رائے عامہ سے بے نیاز ہو جاتے ہیں ان کا انجام وہی ہوتا ہے کہ جو مسز گاندھی، مسز بندرانائیکے اور مسٹر بھٹو کا ہوا ہے۔ ریاست کی موجودہ حکومت کے سربراہوں اور اہل کاروں کو بھی تاریخ سے یہ سبق ازبر کر لینا چاہیے کہ اقتدار ان کے پاس ایک قومی امانت ہے اور اسے انتقام گیری اور زبردستی کے لیے استعمال کرنے کا انجام بہت بُرا ہوگا۔ کالے قوانین کا سہارا لے کر اپنے سیاسی مخالفوں کو کچلنے اور دبانے کا حربہ عارضی طور پر بہت مؤثر نظر آتا ہے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ یہ حربہ استعمال کرنے والے بالآخر خود ہی اس حربے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

۱۲ر جون ۱۹۷۷ء

کے،ایم،ڈی کا جُرم!

نیشنل کانفرنس کی حکومت نے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد میسا MISA کا استعمال کر کے اپنے سیاسی مخالفین کو نظر بند کرنے کی جو طرح ڈال دی ہے وہ اس لحاظ سے پریشان کُن ہے کہ موجودہ حکومت کی سربراہی شیخ محمد عبداللہ کر رہے ہیں۔ اور انہوں نے پچھلے ۴۶ سال کے دوران ہمیں آزادی، خودی اور عزتِ نفس کا درس دیا ہے۔ انہوں نے ایک بار نہیں سو بار ہمیں تلقین کی ہے کہ ہمیں نتائج کی پرواہ کیے بغیر اپنے ضمیر اور اپنے دل کی بات کہنا چاہیے۔ یہ دور کی بات نہیں بلکہ حالیہ انتخابی مہم کے دوران انہوں نے بار بار اہلِ کشمیر کے لیے عزت و آبرو کا مقام حاصل کرنے کی آرزو کا اظہار کیا۔ اس پسِ منظر میں برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف میسا جیسے کالے قانون کا استعمال نا قابل فہم بھی ہے اور قابلِ افسوس بھی۔ تعجب یہ ہے کہ قانون کا یہ بے جا استعمال کشمیر موٹر ڈرائیورس ایسوسی ایشن کے ان چند ارکان کے خلاف کیا گیا ہے کہ جنہوں نے ریاستی اسمبلی کے انتخابات سے پہلے اور اس کے دوران شیخ صاحب اور ان کی جماعت کے خلاف انتخابی مہم میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ آزادی خودداری اور عزت نفس کی یہ کون سی تعریف ہے کہ جس کی رو سے کسی لیڈر یا جماعت کی مخالفت یا مزاحمت ایک ایسا جرم قرار دیا گیا کہ اس کے لیے میسا جیسے قانون کا سہارا لیا جائے، اور ظاہراطور پر موٹر ڈرائیورس ایسوسی ایشن کے

اہل کاروں اور عہدہ داروں نے اس کے علاوہ کوئی اور جرم نہیں کیا ہے کہ انہوں نے شیخ صاحب اور نیشنل کانفرنس کی مخالفت کی ہے۔ وزیراعلیٰ جناب شیخ محمد عبداللہ کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں کہ وہ جو کچھ کریں گے دوسروں کے لیے روایت اور ہدایت بن جائے گا۔ میسا کا یہ بے دردانہ اور منتقمانہ استعمال کم تر لوگوں کے لیے ایک ایسی روایت اور نظیر بن سکتا ہے کہ اس کے خلاف بلند ہونے والی ہر آواز بے اثر اور غیر متعلق ہو کر رہ جائے گی۔ اس اخبار کے قارئین کو یاد ہوگا کہ انتخابات کے دوران جب گورنر کی ایڈمنسٹریشن نے امن قائم کرنے کے بہانے میسا کا استعمال کیا تھا تو میں نے اس کے خلاف بھی سخت احتجاج کیا تھا۔ آج اس احتجاج میں کچھ زیادہ شدت اور حدت اس لیے ہے کہ اس کا استعمال نامزد گورنر نے نہیں، منتخب لیڈر شیخ محمد عبداللہ نے کیا ہے اور اُس وقت کیا ہے کہ جب انہیں انتخابی جنگ میں زبردست فتح حاصل ہوئی ہے۔ چند ڈرائیوروں کو نظر بند رکھنے سے ریاست کی سیاسی صورت حال یا اس کے سیاسی استحکام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، لیکن ان کی مسلسل نظر بندی سے شیخ محمد عبداللہ کی حکومت اور اُن کی جماعت کے وقار کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہے اور مجھے حیرت ہے کہ موجودہ حکومت کے سقراط اور بقراط عدالت عالیہ کے فیصلے کا انتظار کیے بغیر کشمیر موٹر ڈرائیورس ایسوسی ایشن کے عہدہ داروں کو رہا کیوں نہیں کرتے۔ میسا کا استعمال منافع خوروں، چور بازاریوں اور سماج دشمن عناظر کے خلاف سمجھ میں آ سکتا ہے لیکن سیاسی مخالفوں کے خلاف اس کے استعمال کا کوئی اخلاقی جواز نہیں

☆☆☆

جون ۱۹۷۷ء

پوائنٹ آف آرڈر......معافی کیوں؟

چراغ بیگ کے قلم سے

نیشنل کانفرنس کے صدرِ محترم شیخ محمد عبداللہ نے جمعہ کے دن آثار شریف حضرت بل میں تقریر کرتے ہوئے اپنے حامیوں اور اپنے مخالفوں، دونوں سے مخاطب ہو کر کچھ دلچسپ، اہم اور مفید باتیں کہیں۔ انہوں نے اپنی جماعت کے کارکنوں کو تلقین کی، کہ وہ اپنی فتح پر مغرور نہ ہوں اور اپنے دل سے انتقام گیری کا جذبہ نکال دیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ انہیں اپنے مخالفوں کو معاف کر دینا چاہیے اور ان کے ساتھ نرمی سے پیش آنا چاہیے۔ اپنے مخالفوں سے مخاطب ہو کر شیخ صاحب نے کہا کہ انہیں اپنی ناکامی سے مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ اپنی ناکامی کی وجوہات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ اپنے حامیوں اور مخالفوں کو شیخ صاحب نے جو نصیحت کی ہے وہ بظاہر بہت ہی نیک، بے ضرر اور مخلصانہ ہے اور اس پر کسی شخص کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن اپنے عقیدتمندوں کو صبر و ضبط کی تلقین کرتے ہوئے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ انہیں اپنے مخالفوں کو معاف کر دینا چاہیے تو ''چراغ بیگ'' ایک ''پوائنٹ آف آرڈر'' اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

معافی کا لفظ کسی جرم، خطا یا سہو کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہ اس شخص سے مانگی جاتی ہے کہ جس کے ساتھ دانستہ یا نادانستہ طور پر کوئی زیادتی ہوئی

ہو۔ حالیہ انتخابی معرکہ آرائی ایک سیاسی جنگ اور کشمکش کی توسیع تھی اور اس میں جن لوگوں نے شیخ صاحب یا ان کی جماعت نیشنل کانفرنس کی مخالفت کی یا مقابلہ کیا، انہوں نے کوئی ایسا سیاسی یا اخلاقی جرم نہیں کیا ہے کہ اس کے لیے شیخ صاحب یا ان کے ساتھی، اپنی اخلاقی برتری اور وسعت قلبی کا ثبوت دیکر انہیں معاف کردیں۔ معافی کے اس لفظ سے اُس فاتحانہ غرور کی جھلک نمایاں ہوتی ہے کہ جس سے بچنے کے لیے شیخ صاحب نے اپنے عقیدتمندوں کو تلقین کی ہے۔ اس ایک لفظ سے اس آمرانہ ذہنیت اور سیاسی تنگ نظری کی نشان دہی ہوتی ہے کہ جو نیشنل کانفرنسی قیادت کا طرۂ امتیاز ہے۔ شیخ صاحب کے خیال میں ان کا ہر مخالف، وطن دشمن، غدار اور زرخرید ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ کوئی سیاسی مکالمہ ممکن نہیں ہوتا۔ اپنے مخالفوں کے تئیں شیخ صاحب کے اس ذہنی رویے نے نیشنل کانفرنس کے ہر رہنما اور کارکن کو اتنا تنگ نظر بنایا ہے کہ وہ شیخ صاحب کے ہر مخالف کو کافر اور قاتل سمجھتا ہے، یہ اس ذہنیت اور سوچ کا نتیجہ ہے کہ ایک انتخابی معرکے کو مذہبی جنگ کا رتبہ دے کر اسلام اور قرآن کا بے تماشا استعمال کیا گیا اور اب فاتحانہ شان کے ساتھ اپنے مخالفوں کو معاف کردینے کی تلقین کی جاتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کس کو کون معاف کرے گا؟ انتخابی جنگ میں ہارنا اور جیتنا، جمہوری آداب اور روایات کا ایک حصہ ہے۔ اور اس میں ہارنے اور جیتنے والے ایک دوسرے کو معاف نہیں کرتے، ایک دوسرے کی فتح اور شکست کو تسلیم کرتے ہیں۔ معافی کا تصور تو فوجی جرنیلوں اور جنگی قیدیوں کے ساتھ وابستہ ہے اور سیاسی معرکہ آرائی میں اس کا استعمال غلط ہی نہیں شرانگیز بھی ہے، اور اس سے مسز گاندھی اور مسز بندرانائیکے کی زنانہ آمریت کی بو آتی ہے۔

چراغ بیگ کی رائے میں حالیہ انتخابی معرکے میں جن لوگوں نے شیخ صاحب اور ان کی جماعت نیشنل کانفرنس کا مقابلہ کیا انہوں نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا ہے بلکہ ایک اہم تاریخی فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ وہ بہادر لوگ ہیں کہ جنہوں نے قرآن، اسلام، رائے شماری اور پاکستان کے نام پر کیے جانے والے گمراہ کن پروپاگنڈا کا مردانہ وار مقابلہ کر کے فرقہ واریت اور آمریت کو بے نقاب کر دیا، یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے صرف وادی کشمیر میں پونے پانچ لاکھ سے زاید ووٹ حاصل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ شیخ محمد عبداللہ اور ان کی جماعت اس ریاست کی نمائندگی کے واحد ٹھیکے دار نہیں ہیں۔ یہ لوگ نہ معافی کے خواستگار ہیں اور کسی کرم کے طلبگار۔ انہوں نے اپنے جمہوری حق کا استعمال کر کے جمہوری اقدار کی سربلندی کا فرض انجام دیا ہے۔ اس جنگ میں ان کی شکست، ان فاتحوں سے زیادہ عظیم اور مقدس ہے کہ جنہوں نے اسمبلی کی چند نشستوں کے لیے قرآن اور اسلام جیسے مقدس سرمائے کا استعمال کیا۔ معافی کے مستحق نیشنل کانفرنس کے وہ رہنما اور کارکن ہیں کہ جنہوں نے اسمبلی کے انتخابات کو رائے شماری کا نام دے کر اپنی کامیابی کو یقینی بنایا اور ہم بڑے خلوص اور انکسار کے ساتھ اُنہیں معاف کرتے ہیں۔

مخاطب کس سے!

نائب وزیر اعلیٰ مرزا محمد افضل بیگ سے اس خاکسار کا خاندانی تعلق تو کمترین کے نام سے ہی ظاہر ہے لیکن ذہنی طور بھی چراغ بیگ اپنے آپ کو نیشنل کانفرنس کے دوسرے لیڈروں کے مقابلے میں بیگ صاحب سے زیادہ قربت محسوس کرتا ہے۔ بیگ صاحب میں بہت سی خامیاں، کمزوریاں اور

کوتاہیاں ہیں، لیکن وہ بنیادی طور پر ذہین، معاملہ فہم اور موقعہ شناس آدمی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ ہنسنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، اور جس شخص کے پاس Sense of humour ہو میں اس کی ہر خطا معاف اور اس کی ہر کمزوری نظر انداز کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بیگ صاحب سے اپنے اس ذاتی اور ذہنی تعلق کے بعد میں اپنا ''پوائنٹ آف آرڈر'' اٹھانا چاہتا ہوں۔

آثارِ شریف حضرت بل میں گذشتہ جمعہ کو ایک بہت بڑے اجتماع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے مرزا محمد افضل بیگ نے دفعہ ۳۷۰ کی وضاحت کی اور کہا کہ اس دفعہ کے ہوتے ہوئے مرکزی پارلیمنٹ کا بنایا ہوا کوئی قانون ریاست پر براہ راست لاگو نہیں ہوتا اور اس طرح ریاستی اسمبلی اور حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ پارلیمنٹ کا پاس کردہ کوئی قانون ریاست پر لاگو کرے اور کسی قانون کے اطلاق کو روکے۔ بیگ صاحب نے کہا کہ یہی خصوصی حیثیت ہماری اندرونی خودمختاری کی ضمانت ہے۔ بیگ صاحب اتنی ہی بات کہتے تو چراغ بیگ کو ''پوائنٹ آف آرڈر'' اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن اپنی تقریر کی ترنگ میں نائب وزیر اعلیٰ کچھ اور بھی کہہ گئے اور خاکسار کے لیے پوائنٹ آف آرڈر اٹھانا ناگزیر ہو گیا۔

بیگ صاحب نے فرمایا کہ کچھ لوگ اس دفعہ کو کمزور کر کے پٹھانکوٹ کا فلڈ گیٹ کھولنا چاہتے ہیں، میں پوچھتا ہوں کہ وہ پٹھانکوٹ کا فلڈ گیٹ کیوں کھولنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان میں ایسے سرمایہ دار بھی موجود ہیں کہ جو ڈیڑھ کروڑ روپے تک سالانہ انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ کشمیر آکر سارے کشمیر پر قابض ہو سکتے ہیں۔

چراغ بیگ اس مرحلے پر مرزا محمد افضل بیگ سے یہ پوچھنا چاہتا ہے کہ

ان کا تخاطب کس کی طرف ہے اور وہ کون لوگ ہیں کہ جو پٹھانکوٹ کا فلڈ گیٹ کھولنا چاہتے ہیں؟ جہاں تک جنتا پارٹی، جماعت اسلامی، کانگریس، عوامی ایکشن کمیٹی اور ریاستی کمونسٹ پارٹی کا تعلق ہے، دفعہ ۳۷۰ کا تحفظ ان سب کے سیاسی منشور اور پروگرام کا حصہ ہے اور حالیہ انتخابات سے قبل، اس کے دوران اور آج بھی وہ اس خصوصی حیثیت کو برقرار رکھنے کے مسئلے پر متفق ہیں۔ مرکزی حکومت کے سرکردہ وزیروں اور سربرآوردہ رہنماؤں نے بار بار اس کی صراحت کی ہے کہ دفعہ ۳۷۰ کو برقرار رکھا جائے۔ اس کے برعکس نیشنل کانفرنس کی حکومت اور قیادت نے پچھلے دو برس کے دوران ایسے کارنامے انجام دینے کی کوشش کی کہ ان کی کامیابی سے دفعہ ۳۷۰ کا حلیہ ہی نہیں بگڑتا، اس کا وجود بے معنی ہو کر رہ جاتا۔ ایک آئین کی ۴۲ ویں ترمیم کی توثیق کہ جس سے دفعہ ۳۷۰ کے تمام آئینی تحفظات ختم ہو جاتے، دویم لینڈ گرانٹس بل کا پیش ہونا، کہ جس سے واقعی پٹھان کوٹ کے فلڈ گیٹ کھل جانے کا زبردست امکان پیدا ہو گیا تھا۔ لینڈ گرانٹس بل کا منشا ہی یہی تھا کہ ڈیڑھ کروڑ روپیہ انکم ٹیکس ادا کرنے والے بمبئی، دہلی اور کلکتہ کے سرمایہ دار بھاری تعداد میں کشمیر آ کر سرمایہ لگائیں اور یہاں نوے نوے سال تک زمین Lease پر لے کر بنگلے اور کارخانے بنائیں۔ اس مسودہ قانون کے خلاف عوامی احتجاج کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے بیگ صاحب نے حالیہ انتخابی مہم کے دوران سجدۂ سہو کیا تھا اور کہا تھا کہ اسمبلی ختم ہو جانے کے ساتھ ہی یہ بل بھی ختم ہو گیا۔ الغرض دفعہ ۳۷۰ کو کمزور کرنے کی دونوں کوششوں کی ذمہ داری نیشنل کانفرنس کے قائدین پر عاید ہوتی ہے اور اس کے بعد بھی مرزا بیگ صاحب درگاہ شریف حضرت بل کے مقدس پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر بڑی معصومیت سے

دریافت کرتے ہیں کہ کچھ لوگ اس دفعہ کو کمزور کر کے پٹھانکوٹ کا فلڈ گیٹ کیوں کھولنا چاہتے ہیں۔ میرا پوائنٹ آف آرڈر یہ ہے کہ بیگ صاحب اسمبلی میں غلط بیانی کرنا چاہیں تو شوق سے کریں، وہ نیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کریں، تو مجھے اعتراض نہیں، لیکن انہیں درگاہ شریف حضرت بل میں غلط بیانی سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اس مرحلے پر مجھے اس چور کا واقعہ یاد آرہا ہے، کہ جو کسی گھر میں چوری کر رہا تھا، وہ اپنے کام سے فارغ ہو ہی رہا تھا کہ مالک مکان کی آنکھ کھل گئی اور اس نے چور، چور کا شور مچا کر سارے محلے کو جگا دیا، جب بہت سے لوگ چور کو پکڑنے کے لیے جمع ہو گئے تو ہشیار چور بھی چور چور کہتا ہوا ہجوم میں گھس گیا، سنا ہے کہ چور بھی دس آدمیوں کو ایک ساتھ دیکھ کر چور، چور کا شور شروع کر دیتا ہے۔

☆☆☆

جولائی ۱۹۷۷ء

گفتار اور کردار!

وزیر اعلیٰ جناب شیخ محمد عبداللہ نے جمعہ کے روز آثار شریف حضرتبل میں اپنی جماعت کے کارکنوں سے مخاطب ہو کر جو باتیں کہی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ انہیں اس کالم میں دُہرایا جائے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ وہ انتخابات میں اپنی بے مثال کامیابی سے مغرور نہ ہوں۔ انہیں آنحضورؐ کے نقش وقدم پر چلنا چاہیے جنہوں نے فتح کے وقت اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی ایک مربّی کا سلوک کیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ انہیں اپنے حریفوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہیے۔ شیخ صاحب کے یہ ارشادات، شرافت اور اخلاق کے اس بلند تصور کے آئینہ دار ہیں کہ جو آج کے زمانے میں سیاست دانوں میں تو کیا، مذہبی بزرگوں کے ہاں بھی مفقود ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بل کے تقدس آمیز روحانی ماحول میں شیخ صاحب واقعی سیاست کی کثافتوں سے بلند ہو کر انسانیت اور اخلاق کی اُن بلندیوں کو چھو رہے ہیں کہ جن کو چھونا سیاست دانوں کے مقدر میں نہیں بلکہ خدا کے ان نیک بندوں کے مقسوم ہیں کہ جو اس مقصد اور منزل کے لیے منتخب کیے گئے ہوں۔

شیخ صاحب کے ان ارشادات عالیہ کے باوجود اگر نیشنل کانفرنسی آج بھی نفرت، عداوت اور انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں تو اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ وہ اپنے رہنما سے سچی محبت نہیں کرتے، اور جو کچھ وہ کہتا ہے اس پر کان نہیں دھرتے، دوئم یہ کہ شیخ صاحب کی بات میں وہ تاثیر نہیں کہ

جوان کے عقیدت مندوں کے دلوں میں نفرت اور عداوت کی آگ بجھا کر انہیں انسانیت اور اخلاق کی ٹھنڈک پہنچا سکے۔ میری دانست میں شیخ صاحب کی نصیحتوں اور ان کے فرمودات کی بے اثری کا ایک اور بھی سبب ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ شیخ صاحب نے دوسروں سے مخاطب ہو کر کہا ہے وہ خود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ انہوں نے دوسروں کو عفو، رحم اور شفقت کا درس تو دیا ہے لیکن خود انہوں نے وزارت اعظمی کا چارج سنبھالنے کے صرف چند گھنٹوں بعد ہی انتقام گیری اور ذاتی عداوت کا ایک ایسا مظاہرہ کیا کہ جو نہ صرف یہ کہ انہیں زیب نہیں دیتا بلکہ جس کی وجہ سے اُن کے اخلاقی درس کی اہمیت اور افادیت مشکوک ہوگئی ہے، میرا روئے سخن کشمیر موٹر ڈرائیورس کے بعض اہلکاروں کے خلاف کی گئی اس کاروائی سے ہے کہ جس کے تحت غلام نبی اور اس کے دوسرے ساتھیوں پر میسا لاگو کر کے انہیں ہیرانگر کی جلتی ہوئی زمین اور سلگتے ہوئے آسمان کے سپرد کر دیا گیا۔ غلام نبی ڈرائیور اور اس کے ساتھیوں کا جرم صرف یہ ہے کہ انہوں نے کھلے بندوں شیخ صاحب اور ان کی جماعت کی مخالفت کر کے اپنے جمہوری حقوق کا استعمال کیا، لیکن شیخ صاحب کی نگاہوں میں یہ جرم اتنا شدید اور سنگین نوعیت کا ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اپنے اقتدار کو اپنے ان ہی حریفوں کے خلاف استعمال کیا۔ اس پس منظر میں اگر شیخ صاحب کا اخلاقی درس اور ان کے ارشادات عالیہ کا عامتہ الناس پر کوئی اثر نہیں ہوتا، تو اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ انسان اپنے گفتار سے نہیں اپنے کردار سے پہچانا جاتا ہے۔

☆☆☆

۲۴ر جولائی ۱۹۷۷ء

آج ۹ راگست ہے

آج ۹ راگست ہے۔ ٹھیک چوبیس سال پہلے مرکزی حکومت کی ایماء اور لیڈروں کی اعانت سے کشمیر کے سب سے مقتدر، سب سے محبوب اور سب سے بلند قامت رہنما شیخ محمد عبداللہ کو ایک غیر جمہوری اور فسطائی طریقے سے وزارت اعظمیٰ سے معزول کر کے پابند سلاسل کر دیا گیا، اور اس کے ساتھ ہی ریاست میں ظلم وتشدد، غنڈہ گردی اور وحشت و بربریت کے ایک ایسے دور کا آغاز ہوا کہ جس کی یاد پچھلے چوبیس برسوں کی طویل مدت کے بعد بھی ہمارے دلوں سے محو نہیں ہوئی ہے۔ ظلم، ناانصافی اور آمریت کے خلاف عوام کی یہ جدوجہد پورے بائیس برس تک جاری رہی، اور ریاست کے ہزاروں مردوں، عورتوں اور نوجوانوں نے اپنی زندگی کے بہترین سال اس ظلم کا خاتمہ کرنے میں صرف کیے۔ ریاست سے باہر بھی جمہور پسند اور انسان دوست ہماری اس جدوجہد اور جنگ میں برابر کے شریک رہے اور اس طرح شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کا دُکھ سارے ہندوستان کا درد بن گیا۔ پھر ایک دن اس ظلم کا خاتمہ ہوا اور کل کا قیدی آج کا حکمران بن گیا۔

آج بھی ۹ راگست کا دن ہے اور آج ۲۴ سال بعد یہاں ایک بار پھر ظلم اور تشدد، لاقانونیت، اور بربریت کا دور دورہ ہے۔ دکانیں لوٹی جا رہی ہیں، فصلیں برباد کی جا رہی ہیں، مکانوں پر پتھراؤ کیا جا رہا ہے، بلا وجہ لوگوں کو

جوان کے عقیدت مندوں کے دلوں میں نفرت اور عداوت کی آگ بجھا کر انہیں انسانیت اوراخلاق کی ٹھنڈک پہنچا سکے۔میری دانست میں شیخ صاحب کی نصیحتوں اوران کے فرمودات کی بے اثری کا ایک اور بھی سبب ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ شیخ صاحب نے دوسروں سے مخاطب ہو کر کہا ہے وہ خود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔انہوں نے دوسروں کو عفو، رحم اور شفقت کا درس تو دیا ہے لیکن خود انہوں نے وزارت اعظمی کا چارج سنبھالنے کے صرف چند گھنٹوں بعد ہی انتقام گیری اور ذاتی عداوت کا ایک ایسا مظاہرہ کیا کہ جو نہ صرف یہ کہ انہیں زیب نہیں دیتا بلکہ جس کی وجہ سے اُن کے اخلاقی درس کی اہمیت اور افادیت مشکوک ہوگئی ہے، میرا روئے سخن کشمیر موٹر ڈرائیورس کے بعض اہلکاروں کے خلاف کی گئی اس کاروائی سے ہے کہ جس کے تحت غلام نبی اور اس کے دوسرے ساتھیوں پر میسا لاگو کر کے انہیں ہیرانگر کی جلتی ہوئی زمین اور سلگتے ہوئے آسمان کے سپرد کر دیا گیا۔غلام نبی ڈرائیور اوراس کے ساتھیوں کا جرم صرف یہ ہے کہ انہوں نے کھلے بندوں شیخ صاحب اور ان کی جماعت کی مخالفت کر کے اپنے جمہوری حقوق کا استعمال کیا،لیکن شیخ صاحب کی نگاہوں میں یہ جرم اتنا شدید اور سنگین نوعیت کا ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اپنے اقتدار کو اپنے ان ہی حریفوں کے خلاف استعمال کیا۔اس پس منظر میں اگر شیخ صاحب کا اخلاقی درس اوران کے ارشادات عالیہ کا عامتہ الناس پر کوئی اثر نہیں ہوتا،تو اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔انسان اپنے گفتار سے نہیں اپنے کردار سے پہچانا جاتا ہے۔

☆☆☆

۲۴ر جولائی ۱۹۷۷ء

آج ۹ راگست ہے

آج ۹ راگست ہے۔ٹھیک چوبیس سال پہلے مرکزی حکومت کی ایماءاور لیڈروں کی اعانت سے کشمیر کے سب سے مقتدر، سب سے محبوب اور سب سے بلند قامت رہنما شیخ محمد عبداللہ کو ایک غیر جمہوری اور فسطائی طریقے سے وزارت اعظمیٰ سے معزول کر کے پابند سلاسل کر دیا گیا، اور اس کے ساتھ ہی ریاست میں ظلم وتشدد، غنڈہ گردی اور وحشت و بربریت کے ایک ایسے دور کا آغاز ہوا کہ جس کی یاد پچھلے چوبیس برسوں کی طویل مدت کے بعد بھی ہمارے دلوں سے محو نہیں ہوئی ہے۔ظلم، ناانصافی اور آمریت کے خلاف عوام کی یہ جدوجہد پورے بائیس برس تک جاری رہی، اور ریاست کے ہزاروں مردوں، عورتوں اور نوجوانوں نے اپنی زندگی کے بہترین سال اس ظلم کا خاتمہ کرنے میں صرف کیے۔ ریاست سے باہر بھی جمہور پسند اور انسان دوست ہماری اس جدوجہد اور جنگ میں برابر کے شریک رہے اور اس طرح شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کا دُکھ سارے ہندوستان کا درد بن گیا۔ پھر ایک دن اس ظلم کا خاتمہ ہوا اور کل کا قیدی آج کا حکمران بن گیا۔

آج بھی ۹ راگست کا دن ہے اور آج ۲۴ سال بعد یہاں ایک بار پھر ظلم اور تشدد، لاقانونیت، اور بربریت کا دور دورہ ہے۔ دکانیں لوٹی جا رہی ہیں، فصلیں برباد کی جا رہی ہیں، مکانوں پر پتھراؤ کیا جا رہا ہے، بلا وجہ لوگوں کو

گرفتار کیا جا رہا ہے۔ میسا جیسے کالے قوانین کا بے تحاشا استعمال ہو رہا ہے۔ شریف اور بے زبان، لوگوں کو گالیاں دی جا رہی ہیں۔

سرکاری ملازم عتاب کا شکار ہیں۔ سیاسی مخالفین کا جینا دوبھر کر دیا گیا ہے اور قانون کے محافظ لاقانونیت کی حمایت کر رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ ۲۴ سال بعد تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کل کے مظلوم آج کے ظالم ہیں اور جن کی خاطر ایک ۹ راگست کو اس قوم نے ظلم جبر اور تشدد کا ہر وار برداشت کیا تھا، ۲۴ سال بعد اسی ۹ راگست کو وہی لوگ اس قوم کا سینہ ایک بار پھر چھلنی کر رہے ہیں۔ ظلم اور ناانصافی کی تاریخ میں ایسے ظلم اور ایسی ناانصافی کی کم ہی مثالیں ملیں گی، اور اسی لیے ۹ راگست کا دن ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔ آج ۹ راگست ہے، ۲۴ سال پہلے بھی ۹ راگست ہی کی تاریخ تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اندھیرا کچھ زیادہ بڑھ گیا ہے، اس لیے آج کے دن کو یوم سیاہ کے طور پر منایا جانا چاہیے۔

☆☆☆

۹ راگست ۱۹۷۷ء

مکتوبات، ش احمد

محترم شیخ صاحب!

آپ کو یہ غم کہ مرزا افضل بیگ نے داماد کی خاطر پارٹی کے مفادات سے غداری کی ہے۔ آپ کو یہ شکایت کہ بیگ صاحب کو جو کچھ دے سکتے تھے دیا، لیکن ان کی بھوک بڑھتی گئی، آپ کو یہ شکوہ کہ اسمبلی کے سپیکر ملک غلام محی الدین نے پارٹی کے ممبروں کو گمراہ کیوں کیا، لیکن مجھے یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ اب دوستی کا اعتبار کون کرے گا، وفاداری کا نام کون لے گا؟ اور آپ کی بات کا یقین کس کو آئے گا؟ کہتے ہیں کہ جو شیر انسانی خون کی لذت سے ایک بار آشنا ہو جائے اسے پھر انسانی خون کے سوا کوئی دوسرا خون پسند ہی نہیں آتا۔ آپ نے ایک ایک کر کے اپنے محسنوں، دوستوں اور ساتھیوں کا خون پی لیا ہے، اور بیگ صاحب اس سلسلے کی آخری کڑی تھے، اب کس کی باری ہے؟ بزرگ کہتے ہیں کہ جب محسن کش کو محسن کشی کے لیے محسن نہیں ملتے تو پھر وہ خودکشی پر اتر آتا ہے۔ لیکن مجھے بزرگوں کی اس بات کا اعتبار نہیں، دراصل مجھے بزرگوں کی کسی بات کا بھی اعتبار نہیں۔

آپ کا مخلص

ش، احمد

مادرِ مہربان

آپ کے سرتاج نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ''آپ ایک اچھی ماں اور ایک اچھی بیوی ہیں''، لیکن آپ سیاست دان بننے کی کوشش کر رہی ہیں ۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا سیاست دان بننا اتنا ضروری ہے کہ آپ سب کچھ چھوڑ کر سیاست دان بننے میں مصروف نظر آتی ہیں ۔ ابھی شیخ صاحب نے اپنے ۴۵ سالہ رفیق مرزا افضل بیگ کو اپنی مصلحتوں اور سیاست گری کی پھانسی پر لٹکا ہی دیا تھا کہ آپ نے گرلز سکولوں میں بیگ صاحب کے خلاف تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیا ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ مادرِ مہربان کے خطاب کے باوجود آپ اتنی نامہربان اور سرد مہر کیوں بن گئی ہیں کہ ہر وقت اپنے سرتاج کے ہر ظلم، ان کی ہر ناانصافی اور زیادتی کی وکالت پر آمادہ رہتی ہیں؟ کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ آپ کی مداخلت اور مدافعت کے بغیر آپ کے سرتاج کی سیاسی دکان دیوالیہ ہو جائے گی؟ لوگ آپ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ اپنی ممتا، پرہیز گاری اور اپنے تقدس کے سرمایے کو سیاست گری کی بجائے سیاست کی صحت مند اور پاکیزہ قدروں کے استحکام کے لیے استعمال کریں گی ۔ لیکن آپ تو شیخ صاحب کے ہر جھوٹے مقدمے میں گواہ سلطانی بن کر مادرِ مہربان کے لقب کے ساتھ زیادتی کر رہی ہیں ۔ خدا کے لیے گرلز سکولوں کو سیاست کا اکھاڑہ نہ بنائیے ۔ آپ کو بیگ صاحب یا اپنے سرتاج کے دوسرے مخالفوں کے خلاف تقریریں کرنے کا شوق ہے تو پارلیمنٹ میں جا کر یہ شوق پورا کیجیے ۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ ان جھگڑوں اور مخمصوں سے دور ہی رہیے ۔ آپ جیسی نیک خاتون کو سیاست کی غلاظت سے اپنا دامن ملوث نہ کرنا چاہیے اور ویسے بھی یہ

ضروری نہیں کہ آپ کے خاندان کا ہر فرد بشر سیاسی اکھاڑے میں اتر کر پہلوانی کے کرتب دکھائے۔

آپ کا صادق..................ش، احمد

فاروق عبداللہ کے نام

ڈیر فاروق

نیشنل کانفرنس اور حکومت کے تازہ بحران میں آپ نے جس سنجیدگی تمکنت اور وقار کا ثبوت دیا ہے، اس سے میرے دل میں آپ کی قدر بڑھ گئی ہے اور آپ کی ذات کے متعلق بہت سے تعصّبات بھی دور ہو گئے ہیں۔ میں آپ کے حسن اخلاق کا پہلے بھی قائل تھا۔ اب آپ کی سوجھ بوجھ اور عاقبت اندیشی پر بھی ایمان لایا ہوں، میری طرف سے اس دانش مندانہ اور دور اندیشانہ طرز عمل پر مبارک باد قبول کیجیے۔ آپ کے والدِ محترم اگر واقعی اقتدار کا چراغ اپنے ہی خاندان میں محفوظ رکھنے پر تلے ہوئے ہیں تو ہم ان سے درخواست کریں گے کہ اسے نیم وحشیوں اور چنگیزوں کے سپرد کرنے کی بجائے آپ کے ہاتھ میں دیں۔ اپنی امی سے کہہ دیجیے کہ وہ سیاست کی بجائے اپنا وقت زیادہ سوشل ویلفیر کے کام میں صرف کیا کریں۔ برادرم نذیر کو میرا اسلام کہہ دیجیے، سنا ہے کہ وہ معصوم بھی تازہ ترین حادثے پر خون کے آنسو رو رہا ہے۔

فقط آپ کا

ش، احمد

مرزا افضل بیگ کے نام

محترم بیگ صاحب! .... کہیے مزاج کیسے ہیں؟

آ گیا نا وفاداری کا ٹیس (Taste) ۴۵ سال تک دوسروں کو وفاداری کا سبق پڑھانے کے بعد آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ان سب لوگوں کے لیے باعث عبرت ہے کہ جو اپنی سیاست کی بنیاد، عقائد، نظریات اور کسی سیاسی فلسفے کی بجائے ایک ذات سے وفاداری کی کچی اینٹوں پر تعمیر کرتے ہیں۔ اب آپ ہی سوچیے کہ آپ کے انجام پر بخشی غلام محمد، غلام محمد صادق، درگا پرشاد در، سید میر قاسم اور مولانا مسعودی، کس درجہ خوش اور شادمان ہوں گے۔ یہ لوگ خوش قسمت تھے کہ صرف آٹھ آٹھ دس دس سال کے بعد ان کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ شیر کے پنجرے سے آزاد ہو گئے۔ آپ نے تو اپنی زندگی کے ۴۵ سال شیر کو دوست سمجھنے میں برباد کیے اور شیر نے بالآخر وہی کیا، کہ جو شیر کی فطرت ہوتی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ آپ نے اپنی ساری زندگی اس مقصد میں صرف کی کہ آپ کے بغیر کوئی دوسرا شخص شیر کے قریب نہ آئے اور جب ۴۵ برس کے آپ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تو شیر نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر آپ کا بریک فاسٹ بنایا۔ وکیل، قانون دان اور سیاسی لیڈر ہونے کے باوجود آپ کی سمجھ میں اتنی سی بات بھی نہیں آئی کہ جس طرح انسان اپنی فطرت نہیں بدل سکتا، اسی طرح شیر بھی اپنی فطرت اور خصلت بدلنے سے معذور ہے۔ محمد رمضان کو میرا سلام کہہ دیجیے۔

آپ کا مخلص

ش، احمد

ٹھاکر دیوی داس کے نام!

پیارے ٹھاکر

بیگ صاحب کے عبرت ناک انجام کے بعد تو آپ ٹیلی فون پر بھی مجھ سے بات کرنے میں ڈر محسوس کرنے لگے ہیں۔اسی لیے یہ خط لکھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔سُنا ہے کہ بیگ صاحب کے اخراج کے بعد آپ شیخ صاحب کے کچھ زیادہ ہی قریب ہو گئے ہیں۔اس کے لیے میری مبارک باد قبول کیجیے کہ آپ کی آخری حسرت بھی پوری ہو گئی۔لیکن اس بات کا بھی خیال رکھیے کہ شیر کشمیر اپنے ساتھیوں کی آخری حسرت پوری کرنے کے بعد انہیں عزت و آبرو کا وہ مقام عطا کرتے ہیں کہ وہ ساری زندگی اپنے زخموں کی مرہم پٹی میں گذار دیتے ہیں۔بہر کیف یہ خط آپ کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے نہیں، سابقہ واقعات پر اپنی رائے ظاہر کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں، یہ عجیب بات ہے کہ عظمت کی چوٹیوں تک پہنچنے میں انسان کی سانس پھول جاتی ہے، لیکن ذلت کی گہرائیوں کی طرف لڑھکنے کا اسے احساس بھی نہیں ہو جاتا۔ آپ زندگی بھر وکیل رہے ، ہائی کورٹ جج بنے اور اس طرح قانون اور انصاف کے میدان میں نام پیدا کیا۔لیکن سنا ہے کہ اب آپ نے جھوٹی گواہیاں دے دے کر اربابِ اقتدار سے وفاداری کا سرٹفکیٹ حاصل کرنے کا کاروبار شروع کیا ہے۔کہئیے کیسا چل رہا ہے کاروبار؟

فقط آپ کا اپنا یار

ش،احمد

موہن کشن تکو کے نام!

محترم تکو صاحب

مجھے شیخ صاحب کی زبانی یہ سن کر حیرت ہوئی کہ آپ نے حالیہ انقلاب اور سیاسی تغیرات سے پہلے ایک باران سے کسی مسئلے پر اختلاف کی بناء پر وزارت چھوڑنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ یقین نہیں آتا، لیکن شیخ صاحب کی بات کا یقین نہ کر کے اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ شیخ صاحب کی ہی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ اس اختلافی مسئلے کی بنیاد پر مرزا محمد افضل بیگ نے شیخ صاحب کے تئیں آپ کی وفاداری کو مشکوک بنانے کی سعی کرتے ہوئے آپ کی سیاسی عصمت پر حملہ کیا تھا۔ یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے نہ صرف اپنی عصمت بچائی بلکہ شیر کشمیر کو عصمت دری کی اس کوشش سے باخبر کر کے اپنے دوسرے ساتھیوں کی عزت و آبرو کو بھی بچالیا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ عدالتوں میں گواہی دینے والے گواہوں کو مدعی یا مستغیث کی جانب سے خرچہ گواہ دیا جاتا ہے۔ یہ بتایئے کہ بیگ صاحب کے خلاف گواہی دینے کے لیے آپ کو کتنا خرچہ دیا گیا؟

انکم ٹیکس والوں کو اس کا حساب دینا نہ بھولیئے۔

کیونکہ ان کم بختوں نے شیر کشمیر کو نہیں چھوڑا آپ کو کہاں چھوڑیں گے؟

فقط آپ کا مخلص

ش، احمد

☆☆☆

۱۵/اکتوبر ۱۹۷۸ء

سپیکر ملک محی الدین کے نام

محترم ملک صاحب

ہم نے سوچا تھا کہ سرزمین کشمیر پر آپ کے قدم رکھتے ہی ریاست کی سیاست میں ایک زلزلہ آجائے گا لیکن غالب کی زبان میں

دیکھنے ہم بھی گئے پر تماشہ نہ ہوا

آپ جب ہزاروں میل دور جمیکا نیویارک اور لندن میں تھے، تو بابائے قوم یہاں یہ دھمکیاں دے رہے تھے کہ سپیکر کو آنے دو، اسے آتے ہی ٹھیک کر دوں گا۔ دوسری طرف فخر کشمیر عوام کو یہ مژدہ جانفزا سنا رہے تھے کہ سپیکر کو آنے دو، ہم شیخ صاحب کو نئی بہار دکھائیں گے۔ آپ کی آمد کی اسی ''ایڈوانس پبلسٹی'' کے پیش نظر پورا شہر آپ کی آمد کا منتظر تھا، لیکن آپ کو ٹھیک کرنے والوں اور شیر کشمیر کو نئی بہار دکھانے والوں نے آپ کی آمد کے بعد سے ایسی چپ سادھ لی ہے کہ جیسے دونوں کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ بہرحال مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ نے سرینگر آنے کے بعد بڑی سنجیدگی، متانت اور بردباری کا ثبوت دے کر وہی کچھ کیا کہ جو آپ کے اونچے منصب کا تقاضا تھا۔ آپ نے ہوائی اڈے پر مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ ذات کی سطح سے بلند ہو کر اپنے منصب کے تقدس کی حفاظت کریں گے۔ مجھے خوشی ہے کہ تادمِ تحریر آپ اس وعدے کو نبھا رہے ہیں۔ لیکن آپ کا اصلی امتحان ابھی کچھ عرصہ بعد شروع ہونے والا ہے۔ اس لیے اپنے آپ کو اس فائنل کے لیے ابھی سے تیار کیجیے۔ حکمران طبقہ بہت مغرور اور ضرورت سے زیادہ خودغرض ہے اور آپ کی عدم موجودگی میں آپ پر بے تحاشا بہتان تراشیوں کے بعد آپ کے تعاون اور اشتراک کا

طلب گار ہوگا وہ سپیکر کے منصب کو بھی کسٹوڈین جائیداد متردکہ کی طرح اپنے نا پاک عزائم اور ذاتی انتقام گیری کا ذریعہ بنانا چاہے گا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ آپ صرف ماہانہ تنخواہ، ایک عدد موٹر اور دو عدد جمعداروں کی خاطر اپنی عزت آزادی اور اپنے منصب کی عظمت کا سودا نہیں کریں گے۔

فقط آپ کا صادق

ش، احمد

غلام محمد بھدرواہی

محترم بھدرواہی صاحب

اپنی دختر نیک اختر کی شادی خانہ آبادی پر میری دلی مبارک باد قبول کیجیے، مجھے افسوس ہے کہ میں اس مبارک تقریب پر حاضر ہو کر آپ کی مسرتوں میں شریک نہ ہو سکا۔ بہر حال، قبلۂ محترم شیر کشمیر، بیگم صاحبہ، فاروق صاحب اور خواجہ غلام محمد شاہ کی شرکت کو کشمیر کے چالیس لاکھ عوام کی شرکت سمجھ لیجیے، کیونکہ اپنی ایک حالیہ تقریر میں شیخ صاحب نے یہ اعلان کیا ہے کہ ان کا خاندان ریاست کے چالیس لاکھ لوگوں پر مشتمل ہے، یہ الگ سوال ہے کہ ہیلی کاپٹروں کی سواری پارلیمنٹ کی ممبری اور وزارتی عہدوں کی تقسیم کے وقت چالیس لاکھ عوام پر مشتمل اپنے خاندان میں سے ان کی نگاہ صرف ۱۰ ر مولانا آزاد روڈ کے مکینوں پر ہی پڑتی ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ خون پانی کی نسبت زیادہ گاڑھا ہوتا ہے۔ اپنی صاحبزادی کی شادی کے اس مبارک موقع پر بیک وقت شیخ صاحب، بیگم صاحبہ، ڈاکٹر فاروق اور آپ کے آج کل کے یار جانی خواجہ غلام محمد شاہ کی موجودگی کے لیے آپ کو ریاستی عوام کا شکر گذار ہونا چاہیے

کیونکہ یہ قافلہ لے کر جو ہیلی کاپٹر سری نگر سے بھدرواہ آیا اس پر خرچ ہونے والے ۸۶ ہزار روپے اس خزانہ عامرہ سے ادا کیے گئے ہیں کہ جسے اس ریاست کی بھوکی، ننگی جنتا اپنے پسینے سے پُر کرتی ہے۔

۸۶/ ہزار روپے کی یہ حقیر رقم ریاست کے چالیس لاکھ عوام کی طرف سے دولہا میاں کی خدمت میں ''گل میوٹھ'' سمجھ کر قبول کیجیے۔ آپ کتنے خوش بخت ہیں کہ ۲۲/ سال تک پاکستان سے نذرانے وصول کرنے کے بعد اب آپ کو پاکستان کے خلاف تقریریں کرنے کا ماہانہ معاوضہ ادا کیا جاتا ہے۔ عینی مشاہدین کا کہنا ہے کہ اپنی بیٹی کی شادی پر آپ کو مرزا محمد افضل بیگ بری طرح یاد آئے اور آپ شاہ صاحب کی نظریں بچا کر اپنے آنسو پونچھتے رہے۔

آپ کا مخلص

ش، احمد

طارق عبداللہ کی خدمت میں

ڈیر طارق

جب بہت دنوں سے آپ کے بارے میں کوئی خبر موصول نہیں ہوئی تو مجھے سخت پریشانی لاحق ہوئی کہ کہیں دشمنوں کی طبیعت ناساز تو نہیں۔ پھر ایک دن یہ خبر آ گئی کہ آپ نے کارپوریشن کے ملازموں کو عزت و آبرو کا مقام عطا کرنے سے فراغت پا کر اب محکمہ جنگلات کے فارسٹ گارڈوں اور ڈویژنل فارسٹ افسروں کی طرف اپنی توجہ مبذول کی ہے۔ یہ سن کر خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی، آپ نے اچھا کیا کہ اب کی بار جنگلات کے واچر کے کانوں کا پردہ ہی چاک کر دیا۔ کیونکہ عزت و آبرو کا مقام عطا کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ

ہے اور آپ کے والدِ محترم پچھلے چالیس پچاس سال سے اپنے مخصوص انداز میں یہی کچھ کرتے آئے ہیں۔ یہ سُن کر آپ کو شاید تعجب ہو کہ اس ریاست کی اکثر آبادی بہری ہے۔ کیونکہ ۴۵ سال تک آپ کے والدِ محترم کی تقریریں سُن سُن کر اکثر لوگوں کے کانوں کے پردے پھٹ چکے ہیں اور یہ لوگ اب صرف اشاروں اور کنایوں کی زبان سمجھتے ہیں۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات میں اسی بہری آبادی نے آپ کے والدِ محترم کے حق میں ووٹ دے کر آپ کو دوبارہ کارپوریشن کا مینیجنگ ڈائریکٹر بنا دیا ہے اس لیے آپ نے واچر کے کان کا پردہ چاک کر کے اپنے والدِ محترم کی روایات کو برقرار رکھا ہے۔

ڈی، ایف او طاہر قادری کو یہ شکایت ہے کہ آپ نے اسے ماں بہن کی گالیاں دیں، اس بے وقوف کو کون سمجھائے کہ مادرِ مہربان کے فرزندوں کو ہر کشمیری کی ماں بہن کو گالی دینے کا بنیادی حق حاصل ہے اور آپ نے صرف اپنے بنیادی حق کا استعمال کیا ہے۔ امید ہے کہ آپ لوگوں کے کانوں کے پردے پھاڑنے کی اپنی نئی مہم پوری شدت کے ساتھ جاری رکھیں گے۔ تاکہ اگلے انتخابات تک اس ریاست میں ایک کان کا پردہ بھی سلامت نہ رہے۔

اللہ کرے زورِ ظلم اور زیادہ

آپ کا چاہنے والا ....ش، احمد

ٹھاکر دیوی داس کے نام

پیارے ٹھاکر!

یہ سن کر خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی کہ آپ چرچ روڈ پر اپنا مکان چھوڑ کر

بیگ صاحب کی خالی کردہ کوٹھی میں منتقل ہو گئے ہیں ۔خوشی اس ۔لیے کہ بیگ صاحب کی جگہ لینے کی آپ کی بہت پرانی خواہش پوری ہوگئی اورافسوس اس لیے کہ نئی کوٹھی آپ کی وزارت اور مستقبل دونوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے ۔آپ سے میری دوستی اس درجہ مسلم اور بے لوث ہے کہ ریاست کی تاریخ میں سب سے گھٹیا وزارت کے ایک سرکردہ رکن ہونے کے باوجود میرے دل میں آپ کی محبت ،عزت اورعقیدت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے ۔اوراپنی اسی محبت سے مجبور ہوکر میں آپ کو یہ خط لکھنے پر مجبور ہوا ہوں ۔ آپ آنے کوتو بیگ صاحب کے مکان میں آ گئے لیکن میں آپ کوخبر دار کرتا ہوں کہ اس مکان کی دیواروں میں ٹرانسمیٹر لگے ہوئے ہیں ۔اس کے فرش کے نیچے جدید ترین الیکٹرانک Devices پوشیدہ ہیں ۔اس کے کچن میں بھی خفیہ ٹرانسمیٹر موجود ہیں اور کمروں کی چھتوں پر ،بجلی کے قمقموں میں ایسی ایسی خوفناک مشینیں چھپی ہوئی ہیں کہ جوآپ کی سانس بھی ریکارڈ کرسکتی ہیں ۔یہ ان ہی مشینوں کی کرامت ہے کہ بیگ صاحب کوحکومت اور جماعت دونوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔وہ اپنے مکان کی چاردیواری میں شیخ صاحب کے دشمنوں سے مل کر جوسازشیں کیا کرتے تھے،ان کے مخالفوں سے مل کران کے بارے میں جوسرگوشیاں کرتے تھےاوررات کوگہری نیند میں جوخطرناک خواب دیکھا کرتے تھے ،ان مشینوں کی مدد سے یہ ساری روداد شیخ صاحب کے پاس پہنچ جایا کرتی تھی اوراس بنیاد پر شیخ صاحب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کے پاس بیگ صاحب کے خلاف ناقابلِ تردید Unimpeachable شہادت موجود ہے ۔ان ہی مشینوں میں بیگ صاحب اور شمیم احمد شمیم کے درمیان وہ خفیہ بات چیت بھی ریکارڈ ہوئی تھی کہ جو بیگ صاحب کی تباہی اور شمیم صاحب کی

کامیابی کا باعث بن گئی۔ قصہ مختصر کہ جس مکان میں رہ رہے ہو، اس کی دیواروں کے بھی کان ہیں اور خطرہ اس بات کا ہے کہ جلد یا بدیر آپ کو بھی نا پسندیدہ خواب دیکھنے کے جرم میں سرکاری موٹر، ماہانہ تنخواہ اور جمعداروں کی خدمات سے محروم کر دیا جائے۔

فقط آپ کا سچا دوست

ش، احمد

محترمہ شمیمہ دیو کی خدمت میں

محترمہ

آپ کو قدرت نے وہ خوب صورت آواز دی ہے کہ اس کے جادو سے مُردوں میں بھی زندگی کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ کے نغموں کی گونج نے اس خوب صورت سرزمین کی فضاؤں میں وہ مہک پیدا کر دی ہے کہ آسمانی جنت کے مکینوں کو اس زمینی جنت کی خوش بختی پر رشک آتا ہوگا۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنے دیجیے کہ میں نے اتنی مترنم، سوز و گذار سے بھرپور آواز اپنی زندگی میں پہلی بار سنی ہے اور میں آپ کے وجود کو کشمیر کے تہذیبی سرمایے اور تمدنی میراث میں ایک قابل فخر اضافہ سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ آپ اپنی خداداد صلاحیت اور اپنے جوہر ذاتی کو سرکاری تقریبات کی رونق بڑھانے اور سرکاری مہمانوں کے اعزاز میں دی جانے والی دعوتوں پر پیش کیے جانے والے تفریحی پروگراموں کی دل چسپی بڑھانے میں صرف کرتی ہیں۔ سرکاری مہمانوں کے اعزاز میں دی جانے والی ہر دعوت میں آپ کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ ارباب

اقتدار آپ کی آواز، آپ کے ترنم اور آپ کی موسیقی کو سرکاری دعوتوں اور نجی محفلوں کی رونق بڑھانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور آپ ہیں کہ ہر مجلس، ہر محفل اور ہر تقریب پر ترنم ریز ہونے کے لیے آمادہ رہتی ہیں۔ میری دانست میں یہ آپ کے فن اور آپ کے مرتبے دونوں کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ آپ ایک عظیم فن کارہ کی بجائے درباری مغنیہ کا رول ادا کریں۔ یہ منصب کم از کم شمیم دیو کو زیب نہیں دیتا۔

مجھے اس گستاخی کے لیے معاف کیجیے کیونکہ میرا مقصد آپ کو اپنے منصب اور اپنی عظمت کا احساس دلانا ہے اور حاکمانِ وقت کو ان کی زیادتی کا۔

فقط

آپ کی آواز کا ایک پرستار

ش، احمد

☆☆☆

۲؍نومبر ۱۹۷۸ء

مسٹر صونم نر بو کی دیانت

لداخ کے صونم نر بو ایک بہت ہی سنجیدہ، شریف، کم گو اور دیانت دار آدمی ہیں اور فروری ۱۹۷۵ء میں شیخ صاحب نے انہی خصوصیات کی بناء پر انہیں اپنی کابینہ میں شامل کیا تھا۔ وزیر کی حیثیت سے نر بو صاحب کی کارکردگی پر کوئی تبصرہ کرنا میرے لیے ممکن نہیں لیکن ایک بات کی شہادت دیئے بغیر میں نہیں رہ سکتا کہ جب نیشنل کانفرنس اور کانگریس کے درمیان باہمی کشمکش اس حد تک بڑھ گئی کہ شیخ صاحب نے اپنی صفوں کو مستحکم بنانے کے لیے مسٹر نر بو اور ٹھاکر دیوی داس کو نیشنل کانفرنس میں شامل ہونے کے لیے کہا تو دونوں وزیروں نے شیخ صاحب کی یہ دعوت اور درخواست مسترد کر دی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پورے ملک میں مسز اندرا گاندھی کا طوطی بول رہا تھا اور مرکز میں کانگریس کی حکومت اس درجہ مضبوط اور مستحکم تھی کہ اسکے ٹوٹنے یا ختم ہونے کا کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ غالباً مسٹر نر بو اور ٹھاکر دیوی داس نیشنل کانفرنس میں شامل ہو کر مسز گاندھی کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات شیخ صاحب کے حق میں کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے بھی دونوں وزیروں کو نیشنل کانفرنس میں شامل ہونے کے لیے مجبور نہیں کیا۔ اور اس طرح یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا کہ جب تک کانگریس نے شیخ صاحب کی حکومت کو اپنے تعاون سے محروم کر کے مسٹر نر بو اور ٹھاکر دیوی داس کو بے کار نہیں بنایا۔ پارلیمنٹ کے انتخابات مسز گاندھی اور ان کی جماعت کی عبرتناک شکست کے بعد جب ریاستی اسمبلی کے انتخابات کے لیے مختلف جماعتوں نے لنگر لنگوٹے کس لیے تو لداخ کے صونم

نربو اور جموں کے ٹھاکر صاحب دونوں اس مرحلے پر بھی نیشنل کانفرنس میں شامل ہونے کے آمادہ نہیں تھے۔ ٹھاکر صاحب تو نیشنل کانفرنس میں شامل ہوئے بغیر ہی اس کی امداد واعانت کرتے رہے۔ لیکن صونم نربو صاحب نے اس ڈوبتی ہوئی ناؤ میں سوار ہونے کی بجائے کانگریس میں شامل ہوکر اس کی ٹکٹ پر لیہہ سے انتخاب لڑا۔ انتخابات کے نتائج ظاہر ہوئے تو مسٹر نربو کو اپنے اندازے کی غلطی کا احساس ہوا اور وہ یہ سمجھ گئے کہ جس ناؤ کو وہ ڈوبتی ہوئی ناؤ سمجھتے تھے وہ انہیں ساحل مراد تک پہنچانے والی ناؤ ہے۔ انہوں نے آؤ نہ دیکھا تاؤ! اور اپنی کامیابی کے اعلان کے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر انہوں نے کانگریس کو خیر باد کہہ کر نیشنل کانفرنس میں شمولیت کا اعلان کر دیا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ انہیں لیہہ کی کانگریس کمیٹی نے ہی نیشنل کانفرنس میں شامل ہوکر وزارتی منصب قبول کرنے کی تحریک اور ترغیب دی۔

مسٹر صونم نربو کا کانگریس کی ٹکٹ، پر انتخاب جیت کر صرف چند گھنٹوں کے اندر اندر صرف وزارتی عہدہ حاصل کرنے کے لیے کانگریس کو چھوڑ کر نیشنل کانفرنس میں شامل ہونا ایک ایسی سیاسی بد دیانتی ہے کہ جس کی نظیر پورے ملک میں نہیں ملتی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سنجیدگی، ان کی شرافت اور ان کی دیانت محض ایک تصنع اور ایک تکلف تھا وہ اگر نیشنل کانفرنس کی غیر معمولی کامیابی سے واقعی اس درجہ متاثر اور مرعوب ہو گئے تھے کہ انہیں کانگریس کی بجائے نیشنل کانفرنس ہی اپنی نجات دہندہ نظر آئی تو انہیں مستعفی ہوکر نیشنل کانفرنس کی ٹکٹ پر دوبارہ انتخاب لڑنا چاہیے تھا۔ ورنہ ان کی موقع پرستی اور ابن الوقتی کو ان کی سیاسی بد دیانتی کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔

۱۹ر جولائی ۱۹۷۷ء ☆☆☆

بے کار گریجویٹوں کا مسئلہ

وادی کے بے کار گریجویٹوں سے نہ معلوم کس سادہ دل اور سادہ لوح دوست (دشمن؟) نے یہ کہا کہ ان کی بیکاری کا علاج حکومت کے پاس ہے اور حکومت جان بوجھ کر ان کے مرض کا علاج نہیں کرتی۔ وہ مجھ سے پوچھتے تو میں ان سے کہتا، کہ میرے نوجوان دوستو! اس درد کا مداوا اس حکومت کے پاس تو کیا، کسی بھی حکومت کے پاس نہیں ہے۔ یہ اس بوڑھے، بدحال اور کھانستے ہوئے نظام کی پیداوار ہے، کہ جو بیکاری اور بیکاروں کو جنم دیتا ہے اور جب تک یہ بیمار نظام زندہ ہے، نہ بیکاری دور ہوگی اور نہ بیکاروں کا درد۔

مجھے افسوس ہے کہ بے کار گریجویٹوں اور پوسٹ گریجویٹ بے کاروں نے مفاہمت، مصالحت اور افہام و تفہیم کی بجائے حکومت کے ساتھ ٹکراؤ اور الجھاؤ کا راستہ اختیار کیا ہے اور حکومت نے بے کاروں کے زخموں پر مرہم رکھنے کی بجائے ان کے جسموں کو بھی زخمی کر دیا۔ میں جانتا ہوں کہ مسئلے کی نوعیت اتنی پیچیدہ اور اس کا حل اتنا مشکل ہے کہ حکومت چند مہینوں کیا، چار پانچ سال میں بھی کوئی تسلی بخش حل نکالنے میں کامیاب ہو جائے تو بڑی بات ہوگی۔ لیکن اربابِ حکومت کو بے کاروں کو اپنی مشکلات کا احساس دلا۔تے ہوئے ان کی مجبوریوں اور ان کے دکھ درد کو بھی تو سمجھنا چاہیئے اور میری دانست میں لاٹھیوں کی زبان سے آج تک کسی نے کوئی بات نہیں سمجھی ہے۔ بے کار

گریجویٹوں کواس بات کا خدشہ ہے کہ وہ Over Age ہوتے جارہے ہیں اوراگرانہیں فوراً سرکاری ملازمت نہ ملی، تو وہ ہمیشہ کے لیے بے کار ہوجائیں گے۔ان کے اس اندیشے کودور کرنے کی ضرورت ہےاوران کی بے چینی اور بے قراری کوسمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ بے کار گریجویٹوں اور پوسٹ گریجویٹ بے کاروں، دونوں کو یہ ذہن نشین کرنا چاہیے کہ حکومت کے پاس الہ دین کا چراغ نہیں ہے کہ جوراتوں رات ان کی بیکاری کودور کرسکے......اور حکومت کو یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ تعلیم یافتہ بے کاروں کوروزگار دینا...... اس کا آئینی نہ سہی اخلاقی فرض تو ہے۔ بیکار گریجویٹوں میں بڑھتی ہوئی بے چینی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ایسے نوجوانوں کوروزگار مہیا کیا جارہا ہے کہ جوگریجویٹ یاپوسٹ گریجویٹ توکیامشکل سے میٹرک پاس ہیں، ان حالات میں اگرکبھی کبھی ان کا پیمانۂ صبرلبریز بھی ہوجائے تو ان کی ہڈی پسلی توڑنے کی بجائے ان کے احتجاج پرکان دھرنا موجودہ حکومت کا فرض ہے کیونکہ ان میں سے بہت سے نوجوان اس فیڈریشن سے وابستہ ہیں کہ جس نے موجودہ حاکموں کوحکومت دلانے میں بڑی جدوجہد کی ہے۔

☆☆☆

۲۷رستمبر۷۷۱۹ء

اپنی ریت

ہمارے اس ملک کی ایک عجیب ریت یہ ہے کہ اگر ہم کسی کا احترام کرتے ہیں، کسی کے ساتھ ہماری عقیدت ہوتی ہے تو ہم اس کے اظہار میں مبالغہ کی تمام حدود کو پھاند کر مضحکہ خیز انداز اختیار کرتے ہیں۔ پھر جب ہم کسی کے ساتھ نفرت کرنے لگتے ہیں تو اس میں بھی حدود سے تجاوز ہوتا ہے اور اس حد تک کہ ہم خود ہی اپنی نظروں میں مضحکہ بن جاتے ہیں۔ گاندھی جی اس ملک کے سب سے زیادہ قابلِ احترام لیڈر ہیں۔ اُن کے متعلق جتنی کتابیں لکھی گئیں شاید ان کا شمار کرنا بھی آسان نہیں۔ اُدھر یہ ہوا اِدھر ہم اپنی ہر تحریر اور ہر تقریر میں گاندھی جی کے اصولوں اور اُن کی تعلیمات کا حوالہ دیتے رہے اور ساتھ ساتھ پورے التزام کے ساتھ ہر اُس ہدایت سے انحراف کرتے گئے، جو گاندھی جی دیتے آئے تھے۔ ہر اس صول سے روگردانی کرتے رہے، اُن کے بعد مقبولیت کا نمبر جواہر لال جی کا تھا۔ اُن کی زندگی میں اور اُن کی وفات کے بعد اُن کی شان میں سینکڑوں کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اُنہیں اس ملک کی آزادی کا سب بڑا علم بردار اور جمہوریت کا امام سمجھا گیا اور گاندھی جی کی طرح ہی اُن کا نام تحریر و تقریر میں لیا جانا ضروری سمجھا گیا۔ مگر ساتھ ساتھ ہم اُن تمام اصولوں کی بیخ کنی بھی کرتے رہے جن کے لیے جواہر لال نہرو ہمارے لیے قابلِ عزت اور واجب تعظیم تھے۔ اس عمل کا اہتمام خود اُن کی اکلوتی بیٹی اندرا جی نے کیا۔ جواہر لال نہرو تحریر و تقریر کی آزادی کو انسان کا بنیادی حق سمجھتے تھے۔ اندرا جی نے اسے سلب کر لیا۔ جواہر لال نہرو انسان کے احترام کو انسانیت کا لازمہ سمجھتے تھے۔ اندرا جی نے انسانیت اور انسان کی وہ بے حرمتی

کی جس کی نظیر کہیں اور مشکل سے ملتی ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنی تحریر و تقریر میں گاندھی اور نہرو دونوں کے ارشادات کے حوالے بھی دیتی رہیں اور دنیا کو بھی یہ باور کراتی رہیں کہ وہ اسی اصول کو آگے لے جا رہی ہیں جس کے لیے گاندھی جی اور نہرو جی مرے۔ گاندھی اور نہرو کا ماضی بھی بڑا تابناک تھا۔ مگر اندرا جی کا خدا کے فضل سے کوئی ماضی تھا ہی نہیں سوائے اس کے کہ وہ جواہر لال کی بیٹی تھیں۔ اس واسطے اقتدار حاصل کرنے سے پہلے وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز نہ تھیں اور اس زمانے میں اُن کے متعلق کتابیں نہ لکھی گئیں۔ مگر جونہی وہ اقتدار پر قابض ہوئی تو اُن کے گیت گانے والے برساتی مینڈکوں کی طرح ابھرے اور ٹرانے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی شان میں درجنوں کتابیں لکھی گئیں، ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہندوستان کے قلم کاروں کے پاس اندرا جی کے بغیر کوئی اور موضوع ہی نہیں اور شاید اندرا کی شخصیت اتنی عظیم اور تہہ در تہہ ہے کہ آنے والے سالہا سال تک یہاں کے مصنفوں اور ادیبوں کا کام مسلسل کیے جانے کے باوجود اُدھورا ہی رہ جائے گا۔ مارچ میں اندرا گاندھی کا زوال آ گیا اور ایک دم ہوا بدل گئی اور راتوں رات اندرا کی مذمت میں کتابیں تصنیف ہونے لگیں۔ یہ سلسلہ چونکہ نیا ہے اس لیے بڑی دیر تک جاری رہے گا، مگر ساتھ ساتھ ہمارے مصنّفین کرام جلد ہی مرارجی ڈیسائی کی طرف بھی توجہ کرنا شروع کریں گے جن کے بارے میں اِندر ملہوترہ نے ۱۹۶۷ء میں پیش گوئی کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب وزارت اعظمیٰ کے معاملے میں اُن کا نام ہمیشہ کے لیے خارج سمجھنا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ مرار جی ڈیسائی نے اُس وقت اندرا ملہوترہ سے کہا تھا کہ اُن کے لیے ہندوستان کا وزیر اعظم بننا مقدر ہو چکا ہے اور ان کی پیشن گوئی درست ثابت ہوگی۔ ☆☆☆

۲۶ / جون ۱۹۷۷ء

میسا

گذشتہ چند ہفتوں سے وادئ کشمیر میں غنڈہ گردی اور لاقانونیت کے متعدد واقعات ہوئے ۔ امن پسند لوگوں نے اِن واقعات کی شدت سے مذمت کی اور حکومت سے کہا کہ وہ تخریبی عناصر کے خلاف موثر کاروائی کر کے شریف لوگوں کے لیے جینا آسان بنا دیں ۔ گذشتہ چند دنوں سے حکومت حرکت میں آگئی ہے اور قانون کی بے حرمتی کرنے والوں کے خلاف کاروائی کی جانے لگی ہے، ایک سرکاری اطلاع کے مطابق ۶۳۲ ۲/افراد کو قانون شکنی کے الزامات میں گرفتار کیا گیا ہے، ان میں سے ۱۳۲ کو میسا کے تحت پکڑا گیا ہے ۔ ہم سب جانتے ہیں کہ جنتا سرکار نے اقتدار میں آتے ہی شہری آزادی کو بحال کرنے کے زبردست اقدامات کیے ہیں اور سارا ملک ان کے لیے اِس سرکار کا ممنون ہے ۔ مگر ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ جنتا سرکار میسا قانون کو بہت بُرا قانون ہی نہیں بلکہ بدترین کالا قانون سمجھتی ہے ، اور اسے ختم کرنے کے اقدامات بھی کیے جا رہے ہیں ۔ یہ وہی ملعون قانون ہے جس کے تحت جنتا سرکار کے تمام اراکین کے علاوہ شری جے پرکاش نارائن بھی گرفتار کیے گئے تھے، اور ظاہر ہے کہ ایسے قانون کا وجود بجائے خود قانون کے لیے تو نہیں ہے ۔ شری ڈیسائی اور باقی اربابِ حکومت بارہا کہہ چکے ہیں کہ نارمل قوانین ملک میں امن وامان برقرار رکھنے کے لیے کافی ہیں اور کسی بھی صورت میں ہنگامی کالے قوانین کی ضرورت نہیں ہے ۔ سری نگر شہر اور وادی کے باقی حصوں میں

غنڈہ گردی اور امن شکنی کے جو واقعات ہوئے ہیں، اُن کا فوری تدارک بہت ضروری ہے اور ہر امن پسند شہری حکومت کے ساتھ ایسے عناصر کے ساتھ سختی سے نمٹنے میں تعاون کرے گا، جو ریاست کا امن و امان در برہم کرنے کی کوشش کرر ہے ہیں۔ مگر یہ کیا ضروری ہے کہ ان عناصر کو دبانے کے لیے میسا جیسے ملعون قانون کا سہارا لیا جائے، جب کہ حکومت کا ہی دعویٰ ہے کہ امن و امان قائم اور بحال رکھنے کے لیے معمول کے قوانین کافی ہیں اور ان کے تحت بھی ایسی سزائیں دی جاسکتی ہیں جو امن شکن عناصر کے حوصلوں کو پست کریں ،اور انہیں دوبارہ اسی قسم کی حرکتیں کرنے کی جرأت نہ ہو، میسا کے تحت انسان کو اس کے بنیادی حقوق سے محروم کیا جاتا ہے اور جس جماعت نے اس کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے زبردست قربانی دی ہو اور جس کے تقریباً سبھی ارکان خود اس لعنتی قانون کے زخم خوردہ ہوں، اُس جماعت کو زیب نہیں دیتا کہ وہ خود اسی قانون کا سہارا لے کر امن و امان بحال کرنے کی کوششیں کرے ۔اس سے صورت حال میں تناؤ پیدا ہوگا اور ہمارا مطالبہ ہے کہ اس قانون کو فوراً کالعدم قرار دیا جائے اور جن لوگوں نے امن شکنی کی حرکتیں کی ہیں، اُن کے خلاف باضابطہ قانونی کاروائی کی جائے، اور ثبوت و شہادت فراہم کر کے عدالتوں سے ان کو سزائیں دلائی جائیں۔ میسا کا نام ہی انسانیت کا احترام کرنے والوں کے لیے اشتعال کا موجب بنتا ہے۔اس نام کو جتنی جلدی صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے اتنا ہی اچھا ہوگا۔

☆☆☆

۲۵ رجون ۱۹۷۷ء

ادھوری وضاحت

مرزا محمد افضل بیگ صاحب نے پھر ایک بار وضاحت فرمائی ہے کہ شیخ صاحب کے فرزندان ارجمند پر روزگار حاصل کرنے کے دروازے محض اس وجہ سے بند نہیں کیے جاسکتے کہ وہ شیخ صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ انہیں بھی حق ہے کہ وہ ذرائع معاش سے اسی طرح مستفید ہوں جس طرح ریاست میں رہنے والے تمام لوگوں کو یہ حق حاصل ہے، اس حد تک ہم بیگ صاحب کے خیالات کے ساتھ سو فیصد اتفاق کرتے ہیں۔ اختلاف اور اعتراض کی اصل بات کی طرف بیگ صاحب توجہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھتے کیونکہ وہاں دست بلرزد بزرگ خویش کی مشکل درپیش آتی ہے۔ اعتراض صرف اس بات پر ہے کہ جناب طارق عبداللہ کو ایک بہت بڑے محکمے کا افسر اعلیٰ کس اصول پر بنایا گیا۔ ہم سے زیادہ بیگ صاحب جانتے ہیں کہ ایسی اعلیٰ تقرریوں کے لیے ہر حکومت میں ایک ضابطۂ کار ہوتا ہے۔ پبلک سروس کمیشن امیدواروں سے درخواستیں طلب کرتا ہے، اُن کا امتحان لیا جاتا ہے، اُن کا انٹرویو ہوجاتا ہے اور پھر وہ حکومت سے اپنی سفارش کر دیتے ہیں اور کسی خاص امیدوار کے بارے میں فیصلہ دیتے ہیں کہ ان کے خیال میں یہ شخص اس اسامی کے لیے موزوں

ہے کیا جناب طارق عبداللہ کے تقرر کے معاملے میں اس ضابطے پر عمل کیا گیا یا صرف حکومت نے ازخود فیصلہ کیا کہ یہ تقرر موزوں ہے۔ اس لیے اس کی منظوری دی جاتی ہے اگر یہ دوسری صورت ہے تو پبلک سروس کمیشن کے قیام اور دوسرے ضابطوں کی موجودگی کا تکلف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک طرف سے تو عالم یہ ہے کہ ایک معمولی استاد کی تقرری بورڈ کی منظوری کے بغیر نہیں ہوسکتی، کوئی اسامی عارضی طور پر دو یا تین ماہ کے لیے خالی ہو جائے تو وہ بھی بورڈ کی منظوری کے بغیر پُر نہیں کی جاسکتی اور دوسری طرف یہ فیاضی کہ ایک محکمے کا افسر اعلیٰ مقرر کرنا ہے، مگر ضابطوں کی تمام پابندیوں کو بے معنی سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے، جناب طارق عبداللہ محض ایک گریجویٹ ہیں اور بیگ صاحب کو معلوم ہے کہ ریاست میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ نوجوانوں کی کمی نہیں جو بچارے مارے مارے پھرتے ہیں۔ بھوک ہڑتالیں کرتے ہیں، دھرنے دیتے ہیں مگر کوئی انہیں پوچھتا بھی نہیں، ان گریجویٹوں میں سے کچھ لوگ شیخ صاحب کے پاس تلاش روزگار کے لیے جایا کرتے تھے تو شیخ صاحب کا ہمیشہ یہی جواب ہوتا تھا کہ اُن کے لیے کوئی سرکاری نوکری نہیں وہ جائیں اور مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالیں۔ یہ اصول ان بے وسیلہ گریجویٹوں کے لیے ہے جو بدقسمتی سے کسی اہم شخصیت کے رشتہ دار نہیں مگر طارق عبداللہ اور ممتاز بیگ کے لیے نہیں۔ اس کا جواب بیگ صاحب کیوں عنایت نہیں فرماتے، اسی طرح جناب فاروق عبداللہ محض ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں اور ریاست میں اس وقت بھی لاتعداد پوسٹ گریجویٹ ڈاکٹر ہیں جو اسی ریٹ میں سڑ رہے ہیں جو عام ڈاکٹروں کے لیے تجویز کیا گیا ہے ان کو نظر انداز کر کے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو شیر کشمیر میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کا سربراہ بنانے کا کون

ساجواز ہے۔ان کے پاس وہ خصوصی کوالی فیکشن سوائے اس کے اور کیا ہے کہ وہ شیخ صاحب کے فرزند ارجمند ہیں ۔شاہ صاحب کے بارے میں ہم جناب بیگ صاحب سے وضاحت کرنے کونہیں کہیں گے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ تمام درپردہ کوششوں کے باوجود شاہ صاحب کے منہ سے اقتدار کا نوالہ نہ چھین سکے کیونکہ شیخ صاحب کا مافی الضمیر بیگ صاحب کو معلوم ہوا تھا جس کے خلاف جانے کی جرأت بیگ صاحب کو نہ کبھی ہوئی اور نہ کبھی ہوگی۔

☆☆☆

۲۹؍جون ۱۹۷۷ء

غنڈہ گردی

کشمیر کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے جب کوئی سیاسی پارٹی برسر اقتدار نہیں اور انتخابات ہو رہے ہیں۔ اپنی نیشنل کانفرنس جب برسر اقتدار تھی تو وہ خم ٹھونک کر انتخابات کرتی تھی۔ اولین انتخابات شیخ صاحب کے عہد حکومت میں ہوئے اور خدا کے فضل سے ۷۵ کے ۷۵ ممبر بلا مقابلہ ''کامیاب'' ہوئے۔ جانکی ناتھ زتشی راوی ہیں (دروغ برگردان راوی) کہ جب ان ۷۵ بلا مقابلہ سورماؤں کی فہرست راجہ جی نے دیکھی تو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا ''شیخ صاحب کو تھوڑی سی دھاندلی کر کے پانچ چھ مخالفوں کو بھی ممبر بنانا چاہیے تھا تاکہ یہ افسانہ تھوڑی سی حقیقت نظر آنے لگتا۔ اس کے بعد شیخ صاحب برسر اقتدار نہ رہے، مگر ان کے حواریوں نے جو سبق سیکھا تھا اسے از بر یاد کیا اور حق بات یہ ہے کہ انہوں نے شیخ صاحب کی روایت کو اپنی جان سے عزیز سمجھا اور ''انتخابات'' کے تقدس پر آنچ نہ آنے دی۔ شیخ صاحب دوسری مرتبہ وزیر اعلیٰ بنا دیے گئے۔ تو ان کے وقت میں دو ایک ضمنی انتخاب ہوئے اور گذشتہ مارچ میں پارلیمانی نشستوں کا چناؤ، ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اس لیے نہیں کہ ان کی یاد ابھی بھی ہمارے دلوں میں تازہ ہے۔ شیخ صاحب برسر اقتدار نہ تھے تو انہوں نے ہمیشہ انتخابات کا بائیکاٹ کیا

بلکہ ان انتخابات میں حصہ لینے والوں کو خارج از دائرہ رائے شماری قرار دیا۔ مگراب کچھ ایسی پوزیشن ہوگئی کہ وہ حکومت کے مسند پر براجمان نہیں اور انہیں انتخابات میں حصہ لینا بھی پڑ رہا ہے مگر انہیں یاد دلانا ہوگا کہ حکومتی کرامات کے بغیر انتخابات جیتنا کچھ اتنا آسان نہیں، جتنا ان کا خیال تھا۔ چنانچہ جوں جوں انتخاب نزدیک آرہے ہیں نیشنل کانفرنس کے اہلکار اپنے جوانوں کو میدان میں جھونکتے ہیں اور ریاست کا امن در برہم کر کے عوام کو خوف زدہ کرنے کا نسخہ آزمارہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ شیخ صاحب یہ نسخہ زمانہ قدیم سے آزماتے آئے ہیں اور اکثر حالات میں یہ اُن کے لیے مفید بھی ثابت ہوا ہے۔ مگر وہ شاید اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ زمانہ بہت آگے نکل آیا ہے، تشدّد اور غنڈہ گردی، امن شکنی اور فساد سے وہ یا کوئی اور شخص اپنا مقصد حاصل نہیں کرسکتا۔ وہ خود ایمر جنسی کی بدولت دوسال تک اطمینان سے حکومت کرتے رہے ہیں۔ مگر ایمر جنسی کا انجام تو ان کے سامنے ہے۔ ایمر جنسی غنڈہ گردی کا دوسرا ایڈیشن ہے مگر اس غنڈہ گردی کا جنازہ تو نکل چکا ہے۔ دوسرے قسم کی غنڈہ گردی بھی کام نہیں آئے گی اور آئے دن جو فسادات کرائے جاتے ہیں، وہ خود اُن کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں، تشدد، فساد، اور بد امنی کمزوری کی علامت ہیں اور نیشنل کانفرنس والے ابھی سے اتنے پست ہمت ہو گئے ہیں کہ فساد اور غنڈہ گردی کے بغیر انہیں اپنے لیے کوئی پناہ کی جگہ نظر نہیں آتی۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اقتدار کے بل بوتے پر اس دفعہ وہ انتخاب جیت نہیں سکتے، اور اقتدار کا نعم البدل غنڈہ گردی اور تشدّد ہے۔ اُن کی یہی سوچ اُن کے لیے وہ کام کرے گی جو اُن کے دشمن بھی شاید نہ کرسکیں۔ نیشنل کانفرنس کے صدر اعظم جناب شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے آج تک ایک دفعہ بھی

اس تشدد اور امن شکنی کی مذمت نہیں کی اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ شر پسندی اور امن شکنی خود ان ہی کی شہ پر ہو رہی ہے۔ پارلیمانی انتخابات کے سلسلے میں انہوں نے جو تقریر مارچ میں سرینگر میں کی تھی اُس میں انہوں نے اپنے حواریوں کو اس لیے بے وقوف بتایا تھا کہ وہ ان پر تنقید کرنے والوں کا منہ بند نہیں کرتے، شیخ عبداللہ اور اُن کے حواریوں کو جاننا چاہیے کہ یہی اُن کی شکست کی علامت ہے اور یہ غنڈہ گردی ان کے تابوت کی آخری کیل ہوگی۔

☆☆☆

اپریل ۱۹۷۷ء

ایک اور سجدۂ سہو

مرزا محمد افضل بیگ صاحب نے شری چرن سنگھ کے سامنے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنی تقریروں میں آئندہ دفعہ ۳۷۰ کا ذکر نہیں کریں گے، اب دیکھنا یہ ہے کہ بیگ صاحب کی تقریروں کا موضوع اب کیا ہوگا۔ کیوں کہ گزشتہ دو ڈھائی ماہ سے وہ صرف یہی کہتے آئے ہیں کہ جنتا حکومت دفعہ ۳۷۰ کی دشمن ہے اور وہ اسے ختم کرنا چاہتی ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ آئین میں بیالیسویں ترمیم کی تائید کر کے اُنہوں نے خود ہی دفعہ ۳۷۰ کا جنازہ نکالنے کی کوشش کی تھی اور رہی سہی کسر لینڈ گرانٹس بل کو منظور کرانے کی کوشش سے پوری کر دی تھی۔ آج بیگ صاحب کو یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ پٹھانکوٹ کا فلڈ گیٹ کھل گیا، تو وہ اس میں تنکے کی طرح بہہ جائیں گے مگر لینڈ گرانٹس بل کو منظور کرانے کی کوشش میں انہیں اس قسم کا کوئی غم اور کوئی پریشانی نہ تھی۔ بات دفعہ ۳۷۰ کی چل رہی تھی، ہر شخص جانتا ہے کہ جنتا حکومت کے تمام سر برآوردہ اراکین جن میں وزیر اعظم ڈیسائی بھی شامل ہیں، بار بار اعلان کر چکے ہیں کہ دفعہ ۳۷۰ میں کسی قسم کی دست اندازی کا کوئی ارادہ نہیں۔ مگر بیگ صاحب بدستور اصرار کرتے رہے کہ جنتا حکومت کو یہ دفعہ ایک آنکھ نہیں بھاتی اور وہ اسے ختم کر کے ہی دم لے گی۔ ہم نے کئی دفعہ سوچا کہ حکومت کی اتنی یقین دہانیوں کے بعد بھی بیگ صاحب اپنے اس الزام پر اصرار کیوں کرتے ہیں، مگر کوئی قابل اطمینان توجیہہ نظر نہیں آئی سوائے اس کے کہ عوام کو گمراہ کرنے کے لیے بیگ صاحب کے پاس کوئی اور حربہ نہیں اور وہ اپنے اس

اصول پر قائم ہیں کہ جھوٹ اس کثرت سے بولو کہ وہ سچ نظر آنے لگے۔ مگر چونکہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اور وہ زیادہ دیر تک چل نہیں سکتا بیگ صاحب بھی شری چرن سنگھ کے سامنے سجدہ سہو دینے پر مجبور ہوئے اور وعدہ فرمایا کہ وہ آئندہ دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانے کے جرم کا ارتکاب نہیں کریں گے اور لگے ہاتھوں یہ بھی سنیئے کہ یہ بیگ صاحب کا پہلا سجدہ سہو نہیں۔ وہ اس سے پہلے ایسے درجنوں سجدہ سہو دیتے آئے ہیں اور پھر بھولتے رہے ہیں۔ رائے شماری محاذ کی تصنیف کے وقت انہوں نے تخیل کی جن بلند پروازیوں کو چھوا تھا اور قانونی موشگافیوں سے جو عجیب وغریب نکتے پیدا کیے تھے اُن پر کشمیر اکارڈ کے دن سجدہ سہو لازم آیا اور بیگ صاحب نے اسے بلا وضو ادا بھی کیا اور کانگریس کی عنایات سے مستفید ہونے کے لیے اس فیصلے پر ایک اور سجدہ سہو دیا، جو انہوں نے اس کے ساتھ ترک موالات کرنے کے متعلق چند سال پہلے کیا تھا۔ پھر کرنا خدا کا یہ ہوا کہ کانگریس نے بخشی ہوئی روٹی چھین لی اور مرزا صاحب مشیر مال نہ رہے اور انتخابات کا چکر سامنے آگیا، اس کا وہ بائیکاٹ نہ کر سکے کہ قانونی دفاع نے اس گتھی کو سلجھانے میں کوئی مدد نہ دی۔ اب انتخابات جیتنے کے لیے لوگوں سے کہنے کے لیے کچھ تو ہونا چاہیے۔ چلو دفعہ ۳۷۰ کی لاٹھی گھمائیں اور بار بار گھمائیں ہو سکتا ہے کوئی نہ کوئی وار سیدھا پڑے، بدقسمتی سے یہ وار خالی گیا اور بیگ صاحب کو معلوم ہوا کہ ان کی پوزیشن مضحکہ خیز ہو رہی ہے، ناچار چرن سنگھ کی خدمت میں حاضر ہو کر اقرار کیا کہ اب ایسی حرکت نہیں کریں گے۔ ایک اور سجدہ سہو، خدا جانے ابھی کتنے سجدے سہو باقی ہیں۔

☆☆☆

۲۴ر جون ۱۹۷۷ء

گاندربل کا درویش

سری نگر سے بارہ میل دور گاندربل کے ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں ایک ۷۶ سالہ مردِ بزرگ ایک عرصے سے عملی سیاست سے قطعی لاتعلق اپنی زندگی کے آخری ایام گزار رہا ہے۔ اس کا نہ کسی سیاسی جماعت سے تعلق ہے اور نہ وہ اب کسی سیاسی لیڈر سے وابستہ ہے۔ اس کی صحت بگڑ چکی ہے اور قوائے جسمانی روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔ وضع قطع، لباس اور چال ڈھال سے ایسا لگتا ہے کہ اس مردِ درویش کو سیاست سے کبھی کوئی تعلق نہ رہا ہوگا۔ لیکن گفتار کے اسلوب، الفاظ کے انتخاب اور لہجے کی بے پناہ سنجیدگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص بحرِ سیاست کا ہی غواص نہیں منطق اور فلسفے کی دنیا کا بھی شاہ سوار ہے۔ ساری دُنیا سے الگ تھلگ اور دُنیا بھر کی سیاست سے لاتعلق رہنے کے باوجود اس ۷۶ سالہ بزرگ کا کاشانہ ملک بھر کے سیاستدانوں اور کشمیر کے ہر مکتبِ خیال کی توجہ کا مرکز ہے۔ اس کی کٹیا، اس حکیم کا مطب معلوم ہوتی ہے کہ جس کے پاس ہر درد کی دوا اور ہر زخم کا مرہم ہے اور یہی وجہ ہے کہ گاندربل کے اس فقیر کے در پر دردمندوں، حاجت مندوں اور غرض مندوں کا ہی نہیں، حاکمانِ وقت اور پادشاہانِ سلطنت کا بھی ہجوم رہتا ہے۔ وادی اور جموں کے اطراف واکناف سے اس مردِ درویش کی زیارت کرنے والوں کا سلسلہ سال بھر قائم رہتا ہے اور اب ملک کے اونچے اونچے ایوانوں میں جلوہ افروز شخصیتوں کا بھی تانتا بندھا رہتا ہے۔ پچھلے دنوں مرکزی حکومت کے وزیر خارجہ شری اٹل بہاری باجپائی اور مرکزی وزیر مواصلات جارج فرنانڈیز کشمیر

آئے، تو انہوں نے سرکاری (Protocol) کے تمام ضابطے توڑ کر فقیر گاندر بل کے دروازے پر حاضری دی، کل جنتا پارٹی کے سرکردہ رہنما اشوک مہتہ، ناناجی دیش مکھ اور بانو پرتاپ سنگھ کشمیر آئے تو انہوں نے سب کام چھوڑ کر پہلے گاندر بل کے درویش کے درشن کرنا ضروری سمجھا۔

دُنیا سوچتی ہے کہ عملی سیاست سے قطعی لاتعلق، سیاسی جماعتوں اور لیڈروں سے دل برداشتہ عمر کی ۷۶ ویں منزل سے بھی آگے، گاندر بل کے اس مردِ بزرگ میں وہ کون سی ایسی بات ہے جو بڑے بڑے سیاست دان اور حکمران، اس کے در پہ سر جھکانے میں اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ ہم نے بھی اس ''معمے'' پر بہت غور کیا اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ گاندر بل کے درویش کی عظمت کا راز اس کی کامیاب سیاست یا اس کا تجربہ نہیں، اس کی سادگی، قناعت اور اس کا بے داغ کردار ہے۔ گاندر بل کے اس مولوی نے بڑے بڑے سیاسی ڈرامے کھیلے ہیں، وہ بہت سی سیاسی معرکہ آرائیوں کا ہیرو رہ چکا ہے، لیکن اس پر کوئی ہوسِ اقتدار، جاہ طلبی اور کنبہ پروری کا الزام عائد نہیں کر سکتا۔ وہ چاہتا تو اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے عالی شان کوٹھیاں تعمیر کر سکتا تھا، اپنے بچوں اور دوسرے عزیزوں کے لیے سامانِ عیش مہیا کر سکتا تھا، لیکن اس مردِ بزرگ نے اپنے دامن کو کسی ایسی آلائش سے ملوث نہیں ہونے دیا، اور اس کے اسی فقر نے اسے خواص کی توجہ اور عوام کی محبت کا مرکز بنا دیا ہے۔ گاندر بل کے درویش کی زندگی ہمارے ہاں کے بہت سے سیاستدانوں کے لیے مشعل راہ ہے اور جن کی آنکھوں میں روشنی ہے، وہ اس مشعل سے اپنی زندگی کا اندھیرا دور کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

۱۷ اپریل ۱۹۷۷ء

قناعت اور اسراف

بہت سے ماہرینِ اقتصادیات کا خیال ہے کہ ہندوستان ایسے بڑے ملک میں دولت کے اتنے بے پناہ ذرائع اور وسائل موجود ہیں کہ اگر اُنہیں احتیاط کے ساتھ ہاتھ میں لایا جائے اور پھر حاصل کرنے کے بعد ان کو دیانتداری اور ہوشیاری سے ملک کے عوام کی بہبودی پر صرف کیا جائے تو اسے بیرونی ممالک سے امداد اور قرضے لینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ مگر بدقسمتی یہ ہوئی ہے کہ ایک طرف سے ہم ملکی وسائل اور آمدنی کو بڑھاوا دینے کی طرف کم توجہ دیتے ہیں اور دوسری طرف سے حاصل شدہ دولت کو بے رحمی کے ساتھ بے کار چیزوں پر ضائع کرتے ہیں۔ قناعت کی جگہ اسراف نے لی ہے اور سادگی کی جگہ بے جا نام ونمود کو زندگی کا مقصد قرار دیا گیا ہے۔ ہماری دولت کا اکثر حصہ ظاہر دارانہ اخراجات کی نذر ہو جاتا ہے کیوں کہ ہم جھوٹے وقار کو قائم رکھنے کے لیے ایسی حرکتیں کرتے ہیں، جن کے بغیر بھی ہم وقار اور عزت کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ صدر بازار دلی کے ایک جلسے میں وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی نے پولیس بندوبست کو دیکھ کر پھر ایک مرتبہ ناراضگی کا اظہار کیا ہے اور پولیس والوں سے کہا ہے کہ جب اُن کو پبلک جلسوں سے خطاب کرنا ہوگا تو آپ براہ مہربانی اپنی ٹانگ نہ اڑا لیا کیجیے۔ میری حفاظت کے لیے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میری حفاظت لوگ کریں

گے اور جس دن مجھے لوگوں کی طرف سے خطرہ محسوس ہوگا، اس دن میرا جینا بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ مسز گاندھی کی حفاظت کے لیے روزانہ دو لاکھ روپیہ خرچ ہوتا تھا، ہم نے اس کے خلاف احتجاج کیا ہے اور ہم خود اسی ناؤ میں کیسے سوار ہو جائیں گے۔ سو باتوں کی یہی ایک بات ہے کہ ظاہری نام ونمود، جھوٹے وقار، اظہار جاہ وجلال پر غریب عوام کا روپے بے دردی سے ضائع کرنا ایک سنگین جُرم ہے۔ اس میں کیا تک ہے کہ ایک آدمی کو قوم نے اپنا اعتماد دیا ہے اور وہ اس اعتماد کے سہارے وزیراعظم یا وزیراعلیٰ بنتا ہے تو اچانک مافوق البشر ہو جاتا ہے اور اس وقت تک گھر سے نہیں نکلتا جب تک مسلح پولیس کا حفاظتی دستہ نہ ہو۔ سائیرن گاڑی آگے آگے ہٹو، بچو نہ پکارتی ہو۔ یہ غریب عوام کی دولت کا بے جا مصرف ہے، اور ایک ایسے ملک میں جہاں کروڑوں انسانوں کو دو وقت کی روٹی، روح اور جسم کا رابطہ قائم رکھنے کے لیے میسر نہیں جہاں آسمان کی چھت کے سوا اُن کی کوئی جائے پناہ نہیں، جہاں تن ڈھانپنے کے لیے اُنہیں سال میں دو گز کپڑا میسر نہیں آتا، وہاں کے وزراء، حکام اور اہل کار صرف اپنی جھوٹی عظمت کا ڈنکا بجانے کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہائیں، جنتا حکومت اگر اسی ایک بدعت کو جڑ سے اکھاڑنے میں کامیاب ہوئی تو یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں ہوگی۔

☆☆☆

۴؍جون ۱۹۷۷ء

مظالم کی داستان

ایمر جنسی کے اُٹھ جانے کے بعد پولیس اور حکام کے مظالم کی داستانیں کثرت سے اخباروں میں آنے لگی ہیں۔ ان کو پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ ہم بیسویں صدی کے آخری عشرے میں زندگی گزار رہے ہیں نہ یہ باور ہوتا ہے کہ انسان ابھی تک زندہ ہے اور انسانیت مر چکی ہے۔ پروفیسروں، وکیلوں، ادیبوں، صحافیوں، آرٹسٹوں پر ایسے انسانیت سوز مظالم ڈھائے گئے ہیں، جو شاید قبائلی دور میں بھی پیشہ ور مجرموں پر بھی نہ کیے جاتے ہوں گے۔ جسمانی اذیتوں کے علاوہ ذہنی تکالیف اس حد تک پہنچائی گئی ہیں کہ ان مظالم کے شکار دماغی امراض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ان تمام حالات کو پڑھ کر دو سوال ذہن میں آ جاتے ہیں۔ کیا اس کے لیے وہ لوگ ذمہ دار ہیں، جنھوں نے اپنے اقتدار کی عمر دراز کرنے کے لیے ایمر جنسی ایسی منحوس چیز ملک پر تسلط کر دی، یا وہ انتظامیہ اور پولیس کے اہلکار جنھوں نے انسانیت کے تمام ضوابط کو یکسر فراموش کر کے درندگی کے تمام ریکارڈ مات کیے۔ ان دو سوالوں کے جواب میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کی تمام تر ذمہ داری ایمر جنسی کی لعنت کو مسلّط کرنے والوں پر ہے جنھوں نے قانون اور دادرسی کے تمام دروازوں پر تالے ڈال دیئے اور اُن اہلکاروں پر بھی جنھوں نے اپنے آقاؤں کو خوش کرنے،

ترقیاں پانے اور اعزازت حاصل کرنے کے لیے اپنے ہی جیسے انسانوں پر نا روا ظلم کیے، اور ہمارا خیال ہے کہ اب جو حکومت ہندوستان میں برسر اقتدار ہے اُسے اس بات کی طرف بڑی توجہ سے دھیان دینا ہوگا کہ انتظامیہ اور پولیس کے اہلکاروں کے طریق کار کے بارے میں ایسی دوررس اصلاحات کی جائیں، جن سے اس بات کا کوئی امکان نہ رہے کہ ایک لاچار بے بس اور مجبور انسان ان درندوں کے چنگل میں حیوانوں کی طرح پیٹتا رہے اور آہ بھی نہ کر سکے، موجودہ حکومت کو بھی اپنا نظامِ حکومت چلانے کے لیے انہی اہلکاروں سے کام لینا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے تصور سے بھی شرافت کانپ اٹھتی ہے۔ جو مظالم انہوں نے لوگوں پر کیے ہیں اُن کو فراموش کرنا کسی کے بس کی بات نہیں، حکومت کی سوچ بدلنے سے ان ظالموں کی سرشت تو نہیں بدل سکتی اور جب تک یہ لوگ اپنے منصوبوں پر قائم ہیں، حکومت کا نام بھی روشن نہیں ہو سکتا۔ ہمارے خیال میں حکومت کو اولین فرصت میں بڑی تیزی اور عجلت کے ساتھ ایسے تمام افسروں اور پولیس والوں کے اعمال کا جائزہ لے کر انہیں فوری طور اپنے عہدوں سے سبکدوش کر کے عبرت ناک سزائیں دلانے کا انتظام کرنا چاہیے۔ ایسے لوگ انسانیت کے مجرم ہیں اور انسانیت کا وقار بلند کرنے کے لیے جو بھی اقدام کرنا پڑیں اس میں تامل نہیں کرنا چاہیے۔

☆☆☆

۳؍جون ۱۹۷۷ء

دیر ہے اندھیر نہیں

گذشتہ دنوں شری سنجے گاندھی نے عدالت عالیہ میں درخواست دی کہ ان کے خلاف چوری کا ایک مقدمہ دائر کیا گیا ہے اور انہیں اندیشہ ہے کہ اُن کو گرفتار کر کے پریشان کیا جائے گا، اس لیے اُن کے حق میں قبل از وقت ضمانت منظور فرمائی جائے۔ یہ وہی سنجے گاندھی ہیں، جو صرف دو ماہ بیشتر حاکم علی الاطلاق تھے۔ جن کے اشارۂ چشم و آبرو پر ہندوستان کا بڑے سے بڑا انسان ذلیل ہوسکتا تھا۔ ایمرجنسی کے ۲۰ رماہ اس بدبخت جوان نے خون کی ہولیاں کھیلیں، عصمتوں کا سودا کیا، آباد بستیوں کو ویرانوں میں بدل کر رکھ دیا، لاکھوں نوجوان مردوں اور عورتوں کو زبردستی پکڑ کر زندگی بھر کے لیے ناکارہ اور مفلوج بنا دیا، جب خدا کا قہر حرکت میں آ گیا، تو اس کی ناؤ پلک جھپکنے میں ڈوب گئی۔ مظلوموں کی آہیں رنگ لائیں اور شہیدوں کا خون شعلوں کی زبان بن کر لپکنے لگا۔ ابھی کل کے اخبارات میں اس مظلوم، مقہور اور مجبور عبدالرحمان کی تصویر آئی ہے جو بدقسمتی سے ترکمان گیٹ کا رہنے والا تھا، جسے سنجے کی شیطانی فوج پکڑ کر لے گئی اور گھر والوں کو یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کیوں پکڑا گیا، کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ عدالت کے دروازے کھل گئے تو اس کے بھائی نے واویلا کیا۔ عدالت نے حکم دیا کہ اس مظلوم کو پیش کردو، اُسے پیش کیا گیا مگر کس حال میں، وہ کسی کو پہچان نہیں سکتا، وہ نہ کھڑا رہ سکتا ہے، نہ

بیٹھ سکتا ہے، اس کے ہوش وحواس معطل ہیں۔ اخبارات میں اس کی تصویر دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ قبرستان سے کوئی لاش بھاگ آئی ہے، ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اُسے معمول پر لانے کے لیے سالہا سال لگیں گے، اسے فاقوں مارا گیا ہے، اس کے پاؤں کی ایڑیوں میں کیلیں ٹھونس دی گئی ہیں، اس کی نسبندی کر دی گئی ہے اور اذیت کے جو تصورات ذہن میں آسکتے ہیں، اس غریب پر آزما لیے گئے ہیں، عدالت نے ہر چند کوشش کی کہ وہ کسی بات کا جواب دے سکے، نہ دے سکا اور اب سنجے گاندھی گرفتاری کے ڈر سے قبل از گرفتاری ضمانت کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں۔ اُس عدالت کا جس پر اُس نے اپنے بیس ماہ اقتدار میں تالے ڈلوائے تھے، مگر اب ان دروازوں کو کھول دیا گیا ہے اور سنجے کی یہ درخواست ضمانت منظور ہوئی ہے کیونکہ اب قانون کی بالادستی ہے، جی چاہتا ہے کہ کاش ایک مرتبہ اُس سنجے کے جنگل کے قانون کو اُسی پر آزما لیا جائے اور اُس کے ساتھ برابر وہی سلوک ہو، جو غریب عبدالرحمان کے ساتھ ہوا، قِصاص چلا رہا ہے کہ جو، جو بوئے گا وہی کاٹے گا۔ قانونِ قدرت بھی یہی ہے۔ ہمارے قانون سے شاید وہ بچ بھی سکے، مگر قدرت کا قانون اسے کبھی معاف نہیں کرے گا، وہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

☆☆☆

۲ر جون ۱۹۷۷ء

عزت وآبرو کا مقام

اپنے مرزا محمد افضل بیگ صاحب جن دنوں حکومت ہند کی بجائے مسز اندرا گاندھی کے معتمد مسٹر پارتھا سارتھی سے ہفتوں مذاکرات کرتے اور اپنے لوگوں کو اس مغالطے میں ڈال رہے تھے کہ بیگ صاحب کوئی بڑا کارنامہ کرنے والے اور بڑا تیر مارنے والے ہیں، اس دوران وہ اپنے مصاحبین خاص کے ذریعہ کچھ دلکش افواہیں بھی چھوڑا کرتے تھے۔ مثلاً یہ کہ کشمیر کے لیڈروں (یعنی موجودہ نیشنل کانفرنس) اور ہندوستان کے درمیان مفاہمت کی بنیاد صرف یہ ہے کہ کشمیر میں وہ حالت برقرار کی جائے جو ۸/اگست ۱۹۵۳ء سے پہلے تھی، یعنی یہ کہ الحاق محدود ہے۔ کشمیر میں گورنر نہیں بلکہ صدر ریاست ہے، کشمیر کے انتظامیہ کا سربراہ وزیر اعلیٰ نہیں، وزیر اعظم ہے، پارلیمنٹ کے نافذ کردہ قوانین اُس وقت تک کشمیر میں نافذ نہیں ہوں گے جب تک ریاستی اسمبلی اس کی خواہش نہ کرے، وغیرہ وغیرہ۔ عوام کے سامنے ان دنوں بیگ صاحب اور شیخ صاحب کم آیا کرتے تھے، اور آتے بھی تھے تو ان باتوں کا اعادہ بھی کرتے تھے، البتہ شیخ صاحب ایک بات بڑے طمطراق سے فرمایا کرتے تھے کہ گفت وشنید جاری ہے، مجھے معلوم نہیں اس سے کون سی صورت اُبھرے گی مگر میں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ جو بھی سمجھوتہ قابل عمل نظر آئے گا، اس وقت تک ہرگز قبول نہ کیا جائے گا جب تک اسے عوام کی تائید حاصل نہ ہو، میں یہ سمجھوتہ آپ لوگوں کے سامنے رکھوں گا۔ آپ نے قبول کیا، تو مجھے بھی قبول ہوگا، آپ نے

نامنظور کیا تو مجھے بھی نا منظور ہوگا۔ پھر ہوا یہ کہ اچانک ایک روز جناب شیر کشمیر اپنے قانونی مشیر مرزا محمد افضل بیگ کے ساتھ راج بھون جموں میں تشریف فرما ہوئے اور وہاں شیر کشمیر نے چیف منسٹری کا حلف لے لیا۔ اور اُسی دن مسز اندرا گاندھی نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ شیخ صاحب نے بہت زور مارا تھا کہ کشمیر میں اگست ۱۹۵۳ء سے پہلے کی حالت پھر سے بحال کی جائے مگر ہم نے اُن سے کہا کہ گھڑیوں کی سویوں کو پیچھے کی طرف گھمایا نہیں جا سکتا، اور انہوں نے ازراہ کرم ہماری بات مان لی اور وہ بحثیت چیف منسٹر حلف لینے پر رضا مند ہو گئے۔ اسی دوران اپنے بیگ صاحب نے ایک اور شوشہ یہ چھوڑا تھا کہ ایکارڈ اُس وقت تک نہیں ہوگا جب تک راولپنڈی روڈ کھولی نہ جائے، اُن کے دوستوں نے اس شوشے کو بڑی پبلسٹی دی اور خود بیگ صاحب کشمیر کی اقتصادی بدحالی کو صرف راولپنڈی روڈ کے بند ہونے کا شاخسانہ کہتے تھے۔ ۲۵ فروری ۱۹۷۵ء کے بعد مرزا بیگ صاحب نے کبھی اس کا ذکر نہ فرمایا۔ ہم انہیں یہ قواعد اس لیے یاد دلاتے ہیں کہ آج کل وہ انتخابی مہم چلانے میں مصروف ہیں، وہ صرف ۳۷۰ کا وظیفہ پڑھتے ہیں، راولپنڈی روڈ بھی اُن کا ایک حربہ ہے اس کو وہ کیوں نہیں آزماتے، باقی رہا سوال کہ یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوگی تو پھر عوام کو کیا جواب دیں گے۔ عوام کو انہوں نے یا شیخ صاحب نے جواب دیا ہی کب ہے؟ ان غریبوں کے لیے عزت و آبرو کا مقام تو صرف اتنا ہے کہ شیخ صاحب چیف منسٹر ہو جائیں اور بیگ صاحب مشیر مال، یہ امرت دھارا کی طرح ہر مرض کا علاج اور ہر درد کی دوا ہے۔

☆☆☆

۲۴ رمئی ۱۹۷۷ء

مذہب اور سیاست

ہندوستانی قوم پرست سیاست کی ایک نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ اسے ابتداء سے ہی غیر مذہبی بنیادوں پر چلانے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ امورِ دنیا کو مذہبی جذبات اور اعتقادات سے الگ رکھنے سے ہی یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ ملک کے تمام لوگ ایک سیاسی یا دُنیاوی مقصد حاصل کرنے کے لیے متحد ہو جائیں، ہندوستان جیسے ملک میں یہ طریقہ کار اور بھی زیادہ ضروری اور اہم ہے، کیونکہ اس دیس میں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے کعبہ اور سومنات کے متوالے رہتے ہیں جن کا رہن سہن بھی صوبہ صوبہ بدلتا ہے اور معاشرت بھی۔ ان سب کو متحد اور یکجا رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان سب کی زبانوں، ان سب کے مذاہب، ان سب کے رہن سہن، اس سب کے رسوم ورواج کا احترام کیا جائے، کوئی کسی کی دل آزاری نہ کرے اور سب کے سب ملک کے اعلیٰ مقاصد کے لیے تمام چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بھول کر ایک ہو جائیں۔ اسی بنیاد نے ہندوستان کی قوم پرست تحریک کو تقویت بخشی، اور وہ برطانوی سامراج سے صف آراء ہونے کے اہل ہوگئی۔ حصول آزادی کے بعد یہ اصول ہمارے سامنے رہا، اور ہندوستان کا آئین بالکل انہی اصولوں کے پیش نظر مرتب کیا گیا۔ انفرادی طور پر وقتاً فوقتاً کچھ لوگوں نے جو برسر اقتدار بھی تھے، ایسی حرکتیں کیں جن سے اس اصول کو صدمہ پہنچا۔ مثلاً کانگریس کے دور اقتدار میں جب کبھی کوئی نیا جہاز سمندر میں ڈالا جاتا تھا تو اس سے پہلے ہندو مذہب کے مطابق رسومات ادا کی جاتی تھیں، کسی بڑے منصوبے کا افتتاح کرتے وقت بھی ایسی ہی حرکتیں کی جاتیں، ناریل پھوڑے جاتے، اور ہون رچائے جاتے، ظاہر ہے کہ یہ طریقہ ہندوستانی قوم

پرست سیاست کے بنیادی اصولوں کے خلاف تھا۔ ہم نے اور ہمارے ساتھ اکثر صحیح لائینوں پر سوچنے والے دوستوں نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی، اور احتجاج کیا کہ خالص قومی معاملات میں ان مذہبی رسوم کا کون سا مقام ہے۔ بعض دوستوں نے اس کا علاج یہ سمجھا کہ وہ بھی اُن کے نقشِ قدم پر چلنے لگے۔ مثلاً ہندوستان کا ایک غالب ہندو اکثریت والی ریاست میں اگر کسی سرکاری تقریب پر ہندو مذہبی رسومات ادا کی گئیں تو غالب مسلم اکثریت والی ریاست میں ایسی تقریبوں پر تلاوت قرآن ہونے لگی۔ کشمیر کے واحد لیڈر جناب شیخ محمد عبداللہ بار ہا سیاسی جلسوں میں قرآن مجید کی تلاوت سے اپنی تقریر کا افتتاح فرمانے لگے۔ سوال یہ ہے کہ ایک سیاسی پارٹی جس کا دعویٰ ہے کہ وہ تمام آبادی کے مفادات کی نگران اور محافظ ہے، اپنا کوئی خالص سیاسی جلسہ کرتی ہے تو اس میں تلاوت قرآن سے آغاز کرنے کا جواز کیا ہے، حال ہی میں بیگم شیخ محمد عبداللہ کے انتخاب کی مہم کے سلسلے میں جو تقریر شیخ صاحب نے فرمائی اس میں ظاہر ہے کہ ہندو بھی تھے، سکھ بھی تھے اور مسلمان بھی تھے، اور شیخ صاحب کا روئے سخن ان سب کی طرف تھا۔ اس کا آغاز بھی تلاوت قرآن مجید سے کیا گیا پھر جب اس کے متعلق کسی قومی اخبار میں لکھا گیا تو شیخ صاحب سخت خفا ہو گئے اور انت ناگ کے جلسے میں بھولے بھالے اور معصوم عوام کے مذہبی جذبات سے کھیلتے ہوئے فرمایا کہ جنتا پارٹی کو مسلمانوں کے قرآن پڑھنے پر اعتراض ہے مگر ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔ شیخ صاحب گذشتہ ۴۰ برس سے قوم پرستانہ سیاست کے مدعی رہے ہیں۔ ہم ان سے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہنا چاہتے، البتہ اگر اب بھی ان کے سامنے لفظ ''دیانت'' کے کچھ معنی ہیں تو وہ ذرا اس پر غور فرمالیں اور پھر خود ہی فیصلہ کریں کہ اصل صورت حال کیا ہے اور وہ اسے کس رنگ میں پیش کر رہے ہیں۔ ☆☆☆

۴ رمئی ۱۹۷۷ء

وزیر اور عوام

مسٹر جارج فرنانڈیز وزیر مواصلات کا عہدہ سنبھالنے کے بعد پہلی مرتبہ بمبئی گئے تو ریلوے سٹیشن پر استقبال کرنے والوں کا بے پناہ ہجوم تھا، یہاں تک کہ ان کا ریلوے سٹیشن سے باہر نکلنا مشکل ہو گیا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حفاظتی پولیس کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے مسٹر فرنانڈیس نے اور باتوں کے علاوہ جو خاص بات بتا دی، وہ یہ ہے کہ وزیروں اور حاکموں کو جس وقت حفاظت کے لیے پولیس کا سہارا لینا پڑے، تو اُن کو فوراً مستعفی ہو جانا چاہیئے کیونکہ یہ اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ وہ عوام کا اعتماد کھو چکے ہیں، اور ایک جمہوری ملک میں اُن کو عوام کی گردنوں پر عوام کی مرضی کے خلاف سوار رہنے کا کوئی حق نہیں، سو باتوں کی یہی ایک بات ہے اور شاید جمہوریت کی ابتداء بھی یہی ہے، اور انتہا بھی یہی۔ اصل میں ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم نے ایک غیر ملکی سامراج کو یہاں سے جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ چلا تو گیا مگر اپنے پیچھے اپنی روایات چھوڑ گیا جن کو ہم ابھی تک اپنے سینوں سے لگائے بیٹھے ہیں۔ بیس سال کے عرصے سے ہم سے اتنا نہ ہو سکا کہ غیر ملکی سامراج نے اپنی دھاک بٹھانے کے یے جو طمطراق اور شان و شوکت قائم کیا تھا اُسے ایک لعنت سمجھ کر دور پھینکتے۔ ہم نے نہ صرف اسے محفوظ رکھا، بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ کرتے چلے آئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ صرف مرکز اور

ریاستوں کے وزیروں کی حفاظت پر ہماری دولت کا ایک قابلِ ذکر حصہ صرف ہونے لگا، اور دوسرا بڑا نقصان یہ ہوا کہ جن لوگوں کو ہم نے اپنے نمائندے بنا کر اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں بھیجا وہ اپنے آپ کو خداوند سمجھنے لگے، اور جن کی مہربانی سے انہیں یہ رتبہ ملا، انہیں کیڑے مکوڑے جاننے لگے، دوری اور مغائرت کی یہ خلیج بڑھتی گئی۔ اس کا اثر نوکرشاہی پر بھی پڑا، اور وہ سرکاری ملازم جن کا اصلی فریضہ عوام کی خدمت گذاری کرنا ہے فرعون بن گئے، اور عوام پر قہرِ الٰہی بن کر نازل ہونے لگے، پولیس کا بنیادی فرض ہے کہ وہ عوام کی جانوں کی حفاظت کرے، اُن کی آبرو اور اُن کے مال کو لٹیروں اور غارت گری کی دستبرد سے بچائے مگر واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ بیس سال میں اور خاص کر گذشتہ دو سال میں ملک کی پولیس ایک خون آشام درندوں کا ایک منظّم گروہ بن گئی۔ جنہوں نے مظلوم عوام پر وہ ستم ڈھائے، وہ مظالم توڑے کہ شیطان بھی پناہ مانگے، چند ایک واقعات کے چہرے سے گذشتہ دنوں پردہ سرک گیا ہے اور حیرانی ہوتی ہے کہ کیا اس بیسویں صدی میں بھی یہ ممکن ہے، مسٹر جارج فرنانڈیس کا یہ ارشاد آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے کہ وزیروں کو جب اپنی حفاظت کے لیے پولیس کا سہارا لینے پڑے، تو ان کو وزارت چھوڑ کر جانا چاہیئے، اس کے علاوہ بھی ہماری روایات کا تقاضا یہی ہے کہ جھوٹے وقار اور فضول کر وفر کے لیے اور اپنی عظمت کے نام و نمود کے لیے پولیس دستوں، سائیرن جیپیوں، دربانوں، جمعدار اور سپاہیوں کی نمائش نہ کی جائے اس بدعت کا خاتمہ جتنا جلد ہو، اتنا ہی اچھا ہے۔

☆☆☆

۱۵رمئی ۱۹۷۷ء

اپنا اپنا معیار

انگلستان میں مسٹر پیٹر جے کو امریکہ میں برطانیہ کا سفیر مقرر کیا گیا ہے، بی بی سی کے ایک تبصرے کے مطابق مسٹر جے انگلستان کے چوٹی کے ماہرین اقتصادیات وبین الاقوامی امور کی صف اول میں ہیں، بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ مسٹر جے کا نمبر دوسرا یا تیسرا ہے۔ اُن کی رائے کو عالمی وقعت دی جاتی ہے، اور اُن کے مشورے کی دُنیا بھر میں قدر ہوتی ہے۔ مگر اس کے باوجود انگلستان میں مسٹر جے کے تقرر نے ایک شدید ناراضگی کی لہر دوڑا دی ہے۔ حزب اختلاف کے علاوہ خود حکمران پارٹی نے اس تقرر کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اگرچہ مسٹر جے کی قابلیت، صلاحیت اور موزونیت کے بارے میں کسی کو بھی اختلاف نہیں، پھر اُن کے تقرر پر اظہار ناپسندیدگی کا سبب کیا ہے؟ سبب یہ ہے کہ مسٹر جے وزیر اعظم برطانیہ کے داماد ہیں، برطانوی پارلیمنٹ میں بھی اس تقرر پر اظہار ناپسندیدگی کیا گیا، اور وزیر اعظم برطانیہ کو اپنی پوزیشن صاف کرنے کے معاملے میں بڑی دشواری پیدا ہوئی۔ ہم نے جب اس خبر کو سُنا تو ہمیں سخت حیرت ہوئی، کیونکہ خدا کے فضل سے ہم دُنیا کے اس حصے میں رہتے ہیں جہاں سب سے بڑی قابلیت، سب سے بڑی صلاحیت اور سب سے بڑی موزونیت یہ ہے کہ آدمی کسی با اختیار انسان کا قریبی رشتہ دار ہو۔ سنجے گاندھی ایک ناکام آٹو موبائیل انجینئر ہونے کے باوجود ہندوستان

کے سیاہ وسفید کا مالک بن سکتا ہے، وزراء اعلیٰ، مرکزی کابینہ، ریاستوں کے وزراء اور وزرا اعلیٰ کی قسمتوں کا فیصلہ کرسکتا ہے۔ شاہوں کو گدّا بنا سکتا ہے اور مسخروں کے سروں پر تاج رکھ سکتا ہے۔ آبادیوں کو چشم زدن میں ویرانوں میں تبدیل کرسکتا ہے، اُس کی صلاحیت، قابلیت اور موزونیت صرف یہ ہے کہ وزیراعظم کا بیٹا ہے۔ ذاتی قابلیت کی اساس پر تو وہ زیادہ سے زیادہ کسی موٹر کمپنی کا جونیئر میکنیک ہوسکتا ہے، خود اپنی ریاست میں خواجہ غلام محمد شاہ کی صلاحیتوں سے ہرکس وناکس واقف ہے، اُن کی ذہنی استعداد کو دیکھ کر ایک دفعہ غلام محمد میر راجپوری نے کہا تھا کہ میں اس آدمی کو دیکھ کر خدا کے وجود کا قائل ہو گیا ہوں۔ ذہنی افلاس کے باوجود عالیشان مکان میں رہتا ہے۔ موٹروں میں گھومتا ہے، حکم چلاتا ہے، نوکروں چاکروں پر دست درازیاں کرتا ہے، یہ اگر خدا کی قدرت نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ چیز اگر ایک بے دین کو خدا کا قائل نہ بنائے تو اور کیا ہو، مگر راجپوری صاحب یہ بھول گئے کہ شاہ صاحب اپنے شیر کشمیر کے داماد ہیں اور اس اعتبار سے وہ ہاتھی ہیں، ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں ہوتا ہے۔ شاہ صاحب خود بھی جانتے ہیں کہ اُن کی اہمیت کا راز کیا ہے اور کہتے ہیں: وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

☆☆☆

۱۴رمئی ۱۹۷۷ء

ظلم کا انجام

ایمرجنسی کے ہٹتے ہی اور جنتا پارٹی کے برسر اقتدار آتے ہی ایمرجنسی کے زمانے کے مصائب سے پردہ ہٹنے لگا۔ اُس زمانے میں اخباروں پر بڑی شدید پابندی تھی۔ اس لیے معلوم بھی نہیں ہوتا تھا، کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ تقریر وتحریر کی آزادی بحال ہوتے ہی معلوم ہوا کہ اس عرصے میں ہندوستان کے عوام پر کیا گذری اور انہوں نے کس صبر وتحمل سے ان مظالم کو برداشت کیا، جن کی تفصیل معلوم ہوتے ہیں ہر آدمی کانپنے لگتا ہے۔ گزشتہ سال ۱۹ر اپریل کو ترکمان گیٹ میں جو خونی ڈرامہ کھیلا گیا ہے اور جس کی تفصیلات کو دبانے کے لیے اس علاقے پر ۴۵ دن تک کرفیو لگایا گیا تھا، اس کا حال اب اخباروں کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے، تو یقین نہیں آتا کہ ہم بیسوی صدی کے رہنے والے ہیں۔ مسز گاندھی کی ایڈمنسٹریشن کے اہل کاروں میں سے ایک کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ جب ترکمان گیٹ کے مظلوموں نے صرف اتنی سی رعایت چاہی تھی کہ اب جب کہ اُن کے گھروں پر ہل چلا دیئے گئے ہیں، اُنہیں کسی موزوں جگہ پر اکٹھے ہی بسانے کا بندوبست کیا جائے۔ اتفاق سے ترکمان گیٹ کے تبارہ کاروں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی، اسی لیے اس افسر نے بڑی رعونت کے ساتھ کہا، کیا ایک پاکستان کو تباہ کر کے ہم تمہیں ایک اور پاکستان بنانے دیں گے۔ یہ جواب اُس انتظامیہ نے دیا تھا جس کی سربراہ مسز

اندرا گاندھی تھیں اور جنہوں نے ملک کی تقدیر اپنے فرزند سنجے کے حوالے کی تھی اور جنہوں نے اپنی طرف سے کسی بدنام روزگار عورت کو خون کی ہولی کھیلنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس کے بعد بھی مسز اندرا گاندھی اپنے انتخابی دوروں میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیتی تھیں کہ اگر اُن کی کانگریس ہار گئی تو جن سنگھ اور آر، ایس، ایس برسر اقتدار آئیں گے اور اس دیس سے مسلمانوں کا صفایا کر ڈالیں گے، ہمیں یاد ہے کہ جامع مسجد کے شاہی امام نے اُن دنوں کہا تھا کہ آر، ایس، ایس اور جن سنگھ کی مسلم دُشمنی کی باتیں ہم نے کانگریس والوں سے سُنی ہیں، مگر کانگریس نے جو کچھ ترکمان گیٹ میں کیا ہے وہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، بچوں، جوانوں، بوڑھوں، عورتوں، مردوں کا بے دریغ خون بہایا گیا، کروڑوں روپے کا مال لوٹ لیا، عورتوں کی عصمت دری کے بہیمانہ افعال کا ارتکاب کھلے عام کیا گیا۔ یہ سب کچھ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور ہم اپنی آنکھوں کو کیسے جھٹلا سکتے ہیں۔ اس درندگی اور بربریت کی سزا ہندوستان کی متحمل قوم نے دی اور اچھی طرح سے دی۔ آج سنجے گاندھی پر اپنی کرتوت سے خدا کی وسیع زمین اپنی پناہیوں کے باوجود تنگ ہوگئی ہے۔ ظلم اور رعونت کا انجام ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے۔

☆☆☆

جون ۱۹۷۷ء

۷۸ فیصدی ظلم ختم کیجیے

محترم شیخ صاحب نے اپنے دوسالہ دورِ حکومت میں ریاستی عوام میں خودداری کا احساس، غیرت کا جذبہ اور خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے یوں تو بہت سے اقدامات کیے، لیکن ایک ''کارنامہ'' جو اس عہدے کے کارناموں میں ''زریں'' کارنامے کا درجہ رکھتا ہے، شہر کے ہسپتالوں میں مریضوں کا دانہ پانی بند کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ جس طرح شیخ صاحب کو شہر کے کچھ رئیسوں نے یہ کہہ کر گمراہ کر دیا کہ شہر کے لوگ سستے داموں چاول، گندم اور شکر کی راشن حاصل کر کے مہنگے داموں اسے بازار میں بیچ کر منافع کماتے ہیں، اسی طرح کسی کم بخت نے اُنہیں یہ اطلاع بھی دی کہ شہر اور دیہات کے بہت سے لوگ صرف ہسپتالوں کا مرغن کھانا کھانے کے لیے ہسپتالوں میں داخل ہوتے ہیں۔ شیخ صاحب نے اس غلط بات کا اعتبار کر کے فوراً یہ حکم نافذ کر دیا کہ ہسپتالوں میں عام مریضوں کا کھانا بند کر دیا جائے، اور صرف ۲۲ فیصدی کو ہسپتال کا کھانا فراہم کیا جائے، ۲۲ فیصدی مریضوں کو کس معیار اور کس بنیاد پر یہ کھانا مہیا کیا جائے گا، اس کی اربابِ حکومت نے کوئی وضاحت نہیں کی اور نہ ڈاکٹر صاحبان ہی آج تک یہ منطق سمجھ پائے ہیں، نتیجہ یہ کہ دور دراز دیہات سے آنے والے سینکڑوں مریض ہسپتال کی چار دیواریوں میں دانے دانے

کے لیے ترستے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہسپتالوں میں مریضوں کو کھانا دینے کی یہ پچاس سالہ روایت کیوں اور کس بناء پر ختم کی گئی۔ عرصہ ہوا ہم نے شیخ صاحب کی خدمت میں یہ مودبانہ درخواست کی تھی کہ ہسپتالوں کا کھانا صرف وہی لوگ کھاتے ہیں کہ جو واقعی مجبور، مفلس اور نادار ہوتے ہیں اور جو لوگ اپنے گھروں سے کھانا لانے کی استطاعت رکھتے ہیں وہ ہسپتال کا کھانا کھانا معیوب سمجھتے ہیں، اس لیے ہونا یہ چاہئے کہ جو لوگ ہسپتال میں داخل کیے جائیں، ان میں سے ہر شخص کو کھانا فراہم کیا جائے، اور اگر کوئی مریض ہسپتال کی خوراک نہ کھانا چاہے تو اسے گھر سے کھانا لانے کی اجازت ہونا چاہیے، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ جب ۲۲ فیصدی مریضوں کو کھانا فراہم کرنے کے احکامات جاری کیے جاتے ہیں تو اس کے بعد کوئی کتنا ہی غریب، مفلس اور مستحسن مریض کیوں نہ آجائے، اسے ہسپتال سے کھانا نہیں ملتا، نتیجہ یہ کہ سینکڑوں کی تعداد میں غریب اور لاچار مریض جن میں زیادہ تر تعداد دیہاتیوں کی ہوتی ہے، اپنی خودداری اور غیرت بیچ کر بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے اس خطرناک حکم کا اطلاق امراض سینہ کے ان ہسپتالوں پر بھی ہوتا ہے کہ جہاں اچھی اور متوازن خوراک علاج کا حصہ ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس ناعاقبت اندیشانہ فیصلے سے کل ملا کر سال بھر میں تین یا چار لاکھ روپے کی بچت ہوتی ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ گورنر صاحب شیخ صاحب کی حکومت کے اس غلط اور تکلیف دہ فیصلے کو فوراً کالعدم قرار دے کر ہسپتالوں میں ہر مریض کو کھانا فراہم کرنے کے احکامات صادر کرے۔

☆☆☆

۲۲ راپریل ۱۹۷۷ء

عزت وآبرو کا تصوّر

دو ہفتے قبل سابق وزیر اعلیٰ جناب شیخ محمد عبداللہ نے نئی دہلی سے واپسی پر سرینگر میں ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ کسی قیمت پر بھی کشمیری عوام کی تقدیر جنتا پارٹی کے حوالے نہیں کر سکتے۔ شیخ صاحب کے اس بیان سے عام لوگوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ دہلی میں جنتا لیڈروں کے ساتھ شیخ صاحب کے مذاکرات میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے، اور وہ اس کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت کے متعلق پُر امید نہیں ہیں۔ اس کے دوسرے دن جب شیخ صاحب نے خانیار شریف میں تقریر کرتے ہوئے جنتا پارٹی پر کڑی تنقید کی تو اس سلسلے میں رہا سہا شبہ بھی دور ہو گیا کہ جنتا پارٹی اور شیخ صاحب کے درمیان کوئی قدر مشترک باقی نہیں رہی ہے۔ اس پسِ منظر میں یہ بات خاصی حیران کن ہے، کہ جنتا پارٹی کے سہ رکنی وفد کی سرینگر میں آمد پر جب شیخ صاحب کے ساتھ مذاکرات کا دوسرا دور شروع ہوا، تو شیخ صاحب نے ریاستی اسمبلی کے انتخابات کے بعد نیشنل کانفرنس کو جنتا پارٹی میں مدغم کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ شیخ صاحب کے رویے میں یہ غیر معمولی

تبدیلی ان کے اُس ذہنی رویے کی غماز ہے، کہ جس نے پچھلے دو سال سے ان کی سیاست کو اہل نظر کے لیے ایک معمہ بنا دیا ہے، وہ اگر ایک دن جنتا پارٹی کے ساتھ کسی قسم کے اشتراک کو کشمیری عوام کی تقدیر کا سودا کہتے ہیں تو پھر دوسرے دن نیشنل کانفرنس کو جنتا پارٹی میں مدغم کرنے کی پیش کش کس بنیاد پر کرتے ہیں؟ کیا نیشنل کانفرنس کی اپنی کوئی سیاست، اپنا کوئی موقف، کوئی نصب العین اور کوئی منزلِ مقصود نہیں ہے کہ وہ ہر وقت، ہر جماعت کے ساتھ نتھی ہونے کے لیے تیار رہتی ہے؟ کیا کشمیری عوام کی تقدیر اور عزت کا تصوّر اتنا محدود ہے کہ جب شیخ صاحب کے ساتھ مفاہمت اور مذاکرات ناکام ہو جائیں تو اس عزت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور جب پھر کسی مصلحت کے تحت وہ خود اس مفاہمت پر تیار ہو جائیں، تو کشمیری عوام کی عزت و آبرو بحال ہو جاتی ہے، عزت و آبرو اور تقدیر کا مفہوم آج نہیں تو کل بدلنا ہوگا ۔اور خود شیخ صاحب کو اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ نیشنل کانفرنس کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔موجودہ حالات میں نیشنل کانفرنس کا ذہنی انتشار میں مبتلا ہونا ناگزیر ہے۔

☆☆☆

۲/اپریل ۱۹۷۷ء

ڈور کی کوڑی

جے پرکاش نرائن نے مسٹر غلام محی الدین قرہ کے نام ایک مکتوب میں ریاست میں جنتا پارٹی کے قیام کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابھی تک کشمیر نے ہندوستان کے ساتھ ایک قسم کی علیحدگی کو قائم رکھا ہے اور یہاں کی سیاست کم وبیش ملک میں رونما ہونے والے اہم سیاسی تغیرات سے ہم آہنگ نہیں ہوئی ہے۔ جے پرکاش نرائن نے ریاست میں جنتا پارٹی کے قیام کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ اُمید ظاہر کی ہے کہ جنتا پارٹی اس خلیج کو پاٹنے میں کامیاب ہوگی، کہ جو ابھی تک کشمیر اور ہندوستان کے درمیان حائل رہی ہے۔ جے پرکاش نرائن کے اس خط میں نہ کہیں دفعہ ۳۷۰ کا ذکر ہے اور نہ انہوں نے بالواسطہ طور اس دفعہ کو ختم کرنے کی تحریک یا ترغیب دی ہے۔ انہوں نے جس دوری اور جس خلیج کا ذکر کیا ہے وہ اتنی واضح، اتنی نمایاں اور اس درجہ گہری ہے کہ اس کا احساس ہر ذی شعور ہندوستانی اور ہر صاحب نظر کشمیری کو ہے۔ جے پرکاش نرائن کا اشارہ اس جذباتی اور نفسیاتی کیفیت کی طرف ہے کہ جس نے کشمیری عوام کو ہندوستان کی سیاست اور ہندوستان میں رونما ہونے والے سیاسی تغیرات سے اس درجہ الگ تھلگ رکھا ہے کہ وہ آج تیس برس بعد بھی اپنے آپ کو اپنے ہی وطن میں اجنبی تصوّر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں حالیہ ایمرجنسی کے نفاذ اور اس کے تباہ کن اثرات کو لے لیجیے، پورے ملک میں عوام نے ظلم وستم کے اس نظام کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ

لڑی، لیکن کشمیر میں کانگریس اور نیشنل کانفرنس دونوں ہی جماعتیں ایمرجنسی کی برکتوں کی گردان کر رہی تھیں۔ اسی طرح شیخ صاحب نے نیشنل کانفرنس کو کانگریس میں مدغم نہ کرنے کے لیے جو وجوہات بیان کیں، اس میں سب سے زوردار اور موثر وجہ یہ تھی کہ کشمیر کی سیاسی تحریک کا ایک الگ کردار اور مزاج رہا ہے۔ جے پرکاش جی نے اپنے خط میں اسی سیاسی خلیج کا ذکر کیا ہے لیکن وادی کے کچھ کانگریسی اور نیشنل کانفرنسی لیڈروں نے اس بے ضرر اور حقیقت افروز بیان میں نہ معلوم دفعہ ۳۷۰ کو ختم کرنے کی سازش کا کہاں سے سراغ لگایا اور انہوں نے اس سلسلے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کی ایک مہم شروع کر دی ہے۔ نیشنل کانفرنسی حلقے چونکہ فی الحال جے پرکاش نرائن کو ناراض نہیں کرنا چاہتے، اس لیے وہ سرگوشیوں میں اپنی مہم چلا رہے ہیں لیکن پردیش کانگریس کے سقراط دھڑا دھڑ بیانات جاری کر کے یہ تاثر دینے لگے ہیں کہ دفعہ ۳۷۰ کی حفاظت کے لیے خون کا آخری قطرہ بہانے کے لیے تیار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مرکز کی جنتا حکومت نے دفعہ ۳۷۰ کے متعلق اپنی پوزیشن بالکل واضح کر دی ہے اور پچھلے دنوں پارلیمنٹ میں وزیر خارجہ اٹل بہاری باجپائی نے بڑی صفائی کے ساتھ یہ اعلان کیا آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ کو کشمیری عوام کی مرضی اور منشاء کے مطابق قائم رکھا جائے گا۔ اس کے بعد اس سلسلے میں کسی تشویش یا پریشانی کی گنجائش نہیں اور یہی وجہ ہے کہ نیشنل کانفرنسی اور کانگریسی رہنما اب معمولی باتوں کا بتنگڑ ابنا کر ریاستی عوام کے ذہن میں انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں، ہمیں امید ہے کہ ریاست کے باشعور عوام ان ریشہ دوانیوں سے خبردار رہیں گے۔

☆☆☆

۱۵ر اپریل ۱۹۷۷ء

جنتا پارٹی

جنتا پارٹی کے سہ رکنی وفد کے رہنما شری اشوک مہتا نے کل بعد دوپہر سرینگر میں اس بات کا انکشاف کیا کہ ریاست میں آئندہ دو تین دنوں کے اندر اندر جنتا پارٹی کے قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیا جائے گا۔ شری مہتا نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ قومی سطح پر جنتا پارٹی کسی دوسری پارٹی سے انتخابی مفاہمت یا سمجھوتے کی قائل نہیں ہے اور ریاست میں بھی اسی پالیسی پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں انہوں نے نیشنل کانفرنس کے ساتھ کسی قسم کے سمجھوتے کو خارج از بحث قرار دیا ہے۔ ریاست کی سیاسی تاریخ میں یہ واقعہ غیر معمولی اہمیت اور دوررس نتائج کا حامل ہے اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ آج کے بعد کشمیر کی سیاست کا دھارا بدل جائے گا۔ انتخابات میں کس جماعت، گروہ یا لیڈر کو اکثریت حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی زیادہ اہمیت نہیں ہے، لیکن اس بات کی اہمیت ضرور ہے کہ کشمیر میں جمہوریت اور شریفانہ سیاست کے استحکام سے دلچسپی رکھنے والے عناصر اور قوتیں متحد ہو کر ان طاقتوں کے خلاف صف آراء ہوں گی کہ جنہوں نے گذشتہ تیس سال کے دوران ریاست کی سیاست کو اپنی ذاتی وجاہت اور وقار کے لیے استعمال کیا ہے، اور جو آج بھی اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے اقدار کا خون کرنے پر تیار ہیں۔ جنتا پارٹی نہ ریاست کے سارے دکھوں کا علاج ہے اور نہ ہر زخم کا مرہم لیکن یہ شخص پرستی اور بت تراشی کے خلاف ایک اعلان

جنگ ہے اور اس کے قیام سے کچھ نئی کھڑکیاں اور نئی راہیں کھلیں گی۔ ریاست میں کانگریس کی توسیع ایک ایسے سیاسی، اور نفسیاتی پس منظر میں ہوئی تھی کہ بارہ سال کے بعد بھی کانگریس کو یہاں قبولِ عام حاصل نہ ہو سکا اور وہ حکمران جماعت تو بنی رہی، لیکن لوگوں کے دلوں پر حکومت نہ کر سکی۔ اس کے برعکس جنتا پارٹی یہاں کے عوام کی خواہشات اور ان کے مطالبات کی تکمیل کے نتیجے میں قائم ہو رہی ہے، اور مرکزی پارٹی کے سرکردہ رہنماؤں نے اس بات کا اطمینان کر لیا ہے کہ پارٹی کے یونٹ قائم کیے جانے کی خواہش قومی زندگی کے دھارے میں شامل ہونے کی شدید خواہش کا نتیجہ ہے۔ نیشنل کانفرنس کی قیادت کا اس فیصلے پر اپنی ناراضگی اور پسندیدگی کا اظہار کرنا غیر متوقع نہیں اور ہمیں ہفتہ عشرہ تک شیخ صاحب اور ان کے ساتھیوں کی زبانی جنتا پارٹی کے ''فرقہ ورانہ'' کردار پر بھاشن سننے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہ الگ سوال ہے کہ خود شیخ صاحب اور ان کے ساتھیوں نے جنتا پارٹی سے مفاہمت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بات دراصل یہ ہے کہ جنتا پارٹی کے قیام کے بعد ریاست کی سیاست اور حکومت پر نیشنل کانفرنس کی اجارہ داری ختم ہونے کا امکان ہے اور ہر اجارہ دار اپنی اجارہ داری کو قائم رکھنے کے لیے ہر جائز اور ناجائز حربہ استعمال کرنے سے گریز یا پرہیز نہیں کرتا۔ انتخابات کے نتائج کچھ بھی ہوں، ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ ریاست کی سیاست میں ایک نئے انقلاب کی آمد آمد ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ انقلاب صحیح معنوں میں ریاستی عوام کے لیے ایک نئی صبح اور ایک نئے مستقبل کا عنوان ثابت ہو گا۔

☆☆☆

۱۹/اپریل ۱۹۷۷ء

باپ بیٹا

شیخ محمد عبداللہ نے دوبارہ کشمیر کی حکومت سنبھالتے ہی کچھ ایسے اقدامات کیے جن کو دیکھ کر اُن کے نیاز مند بھی حیران رہ گئے ہیں۔ اِن کارناموں میں ایک بہت بڑا کارنامہ طارق عبداللہ کو ٹورسٹ کارپوریشن کی مینجنگ ڈائریکٹری پر متعین فرمانا تھا، واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں خود شیخ صاحب کا ضمیر بھی اُن کی ملامت کرتا تھا اور انہیں اپنی داڑھی میں تنکا نظر آتا تھا۔ چنانچہ طارق عبداللہ کے حکمِ تقرر میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ یہ فیصلہ سابق حکومت نے کیا تھا۔ اُس وقت پوچھنے والوں نے پوچھا تھا کہ سابق حکومت نے جو فیصلے کیے تھے، کیا اُن سب پر شیخ صاحب کی حکومت نے عمل درآمد کیا تھا۔ مثال کے طور پر قاسم حکومت نے جموں میں بعض لوگوں کو رہائشی پلاٹ الاٹ کیے تھے۔ شیخ صاحب کی حکومت نے عنانِ اختیار سنبھالتے ہی اسے کالعدم قرار دیا اور اسے جانب داری اور اقرباء پروری کی بدترین مثال قرار دے کر اپنی پیش رو حکومت پر کافی چوٹیں کیں۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ اگر سابق حکومت کے کچھ فیصلے شیخ صاحب نے قبول بھی کیے تو کیا اُن کے متعلق احکام نافذ فرماتے وقت ہر حکم کے ساتھ یہ تصریح کی گئی تھی کہ سابق حکومت کا فیصلہ ہے؟ اگر نہیں تو صرف طارق عبداللہ کے تقرر کے احکام میں اس صراحت کو کیوں ضروری سمجھا گیا، اگر داڑھی میں تنکا نہ تھا؟ ظاہر ہے کہ اس تقرر کو کشمیر کے عوام نے ایک کھلی ہوئی کنبہ پروری سمجھا، اور اکثر حلقوں میں اس پر لے دے بھی ہوئی۔ مجاہد منزل کے ایک اجلاس میں شیخ صاحب نے اس تنقید کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ

طارق عبداللہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ جوان ہے، لندن سے بیرسٹری کر آیا ہے، کیا اُسے محض اس بناء پر نظر انداز کرنا چاہیے کہ میں اس کا باپ ہوں، اس کے جواب میں کہا گیا تھا، طارق عبداللہ جتنا تعلیم یافتہ ہے اتنے ہی تعلیم یافتہ ہزاروں بے کار اسی ریاست میں ملیں گے، اور یہ کہ شیخ صاحب ثابت کریں کہ طارق عبداللہ نے بیرسٹری بھی کی ہے، اگر ان ہزاروں گریجویٹوں کو کوئی گھاس نہیں ڈالتا تو طارق عبداللہ میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ اُسے ایک محکمے کا افسر اعلیٰ بنایا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان کی سب سے بڑی قابلیت یہ ہے کہ وہ آپ کا بیٹا ہے ان باتوں کا جواب شیخ صاحب سے نہ بن پڑا۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ ہر جلسے میں تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو تلقین فرماتے رہے کہ وہ سرکاری نوکریوں کا خیال چھوڑ دیں، یہ تلقین اس لیے کی جا رہی تھی کہ خود شیخ صاحب اپنے تعلیم یافتہ بیٹوں کی طرف سے بے فکر ہو گئے تھے۔ اس تقرر کے بعد طارق عبداللہ نے جو قیامت برپا کی، اور اس بدقسمت محکمے میں جو تاناشاہی چلائی، اس کی تفصیل ان غریبوں کو معلوم ہے جنہوں نے طارق عبداللہ کے مستعفی ہونے پر چراغاں کر کے اور گھروں میں درودِ نجات پڑھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ آج شیخ صاحب سے ہر شخص یہ سوال پوچھنے کا حق رکھتا ہے کہ طارق عبداللہ کا تقرر اگر صاف ستھرا تھا اور اس میں کوئی بدنیتی نہ تھی تو باپ بیٹا دونوں ایک ہی دن مستعفی کیوں ہو گئے۔ شیخ صاحب کی وزارت ختم ہونے کے بعد طارق عبداللہ ایک دن بھی اپنے عہدے پر قائم کیوں نہ رہ سکے، شیخ صاحب کو اپنی مخصوص منطق استعمال کر کے اس کا جواب ضرور دینا چاہیے۔

☆☆☆

۱۱/اپریل ۱۹۷۷ء

بیگ صاحب کا لطیفہ

مرزا محمد افضل بیگ اپنی ظرافت اور لطیفہ گوئی کے لیے مشہور ہیں، حسبِ معمول انہوں نے کل ہی ایک لطیفہ تصنیف کیا۔ وہ یہ تھا کہ انہوں نے گورنر سے ضروری اشیاء کی قیمتوں میں کمی کرنے کا مطالبہ کیا اور فرمایا کہ قیمتوں میں بے تحاشا اضافہ اور اشیاءِ ضروری کی ہوشربا گرانی سے عوام بڑی تکلیف میں ہیں۔ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ ابھی کتنے دن ہوئے کہ حکومت آپ کے ہاتھوں سے نکل چکی ہے اور اپنے پچیس ماہ کے دورِ اقتدار میں آپ نے اس سلسلے میں کون سا معجزہ کر دکھایا تھا۔ اسی پچیس ماہ دورِ حکومت کا کارنامہ یہ بھی ہے کہ پانچ کلو چاول تیس روپے میں بکا۔ اسی زرّیں عہد میں کھانے کے تیل کی قیمت تیرہ اور چودہ روپے فی کلو ہو گئی تھی، اس زمانے میں بھی لوگ چیختے اور چلاتے رہے کہ جینا مشکل ہو گیا ہے مگر بیگ صاحب اور اُن کے رفقاءِ کار ہمیشہ ایک ہی جواب دیتے رہے کہ قیمتوں کا معاملہ ریاستی معاملہ نہیں، ملک کے باقی حصوں میں بھی گرانی کا دور ہے جب تک وہاں حالت نہ سدھرے، ریاست میں کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اس پچیس ماہ کے عرصے میں قیمتیں بڑھتی گئیں اور بیگ صاحب کچھ نہ کر سکے۔ بلکہ اپنی قانونی موشگافیوں کی مدد سے اس کا جواز اسی طرح پیش کرتے رہے، جس طرح وہ بائیس سال تک رائے شماری کی ہانک لگانے کے بعد ایکارڈ کا سجدہ سہو دینے پر تیار ہوئے، جس طرح

انہوں نے ایک طرف تو دفعہ ۲۷۰ کو صفیحۂ آسمانی کی طرح مقدس اور نا قابل تنسیخ سمجھا تو دوسری طرف بیالیسویں ترمیم کی توثیق کر کے اس کا جنازہ نکال دیا۔ ایک طرف اندرونی خودمختاری کو اپنا جزو ایمان قرار دیتے رہے اور دوسری طرف لینڈ گرانٹس بل کی حمایت میں وہ قانونی نکتے پیدا کیے کہ خود اُن کا ضمیر بھی ان دلائل سے مطمئن نہ تھا۔ اب پچیس ماہ تک حکومت کرنے کے بعد وہ گورنر سے مطالبہ کرتے ہیں کہ قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ ان کی روک تھام کرلو، یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بیگ صاحب کو کبھی اپنے ضمیر کو ٹٹولنے کی مہلت بھی ملتی ہے یا نہیں، یا واقعی ان کا ضمیر کہیں ہے بھی یا نہیں۔ اگر واقعی اُن کا ضمیر ہے اور اس میں زندگی کے کچھ آثار باقی ہیں تو اُن کو اپنی زندگی پر ایک سرسری نظر ضرور ڈالنی چاہیے، اور دیکھنا چاہیے کہ کیا زندگی کے ان آخری لمحات میں بھی انہیں اعتراف حق کرنا چاہیے یا نہیں۔ قیمتوں کا مسئلہ عوام کا مسئلہ ہے اور اس مسئلے نے واقعی عوام کی زندگی ناممکن بنا دی ہے۔ عوام کو حق ہے کہ وہ حکومت سے قیمتوں کو متوازن بنانے کا پُرزور مطالبہ کریں، مگر ان لوگوں کو یہ مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں جو خود اس عوام دشمن پالیسی کے ذمہ دار بلکہ خالق ہیں۔ بیگ صاحب کا خیال ہے کہ صرف چار پانچ ہفتے کے اندر ان کے پچیس ماہ کے کار نامے عوام کے ذہن سے اتر گئے ہوں گے، عوام کا حافظہ روایتی طور پر کمزور ہوتا ہے، مگر سارے ملک کے عوام جب انیس ماہ کے تشدّد کو بھول نہ سکے تو ریاستی عوام پچیس ماہ کی تاناشاہی کو کیسے بھول سکتے ہیں

☆☆☆

۶ رمئی ۱۹۷۷ء

محبت، جنگ اور سیاست

کہتے ہیں محبت اور جنگ میں سب کچھ روا ہے۔اب اس میں سیاست کا اضافہ کرنا چاہیے کیونکہ شیخ محمد عبداللہ کے طرز عمل نے یہ بات ثابت کی ہے کہ سیاست میں بھی سب کچھ روا ہے۔ یہ شیخ صاحب ہی ہیں جنہوں نے پچھلے سال نہ صرف جموں میں مسز اندرا گاندھی زندہ باد کے نعرے لگائے ساتھ ہی لوگوں سے یہ بھی کہا کہ اس کا جواب اس زور سے دیں کہ دلی میں ان کی گونج سُنائی دیں۔اب صرف ایک سال کے بعد شیخ صاحب کا فرمان ہے کہ مسز اندرا گاندھی ڈکٹیٹر تھیں اور ہندوستان کو تباہی کی راہ پر لے جا رہی تھیں۔ کچھ عرصے پہلے شیر کشمیر میڈیکل انسٹی چیوٹ میں مسٹر بروا آئے تھے،ان کی شان میں بھی شیخ صاحب نے نعرے لگائے،اور یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ ایشیاء کا بلند ستارا نہیں بلکہ رحمان سوداگر ہے،جس کا قد اچانک لمبا ہو گیا ہے۔اسی کانگریس کے بارے میں شیخ صاحب کا ارشاد ہے کہ یہ ایک فسطائی جماعت ہے، کہ جس کانگریس کی حمایت سے وہ ۲۵ ماہ تک کشمیر کے بلا وجہ وزیر اعلیٰ رہے کل تک وہ اس کی ناز برداری فرماتے تھے مگر جب کانگریس والوں نے اپنی حمایت واپس لینے کا اعلان کیا اور شیخ صاحب کا سنگھاسن ڈول گیا تو وہی کانگریسی دوسرے دن بے ایمان اور نہ معلوم کیا کیا بن گئے۔عوام کا حافظہ کمزور ضرور ہوتا ہے مگر اس کے باوجود اُن کو یہ بھی یاد ہے کہ یہ وہی کانگریس ہے جس کے خلاف شیخ

صاحب نے صرف چند سال پہلے ترک موالات کا اعلان بھی فرمایا تھا، بہر حال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شیخ عبداللہ نے سیاست کو جنگ اور محبت میں شامل کیا ہے، جہاں سب کچھ روا ہے۔ ان کی سیاست دُنیا بھر کی سیاست سے مختلف ہے اور یہ سیاست صرف ایک ہی محور کے گرد گھوم رہی ہے اور یہ محور ہے کہ اُن کو کشمیر کے سیاہ سفید کا مالک بنا دیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ مفتی سعید اور سید میر قاسم کے ممنونِ احسان بھی ہو سکتے ہیں، مسز اندرا گاندھی کے دور اقتدار میں اُن کو ساری دُنیا کا سب سے بڑا لیڈر قرار دے سکتے ہیں اور وہ جونہی اقتدار سے محروم ہو جائیں تو وہ ڈکٹیٹر شپ کی علامت بن جاتی ہیں ۔مسٹر بروا کی شان میں نعرے بلند کر سکتے ہیں اور جب اُن پر افتاد آ پڑے تو انہیں گالیاں بھی دے سکتے ہیں، کہتے ہیں جوں جوں انسان کی عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے تو اسے اپنی منزل قریب تر نظر آنے لگتی ہے اور وہ عمر رفتہ پر ایک نظر ڈال کر اپنی کوتاہیوں پر پشیمان بھی ہو جاتا ہے لیکن شیخ صاحب کے متعلق یہ صحیح نہیں ۔اُن کی عمر میں ایک ایک دن کا اضافہ ہوسِ اقتدار کا نیا پیام لاتا ہے اور وہ کشمیر کی چیف منسٹری کو متاع دین و دنیا بنانے کے لیے اپنا ماضی، حال اور مستقبل، اپنا ننگ و نام سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں، اور کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے کہ دنیا کیا کہتی ہے کہ عمر کے اس مرحلے پر حرص و ہوا کا اس شدت سے حملہ آور ہونا کچھ اچھی علامت نہیں .... خدا خیر کرے۔

☆☆☆

۲؍اپریل ۷۷ء

اِک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں

فروری ۵ ۷ ۱۹ء سے پہلے اور فوراً بعد کچھ دنوں تک جناب شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ خلوت و جلوت میں اس بات پر تشویش کا اظہار فرماتے تھے کہ ریاست کی اقتصادی حالت بہت خراب کر دی گئی ہے، اور گذشتہ بیس برس میں ایسے اقدامات کیے گئے ہیں جن سے ریاست کی اقتصادی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ ریاست کی آمدنی اگر پچاس کروڑ روپے ہے تو سرکاری ملازموں کی تنخواہوں پر پچپن کروڑ روپیہ صرف ہوتا ہے۔ بیس سال پہلے ریاست کے دو صوبوں میں دو ڈی، آئی جی پولیس ہوا کرتے تھے آج ان کی تعداد نصف درجن یا اس سے زیادہ ہے۔ چیف انجینئر دو ہوا کرتے تھے اور آج ایک درجن سے زیادہ چیف انجینئر اپنے عہدوں پر براجماں ہیں۔ جس دفتر میں دس کلرکوں کی ضرورت ہے وہاں پچاس کلرک بیٹھے ہیں اور ان کا کام گپیں ہانکنے اور تنخواہ وصول کرنے کے علاوہ کچھ نہیں، سرکاری ملازموں کی اس ریل پیل نے بدعنوانی اور رشوت ستانی کے دروازے کھول رکھے ہیں۔

مرکز کی طرف سے آئی، اے، ایس، آئی، پی، ایس اور آئی، ایف، ایس افسروں کی ایک پوری پلٹن ریاست پر مسلط کر دی گئی ہے اور اُن کی بیش تر تنخواہیں ریاستی خزانے کو ادا کرنا پڑ رہی ہیں۔ جس سے ریاست کا دیوالیہ پٹ گیا ہے۔ سیاسی رشوت کے طور پر لوگوں کو سستے چاول فراہم کیے جا رہے ہیں اور اس طرح ریاست کی معشیت کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ ریاست دیوالیہ ہو چکی ہے اور اس حالت میں ہم سے کہا جا رہا ہے کہ ریاست کی ڈوبتی ناؤ کے کھیون

ہار بن کر اس کو اپنے ہاتھ میں لے لو۔ جب کہ صورت یہ ہے کہ ریاست کا بال بال قرضے میں ڈوبا ہوا ہے۔ موجودہ نسل کی تو خیر بات ہی نہیں، آنے والی کئی کئی نسلیں اگر اس قرض کا صرف سود ادا کرنے بیٹھیں تو ادا نہ کر سکیں۔ یہ وہ پاکیزہ خیالات تھے، جن کو سن کر ہر شخص سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا، اور خیال تھا کہ شیخ صاحب اور بیگ صاحب جونہی زمام اقتدار اپنے مبارک ہاتھوں میں لے لیں گے تو وہ ریاست کی خوشحالی اور معاشی بہبودی کی طرف فوری توجہ دیں گے اور اس بھیانک صورت حال کا تدارک کرنے کی طرف فوری اقدام کریں گے۔

۲۵ر فروری ۷۵ء کو جب اقتدار شیخ صاحب کے ہاتھ میں آ گیا تو لوگوں کے دل پُر امید تھے اور خیال تھا کہ ایک طویل اور تاریک رات کی سحر نمودار ہونے والی ہے، پچیس ماہ تک برسر اقتدار رہنے کے باوصف نہ صرف یہ کہ ان برائیوں کو دور کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی بلکہ ذاتی شاہ خرچیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور اگر کبھی کسی نے فروری ۷۵ء سے قبل کے خیالات یاد دلانے کی جرأت کی تو اُسے بتایا گیا کہ ریاستی اسمبلی میں اکثریت کانگریسیوں کی ہے، اور وہ کچھ کرنے نہیں دیتے۔ مارچ ۷۷ء میں انتخابات ہوئے اور نیشنل کانفرنس کو بھاری اکثریت ملی اور ان وعدوں کے ایفا کی پہلی قسط تقریباً تیس منسٹروں کی ایک رجمنٹ کی صورت میں عطا ہوئی، قوم کے لیے اٹھانوے کروڑ روپے کا ایک اور بھاری بھرکم قرض حاصل کر کے ریاست کی ڈوبتی ناؤ کو ساحل مراد پر لے جانے کا مقدس فریضہ انجام دینے کی طرف ایک اور قدم اٹھایا گیا، آنے والے پانچ برس میں کیا ہوگا۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔

☆☆☆

۲۵ر اگست ۱۹۷۷ء

لوٹنا ۱۹۵۳ء کی طرف

جماعت اسلامی کے بعض رہنماؤں نے چند دن قبل سوپور میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ وہ ریاست کو ۱۹۵۳ء کی سطح تک لے جانے میں شیخ صاحب کے ساتھ ہر ممکن تعاون کریں گے۔ ایک اطلاع کے مطابق ریاستی اسمبلی کے لیے منتخب شدہ پارٹی کے اکلوتے ممبر سید علی گیلانی نے اس مقصد کے لیے اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں ایک بل پیش کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نیشنل کانفرنس کی طرف سے حالیہ انتخابی مہم کے دوران یہ بات بار بار دہرائی گئی کہ اگر نیشنل کانفرنس برسر اقتدار آجائے تو وہ ریاست کو سیاسی اور انتظامی اعتبار سے ۱۹۵۳ء والی پوزیشن پر لے جائے گی۔ کچھ لوگوں کے خیال میں نیشنل کانفرنس کی غیر معمولی اور غیر متوقع کامیابی میں اس یقین دہانی کا عمل دخل ہے۔

انتخابی مہم کے دوران جو دلیلیں اور حربے اور ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں ان کے متعلق شیخ صاحب نے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اُٹھاتے ہوئے ایک بڑی بلیغ بات کہی، انہوں نے کہا کہ محبت اور جنگ میں ہر چیز جائز ہے۔ اور آج کے بعد سے ہم اچھے بچوں کی طرح رہیں گے۔ نیشنل کانفرنس نے اپنی انتخابی مہم کے دوران صرف ۱۹۵۳ء کی سیاسی پوزیشن کا ہی تذکرہ نہیں کیا، رائے شماری اور راولپنڈی روڈ کھولنے کے خوبصورت نعروں کا بھی سہارا لیا۔

لیکن یہ سارا اسلحہ جو اس جنگ میں استعمال کیا گیا، جنگ کے خاتمے کے بعد محض ایک تاریخی یاد کے طور پر ہی محفوظ رکھا جا سکتا ہے اور وہ لوگ جو امن کے دور میں اس جنگی اسلحہ سے کام لینے کی ترغیب دیتے ہیں، ان کی یا تو نیت خراب ہے یا دماغی توازن بگڑا ہوا ہے اور جماعت اسلامی والوں کے متعلق میری دیانت دارانہ رائے ہے کہ اس معاملے میں ان کی نیت میں فتور ہے، انہیں نہ تو ۱۹۵۳ء کی سیاسی پوزیشن سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ اس بات سے کہ سیاسی سطح پر کشمیر کا کیا بنتا ہے۔ وہ صرف شیخ صاحب کو طعنے دے دے کر انہیں اس بات پر اکسانا چاہتے ہیں کہ وہ کس طرح مرکزی حکومت سے متصادم ہوں اور ریاست میں ۱۹۵۳ء کے سیاسی حالات پیدا ہو جائیں۔ جماعت اسلامی کے مومنوں کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں کہ شیخ صاحب ایک تجربہ کار سیاست دان اور جہاں دیدہ حکمران ہیں، وہ جماعت اسلامی کے ارادوں سے بھی واقف ہیں اور اپنی سیاسی مجبوریوں اور مشکلات سے بھی آگاہ، وہ جانتے ہیں کہ ۱۹۵۳ء کی حیثیت تک جانا، خالص آئینی اور قانونی مسئلہ نہیں ایک اہم سیاسی مسئلہ ہے اور اس قسم کے مطالبے سے بڑی دشواریاں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ شیخ صاحب اور ان کے ساتھیوں نے انتخابی مہم کے دوران جو کچھ بھی کہا ہو، حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد انہیں بڑے محتاط اور ذمہ دارانہ طریقے پر قدم اٹھانا ہوگا۔ وہ یقیناً کسی کے بھڑکانے اور بہکانے سے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے کہ جس سے آئینی تعطل یا سیاسی پیچیدگی پیدا ہونے کا احتمال ہو۔

☆☆☆

۲۰/جولائی ۱۹۷۷ء

آل انڈیا ریڈیو

دلی میں جنتا پارٹی کے حکومت سنبھالنے کے بعد رام لیلا گراؤنڈ میں ایک جلسہ عام ہوا جس میں وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی، شری جگ جیون رام اور دوسرے رہنماؤں نے تقریریں کیں، ان رہنماؤں میں مسٹر جارج فرنڈیز بھی تھے، آج انہوں نے اس بات پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو نے اس جلسے کی کاروائی براہِ راست رام لیلا گراؤنڈ سے ریلے کی۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ ایک پارٹی کا اجلاس تھا۔ حکومت کی کاروائی نہ تھی، کسی پارٹی کے اجلاس کا آنکھوں دیکھا حال ہی نہیں بلکہ پوری کاروائی کو آل انڈیا ریڈیو کے ذریعہ سارے ملک میں پہنچانا ایک غلط بات ہے اور ہم کانگریس کی حکومت کے دوران اس بات پر زبردست احتجاج کرتے رہے ہیں۔ مسٹر فرنڈیز کا یہ طرزِ عمل بے حد صحت منداور یہ طرزِ فکر بہت صالح ہے۔ آل انڈیا ریڈیو، دور درشن اور حکومت کے باقی پبلسٹی کے ذرائع حکومت کے کاموں اور کارناموں پر روشنی ڈالنے کے لیے استعمال کیے جانے چاہئیں، ایک خاص پارٹی کو محض اس وجہ سے کہ وہ حکومت پر قابض ہے، یہ امتیاز حاصل نہیں ہونا چاہئیے کہ اُس کے جلسے کی رُودادیں ان ذرائع کو کام میں لاکر مشتہر کی جائیں۔ جنتا پارٹی والے واقعی کانگریس پر الزام لگا رہے تھے کہ وہ ان مواصلاتی ذرائع کو پارٹی کے استحکام اور شخصیتوں کو مقبول بنانے کے سلسلے میں استعمال کر رہے ہیں۔

آج اگر جنتا پارٹی والے خود وہی کرنے لگیں تو ظاہر ہے کہ اُن کے قول وفعل کا یہ تضاد اُن کے حق میں نہیں جائے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ گذشتہ دس برس میں آل انڈیا ریڈیو اور دوسرے مواصلاتی ذرائع کو مسز اندرا گاندھی اور سال بھر کے لیے مسٹر سنجے گاندھی کی شخصیت کو تعمیر کرنے کے سلسلے میں بے تحاشا استعمال کیا گیا اور مختلف جماعتوں نے اس پر لگاتار احتجاج بھی کیا۔ خود الیکشن کے دوران بھی مسز اندرا گاندھی کے لیے جتنا وقت مقرر ہوتا تھا وہ تمام مخالف جماعتوں کے لیے وقف کردہ وقت سے بھی زیادہ ہوتا تھا، اور اس وجہ سے آل انڈیا ریڈیو کو آل اندرا ریڈیو کا نام دیا گیا تھا۔ جنتا پارٹی نے اقتدار سنبھالنے کے روز سے ہی اس ادارے کو پارٹی پروپیگنڈے کے لیے استعمال کیا، مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ اس پارٹی میں مسٹر جارج فرنانڈیز ایسے نڈر، صاف گو اور بے باک رہنما موجود ہیں جنہوں نے فوراً اس بات پر اعتراض کیا اور صاف صاف بتایا کہ ہم وہی کچھ کرنے لگے ہیں جن کے خلاف کل تک ہم جہاد کر رہے تھے، جنتا پارٹی میں جب تک ایسے بے باک اور نڈر افراد ہوں گے، اور وہ غلط کاموں پر کھلے عام ٹوکتے رہیں گے، وہ صحیح راہ سے بھٹک نہیں سکے گی اور آئندہ کے لیے اس طرح ایک ایسی روایت قائم ہوگی جس میں کسی ایک پارٹی یا فردِ واحد کو اپنی شخصیت تعمیر کرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔

☆☆☆

۸رمئی ۱۹۷۷ء

گیلانی صاحب کو رہا کیجیے

بارہ مولہ کے پارلیمانی حلقۂ انتخاب میں نیشنل کانفرنس کے اُمیدوار خواجہ عبدالاحد وکیل اور سید علی گیلانی کے درمیان براہِ راست مقابلے نے اس انتخابی معرکے کی اہمیت اور دلچسپی میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے اور توقع ہے کہ آئندہ چند دنوں میں بارہ مولہ کی سرزمین پر گھمسان کا رن پڑے گا۔ اس انتخابی مقابلے کا ایک قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ نیشنل کانفرنس اُمیدوار کے مدِ مقابل آزاد اُمیدوار سید علی گیلانی میسا کے تحت نظر بند ہیں اور اُنہوں نے جیل سے ہی اپنی نامزدگی کے کاغذات داخل کیے ہیں اور ان کی عدم موجودگی میں ان کی انتخابی مہم ان کے رفقاء اور ہمدرد چلا رہے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ سید علی گیلانی کس جرم کی پاداش میں نظر بند ہیں اور نہ ریاستی حکومت نے ابھی تک اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ان کی گرفتاری اور نظر بندی کا کوئی قانونی جواز ہے بھی یا نہیں؟ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ گیلانی صاحب ممنوعہ جماعت اسلامی کے ایک سرکردہ رکن ہیں اور جماعت پر پابندی عائد ہونے کے فوراً بعد انہیں دوسرے جماعتی رہنماؤں کے ساتھ نظر بند کیا گیا تھا، لیکن اس کے بعد جب دوسرے جماعتی رہنماؤں کو رہا کر دیا گیا تو گیلانی صاحب بھی رہا ہو گئے، بعد میں انہیں کن حالات میں اور کن اسباب کی بناء پر دوبارہ نظر بند کیا گیا، اس کا علم اربابِ اقتدار کے علاوہ کسی کو نہیں۔ بہر کیف ایک بات طے

ہے کہ گیلانی صاحب پر کوئی ایسا الزام ابھی تک عائد نہیں ہوا کہ جس کی بناء پر ان کی رہائی کو ناممکن یا مشکل قرار دیا جائے۔ آج اُن کی حیثیت ایک اُمیدوار کی ہے اور ملک بھر میں تشدد کے مجرموں کے سوا ان تمام سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں کو رہا کر دیا گیا ہے کہ جو حالیہ انتخابات میں بطور اُمیدوار کھڑے ہوئے ہیں۔ انتخابات کو آزادانہ، منصفانہ اور انتخابی عمل کو قابل اعتبار بنانے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے اور وزیر اعظم مسز گاندھی مبارک باد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے انتخابی اُمیدواروں کو غیر مشروط طور پر رہا کر کے ایک اچھی روایت قائم کی ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ ریاستی حکومت کم از کم اس معاملے میں مرکزی حکومت کی تقلید کر کے گیلانی صاحب کو رہا کر دے، تا کہ اُنہیں اپنی انتخابی مہم چلانے میں کسی دشواری کو سامنا نہ کرنا پڑے اور وہ اپنے مد مقابل کے مقابلے میں کسی قسم کی کوتاہی کا شکار نہ ہوں۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ شہری آزادی، جمہوریت اور برابری کے دعویداروں کو یہ معمولی سیاسی آداب سکھانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نیشنل کانفرنس کے لیے انتخابی مہم کا آغاز کرنے سے پہلے گیلانی صاحب کو غیر مشروط طور رہا کرنے کے احکامات جاری کریں گے، اگر اس ریاست میں راشٹریہ سیوک سنگھ کے پرچارکوں کو انتخابی مہم میں حصہ لینے کی آزادی ہے تو پھر گیلانی صاحب کو اس حق سے کیوں محروم کیا جا رہا ہے۔

☆☆☆

۲۷رفروری ۱۹۷۷ء

امام صاحب کا گناہ

جب سے جامع مسجد دہلی کے شاہی امام سید عبداللہ بخاری نے حکمران جماعت کے خلاف اپنی آواز بلند کی ہے، سرکاری نشر و اشاعت کے تمام ذرائع بے تحاشا اس کے خلاف استعمال کیے جا رہے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو صبح سے شام تک امام صاحب کے خلاف ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے بیانات نشر کر رہا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکمران کانگریس کی نگاہوں میں امام عبداللہ، جے پرکاش نرائن، مرار جی ڈیسائی اور جگ جیون رام سے بھی زیادہ اہم اور خطرناک ہیں اور اور اس لیے انہیں بدنام کرنے اور ہدف ملامت بنانے کا ہر حربہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امام صاحب پر اپنے مذہبی منصب کا غلط اور ناجائز استعمال کرنے کا الزام لگا دینے والے خود ہر قسم اور قماش کے مولویوں سے اپنی حق میں بیانات جاری کروا رہے ہیں اور ستم بالائے ستم ایک مولوی صاحب سے باقاعدہ ایک سیاسی سمجھوتہ بھی طے پایا ہے کہ جس کی رو سے مسلمانوں کے بہت سے دیرینہ مطالبات بھی تسلیم کیے گیے ہیں اور ان کے بہت سے مسائل حل کرنے کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔ غضب یہ ہے کہ خانہ ساز ادبی اور ثقافتی انجمنوں کے فرضی عہدے داروں سے بھی امام

صاحب کے خلاف بیانات دلوائے جا رہے ہیں اور حکومت کی ساری مشینری اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ امام سید عبداللہ بخاری کو صرف مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ سارے ملک کا دشمن ثابت کیا جائے، امام صاحب کا قصور صرف یہ ہے کہ انہوں نے حکمران جماعت کے حق میں پروپیگنڈہ کرنے کی ترغیب کو ردّ کر کے کھلم کھلا حکومت کے مظالم اور جبر وتشدّد کے خلاف آواز بلند کی۔ اُن کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے جنتا پارٹی کے خلاف مذہبی منافرت پھیلانے کی بجائے اس کے سیکولر کردار کی نشان دہی کی اور مسلمانوں کو حکمران جماعت کی بلیک میلنگ سے خبردار رہنے کی تلقین کی۔ امام صاحب نے بڑی جرأت اور ہمت سے کام لے کر واضح الفاظ میں مطالبہ کیا کہ راشٹر یہ سیوک سنگھ اور جماعت اسلامی دونوں پر سے پابندی ہٹا کر ان کے خلاف مفروضہ الزامات کی عدالتی تحقیقات کی جانی چاہیئے، ہم نہیں سمجھتے کہ امام صاحب کا یہ موقف اور ان کا یہ استدلال کس لحاظ سے اسلامی تعلیمات کے منافی ہے اور صرف اس لیے کہ وہ جامع مسجد کے امام ہیں، وہ ان ناانصافیوں اور بے ضابطگیوں کے خلاف اپنی زبان بند کیوں رکھیں کہ جن کے زیادہ تر شکار مسلمانانِ ہند بالعموم اور مسلمانانِ دہلی بالخصوص رہے ہیں۔ ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ سے کئی ماہ پہلے جامع مسجد ہی کے علاقے میں سترہ مسلمانوں کو پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنایا گیا تھا اور ایمرجنسی کے دوران ہی ترکمان گیٹ کا سانحہ پیش آیا تھا۔ خاندانی منصوبہ بندی کے نام پر روا رکھی گئی غنڈہ گردی اور دہشت گردی کا شکار بھی زیادہ تر دہلی کے مسلم آبادی والے علاقے ہی تھے، ان حالات میں اگر جامع مسجد کے امام صاحب نے بغیر کسی خوف اور مصلحت کے اپنے آپ کو ان قوتوں سے وابستہ کر دیا کہ جو ملک میں ایمرجنسی کے گھٹاٹوپ اندھیرے کو ختم کر کے

اس ملک میں انسانی اقدار اور جمہوری آداب کی بحالی چاہتے ہیں تو وہ اس عزم اور ارادے کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ وہ ایسا نہ کرتے تو اپنے منصب کے ساتھ بڑی نا انصافی کرتے۔ امام صاحب کی حق گوئی و بے باکی سے حکمران جماعت کی بدحواسی قابل فہم ہے کیونکہ یہ جماعت آج تک مسلمانوں کو جن سنگھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ کا ہوا دکھا کر ہر انتخاب میں ان سے ووٹ حاصل کرتی رہی ہے۔

☆☆☆

۱۷/مارچ ۱۹۷۷ء

مولوی افتخار کا کارنامہ

سری نگر کے پارلیمانی حلقۂ انتخاب سے بیگم شیخ محمد عبداللہ کی کامیابی یقینی ہے اور ہم تہہ دل سے بیگم صاحبہ کو اس کامیابی پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ لیکن ہم اپنے فرائض میں کوتاہی کریں گے، اگر ہم اس انتخابی معرکے کے اصلی ہیرو مولوی افتخار حسین کے تاریخی رول کو نظر انداز کریں۔ انتخابات کا مقصد رائے دہندگان کو مختلف اُمیدواروں کے حسن و قبح کو پرکھ کر انہیں موقع فراہم کرنا ہے کہ وہ ان میں سے بہترین اُمیدوار کا انتخاب کریں اور اسی لیے اُمیدواروں کی بلا مقابلہ کامیابی، انتخابات کو بے آب و رنگ بنا کر امیدواروں کو اپنے انتخاب اور ترجیح کا حق استعمال کرنے سے محروم کر دیتی ہے۔ سرینگر سے نیشنل کانفرنس کی اُمیدوار بیگم عبداللہ کے بارے میں اگر چہ ہماری ذاتی رائے یہ تھی کہ انہیں بلا مقابلہ کامیاب بنانا چاہیے تھا، لیکن پچھلے تین ہفتوں کے دوران، اس حلقہ انتخاب میں بالعموم اور کل کے دن بالخصوص، جو کچھ ہم نے دیکھا اور سنا ہے، اس کے پیش نظر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ مولوی افتخار حسین نے بیگم صاحبہ کے مقابلے میں کھڑے ہو کر غیر شعوری طور پر ایک تاریخی فریضہ انجام دیا ہے۔ انہوں نے جس مقصد یا جس نیت سے بھی اپنے آپ کو بیگم

صاحبہ کے مقابلے میں بطور اُمیدوار پیش کیا ہو، اس بات سے انکار نہیں کہ ان کے اس قدم سے شیخ صاحب کو بھی اپنی طاقت کا اندازہ کرنے کا موقعہ ملا، اور ضلع سرینگر کے عوام کو بھی اور اس انتخابی معرکے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو اس تلخ حقیقت کا احساس ہوگا کہ فروری ۱۹۷۵ء سے لے کر مارچ ۱۹۷۷ء تک دریائے جہلم میں کتنا پانی بہہ چکا ہے۔ ۲؍مارچ کو شیخ صاحب نے بڑے اعتماد، بلکہ بڑے غرُور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا تھا کہ بیگم صاحبہ کے مخالفوں کو صرف شکست ہی نہیں ہوگی، ان کی ضمانت بھی ضبط ہوگی۔ آج شام تک ووٹوں کی گنتی مکمل ہونے کے بعد شیخ صاحب کو اندازہ ہو جائے گا کہ بیگم صاحبہ کے مقابلے میں ایک حقیر اور بے سرو سامان مولوی نے شیخ صاحب کے غیر معمولی اثر و رسوخ اور نیشنل کانفرنس کارکنوں کی زبردست دھاندلی کے باوجود کتنے ووٹ حاصل کیے۔ ہماری اطلاع کے مطابق سرینگر سے بیگم صاحبہ کی نامزدگی کے وقت شیخ صاحب کو یہ زعم تھا کہ ان کا مقابلہ کرنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوگی۔ خود ہمارا بھی یہی اندازہ تھا، لیکن مولوی افتخار حسین نے نہ صرف شیخ صاحب کا زعم توڑ دیا بلکہ ہمارا اندازہ بھی غلط ثابت کیا اور ہمیں خوشی ہے کہ یہ انتخابی معرکہ شیخ صاحب کو یہ احساس دلانے میں کامیاب ہو جائے گا کہ عوام کے متعلق اس خوش فہمی میں مُبتلا رہنا کہ وہ آنکھیں بند کر کے اپنے لیڈروں کی ہر بات اور ہر فیصلے پر ایمان لائیں گے، غلط ہے۔ بیگم صاحبہ کی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے شیخ صاحب کو جتنی محنت کرنا پڑی اور کانفرنسی کارکنوں کو اس سلسلے میں جن بے راہ رویوں کا سہارا لینا پڑا، اس نے بیگم صاحبہ کی کامیابی کو یقینی تو بنا دیا لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں عوامی طاقت اور مزاحمت کی شدّت کا احساس بھی دلایا ہوگا اور یہی مولوی

افتخار کا کارنامہ ہے۔

ہم اُمید کرتے ہیں کہ اس معرکتہ الآرائی انتخابی جنگ کے بعد شیخ صاحب اپنی وزارت عظمیٰ کے زعم میں عوامی جذبات اور احساسات کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ مولوی افتخار حسین کے حاصل کردہ ووٹ مولوی صاحب کی مقبولیت کا ثبوت نہیں آپ کی سرد مہری، بے اعتنائی، حد سے بڑھی ہوئی انانیت اور اس جھوٹے غرور کے خلاف خاموش احتجاج ہے کہ جس نے آپ کو، آپ کے سب سے بیش قیمت اثاثے، عوام سے دور کر دیا ہے۔

☆☆☆

۰۲ / مارچ ۱۹۷۷ء

دُم دار تارا

یادش بخیر! پچھلے ایک سال میں ہندوستان کا ایک نوجوان سیاست کے اُفق پر دُم دار تارے کی طرح طلوع ہوا۔ اُس کی دُم کچھ اس شدّت سے چمک اُٹھی کہ ہر دیکھنے والے کی آنکھیں چُندھیا گئیں۔ بہت کم لوگ ایسے رہ گئے جن کی آنکھوں کو اس دُم دار تارے کی چمک خیرہ نہ کر سکی۔ کشمیر سے کیرالہ تک ہر شخص کو نظر آنے لگا کہ اگر اُسے دُنیا میں کوئی مقام حاصل کرنا ہے تو وہ اُس دُم دار تارے کی چھتر چھایا میں آئے، وہ جہاں سے گُزرا، لوگوں نے اپنی آنکھیں بچھائیں، اُس نے جس طرف نگاہِ غلط انداز ڈالی تو ہزاروں تیرِ نظر کے شکار ہو کر گھائل ہو گئے، بڑے بڑے وزراءِ اعلیٰ اور مرکزی کابینہ کے سینئر وزیر اُن کی عنان اس طرح تھامتے رہے، جیسے وہ زر خرید غلام ہیں، بنسی لال اور ذیل سنگھ نے تو سب کو مات کر دیا اور یوپی کے وزیرِ اعلےٰ تیواڑی نے اپنا وجود فرشِ راہ بنا دیا، اور اُس ذیل سنگھ سے سبقت لینے کی کوشش کی جو سنجے گاندھی کے پاؤں کا چپل ہاتھ میں اُٹھانے کی سعادت حاصل کر چکا تھا، اُس بنسی لال سے دو جوتے آگے بڑھنے کی کوشش کی جو اس کے ہر جلسے میں اس کا ہمرکاب ہوتا تھا اور بڑی نیاز مندی سے سپاسنامے پیش کر کے ریاست ہریانہ کے وہ مطالبات پیش کرتا تھا جنہیں وہ مرکزی وزارت سے خود منوا نہ سکے تھے اور اب سنجے

گاندھی کے سامنے سربسجود ہوکران سے عاجزی کرتا تھا کہ وہ اپنے شاہانہ اختیار سے اُن کے مطالبات منظور کرائیں۔ سنجے گاندھی کی اپنی حیثیت کیا تھی وہ ایک نیم خواندہ نوجوان ہے اور مختلف طریقوں سے دولت اور ثروت پیدا کرنے کی ہوس رکھتا ہے۔ پھر اس کی غیر معمولی، شہرت مقبولیت اور عزت افزائی کا سبب کیا تھا؟ سبب یہ تھا کہ وہ کوئی عام نوجوان نہ تھا بلکہ ہندوستان کی وزیراعظم کا لاڈلا بیٹا تھا۔ وزیراعظم کو خدا بنانے والے چاپلوسوں نے ایک ماں کی محبت کا استحصال کر کے سنجے گاندھی کو بانس پر چڑھانا شروع کیا اور ماں بھی اس غلط فہمی کا شکار ہوگئی کہ اُس کا بیٹا بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ہے، اس کے بعد جو کچھ ہوا، اُس کو دُہرانے کی ضرورت نہیں، مغل شاہزادوں کی عیش پرستی کی کہانیاں سُنی ہیں مگر ہم نے دیکھا کہ برخود غلط نوجوان اس قسم کی تمام داستانوں کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے لگا۔ فطرت کچھ دیر کے لیے اغماض کر لیتی ہے، مگر بخشتی نہیں۔ اُس نے اپنا کام کیا، یہ دُم دار ستارا ڈوبا اور اپنی نحوست سے اپنے اردگرد کے تمام انسانوں کو لے ڈوبا، سنجے گاندھی نے ہندوستان کی سیاست کا رُخ بدل کر رکھ دیا کیونکہ اُس کی سرگرمیوں کا کنواس وسیع تھا۔ ریاستوں میں بھی چھوٹے چھوٹے سنجے گاندھی موجود ہیں، جو اگر وزراء اعلیٰ کے سائے سے محروم ہو جائیں تو دوسرے دن بازاروں میں ٹکے سیر بکنے لگیں، کیا یہ وزرا اعلیٰ اور اُن کے دُم دار ستارے جن کا زمین پر قدم نہیں ٹکتا اس عظیم المیہ سے کوئی سبق حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

☆☆☆

۲۳ / مارچ ۱۹۷۷ء

قہرِ رجال

ہندوستان کے عوام نے انیس مہینے جس صبر اور پامردی سے اُن مشکلات اور مصائب کا مقابلہ کیا جو ان پر ایمرجنسی کے ذریعہ مسلط کیے گئے، اس سے سوچنے والے دو طرح سے سوچ رہے تھے۔ ایک مکتبہ خیال کا فتویٰ تھا کہ ہندوستان کے عوام ایک بھیڑوں کا ریوڑ ہے، جسے کوئی بھی شخص لاٹھی کے ذریعہ ہانک سکتا ہے، اور وہ پوری برخورداری اور سعادت مندی سے سرِ تسلیم خم کر کے حکم کی تعمیل کرتا ہے، ان کے خیال میں ہندوستان کے عوام اُس چیز سے بالکل عاری تھے، جسے شعور کہتے ہیں، ایک اور گروہ اس خیال سے متفق نہ تھا، اور وہ کہتا تھا کہ ہندوستان کا عوام بہت بالغ، نظر باشعور اور دانشمند ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بڑا صابر، حلیم اور بردبار ہے، اُس کی متانت اسے ہر مصیبت کو صبر و تحمل سے برداشت کرنے کے قابل بناتی ہے اور اس کی دور اندیشی اُسے مناسب اور موزوں وقت کا انتظار کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور پھر جب وہ وقت آتا ہے تو اُس کی تمام صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں اور وہ ظالم کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کا عزم کر کے طوفان کی طرح اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ظلم کے تمام آثار کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے، وقت نے ثابت کر دیا کہ اسی دوسرے گروہ کا خیال درست تھا، اُنیس ماہ تک غلامی، مجبوری اور بے بسی

کی زندگی کے وار خاموشی سے سہہ لینے کے بعد جب اُسے موقع ملا تو اُس کی دانشمندی اور دور اندیشی جاگ اُٹھی ، اور اُس نے ''اب یا کبھی نہیں'' کا نعرہ لگا کر ان تمام قوتوں کا خاتمہ کرنے کا تہیہ کر لیا جنہوں نے اُس کی توہین کی تھی ، اُس کی انسانیت کو ذلیل کیا تھا اور اُس سے اُس کا مقام چھین کر حیوانوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ قہر خُدا کے ساتھ ایک اور چیز بھی ہوتی ہے جسے قہرِ رجال کہتے ہیں اور تمام مفکروں کا خیال ہے کہ قہرِ خدا کو خدا کا رحم زیر کر سکتا ہے مگر قہرِ رجال کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ ہم نے اپنی زندگی میں ایسے دو واقعات دیکھے ہیں ایک جب سرینگر میں موئے مقدس کے ساتھ بدتمیزی کی گئی اور کشمیر کا عوام بپھرے ہوئے شیر کی طرح ایک لمبی نیند سے جاگ کر کروٹ لینے لگا ، یہ ایک سیلاب تھا اور قہر رجال کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہُوا سمندر ، جسمیں ظلم و جبر کے تمام عناصر بہہ گئے۔ اس سے زیادہ بہت بڑے پیمانے پر کل کے قہرِ رجال کا وہ منظر تھا ، جس نے ایمرجنسی کے خداؤں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا ، جس نے طاغوتی طاقتوں کی بنیادیں ہلا دیں۔ آزادی اور احترامِ آدمیت کے دشمنوں کو وہ سزا دی جس کا ایک دن پہلے خواب میں بھی تصوّر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دُنیا نے دیکھ لیا کہ قہرِ رجال کتنی عظیم طاقت ہے اور وہ ہستی جو کل تک عالم پناہ تھا آج خود پناہ کی تلاش میں حیران و سرگرداں ہے۔

☆☆☆

۲۲/ مارچ ۱۹۷۷ء

محبت اور جنگ

ریاستی عوام، ریاست کے نائب وزیر اعلیٰ میرزا محمد افضل بیگ کے اس بیان کا خیر مقدم کریں گے، کہ جس میں انہوں نے مرکز کے ساتھ ریاست کے بہترین تعلقات قائم کرنے کی یقین دہانی کی ہے۔ بیگ صاحب نے انتخابی مہم کے دوران پیدا شدہ تلخیوں کو بھول کر ایک نئے اور خوشگوار دور کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ مرکز کے ساتھ کسی قسم کے تضاد یا تصادم کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عام حالات میں بیگ صاحب کو دلی جا کر یہ صفائی پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اور بظاہر یہ سب کچھ کہنے کا کوئی موقع محل بھی نہیں تھا۔ لیکن بیگ صاحب کے دل میں چونکہ چور چھپا بیٹھا تھا اور ان کا مجرم ضمیر انہیں بے چین کر رہا تھا، اس لیے انہوں نے موقع دیکھا نہ محل، اپنی صفائی پیش کر ہی دی۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ انتخابی مہم کے دوران انہوں نے اسمبلی کے انتخابات کو رائے شماری اور جنتا پارٹی کو جن سنگھ کا نام دے کر مرکزی حکومت کے دل میں کچھ شکوک اور شبہات پیدا کیے ہیں، انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ انتخابی معرکے کے دوران دفعہ ۳۷۰ کو لاحق فرضی خطرے کا الارم بجا بجا کر انہوں نے مرکزی حکومت کے تئیں کچھ لوگوں کے دلوں میں بد ظنی بھی پیدا کر دی تھی۔ انہیں اس بات کا بھی علم تھا کہ حالیہ انتخابات کے دوران انہوں نے اور نیشنل کانفرنس کے دوسرے رہنماؤں نے مذہبی جذبات ابھارنے اور علیحدگی پسندی کے رجحانات کو ہوا دینے کے لیے جو کچھ کہا ہے مرکزی رہنما اس سے بخوبی واقف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے دلی

جانے سے قبل اور دلی پہنچنے کے فوراً بعد مرکزی حکومت کو یہ یقین دلانا ضروری سمجھا کہ وہ مرکز کے ساتھ بہترین تعلقات قائم کرنے کے خواہش مند ہیں۔ وجہ کچھ بھی ہو، میں بیگ صاحب کے اس بیان صفائی کا خیر مقدم کرتا ہوں، اور میرا خیال ہے کہ ہر محبّ وطن ہندوستانی اس پر اطمینان اور آسودگی کا اظہار کرے گا۔ لیکن ریاستی آبادی کا وہ حصہ کہ جس نے نیشنل کانفرنس رہنماؤں کی تقریروں، تحریروں اور بیانات پر اعتبار کر کے ان کے حق میں ووٹ دیا تھا، بیگ صاحب کے تازہ ترین بیان پر حیران اور پریشان ہوگا، ان لوگوں کو یہ بتایا گیا تھا کہ انتخابات میں کامیابی دراصل ہندوستان سے علیحدہ ہونے کی پہلی منزل ہے۔ انہیں یہ یقین دلایا گیا تھا کہ انتخابی جنگ دراصل ہندوستان کی جنتا پارٹی کے خلاف جنگ ہے، انہیں یہ باور کرایا گیا تھا کہ نیشنل کانفرنس کو اسمبلی میں اکثریت حاصل ہونے کے فوراً بعد ۱۹۵۳ء کی پوزیشن بحال کیے جانے کی کاروائی شروع کی جائے گی۔ وہ اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ آج نہیں تو کل روالپنڈی کی شاہراہ کھول دی جائے گی وہ اس بات کی توقع کر رہے تھے کہ ۱۹۵۳ء کے بعد سے جو مرکزی قوانین یہاں لاگو کیے گئے ہیں، ان کی جانچ پڑتال کا سلسلہ فوراً شروع کر دیا جائے گا لیکن بیگ صاحب کے بیان سے ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا ہوگا۔ بے چارے سوچ رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ بہت بڑا مذاق ہوا ہے اور انہیں دھوکہ دیا گیا ہے، مجھے ایسے تمام عناصر اور لوگوں کے ساتھ گہری ہمدردی ہے لیکن انہیں اپنے محبوب رہنما قائد اعظم شیر کشمیر کا یہ فرمان یاد رکھنا چاہئے کہ محبت اور جنگ میں ہر چیز جائز ہوتی ہے۔

☆☆☆

۲۰ر جولائی ۱۹۷۷ء

سیاسی آلودگی

۹ر جولائی کو راج بھون میں اپنے عہدے کا حلف لینے کے فوراً بعد وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے ایک تقریر میں اور باتوں کے علاوہ گورنر راج کے دوران ریاستی انتظامیہ کی کارکردگی پر مسٹر ایل کے جھا کی تعریف کی تھی۔ گورنر نے شیخ صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس تعریف کے مستحق دراصل وہ ہزاروں چھوٹے اور بڑے اہلکار و آفیسر ہیں، جنہوں نے اپنی لگن اور محنت سے ریاست میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کے عمل کو یقینی بنالیا۔ لیکن راج بھون کی اس تقریب کے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر نئی حکومت نے انتظامیہ میں جس پیمانے پر اور جس رفتار سے ردوبدل کرنا شروع کیا ہے اُس سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے سرکاری مشینری کو اچانک کوئی خطرناک بیماری لاحق ہوگئی ہے۔ جس کے علاج کے لیے انتظامیہ کو ایک بڑے آپریشن تھیٹر میں منتقل کردیا گیا ہے۔ وہاں سے وقفے وقفے کے بعد ''سرجن'' مریض کے جسم میں جراحی کی تازہ ترین اطلاعات فراہم کرتے رہتے ہیں۔ تقریباً روزانہ جاری ہونے والے تبدیلیوں اور تقرریوں کے احکامات سے یہی تاثر ملتا ہے کہ گورنر اور وزیر اعلیٰ نے اپنی اپنی تقریروں میں انتظامیہ کو غالباً تعریف کا نہیں بلکہ ''تکلیف'' کا مستحق قرار دیا تھا۔ بہرکیف، ہر نئی حکومت کو چونکہ یہ پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پسند کے مطابق آفیسروں اور اہلکاروں کا تعین کرے، اس لیے تبدیلیوں اور تقرریوں کے موجودہ دور کو بھی اسی زاویے سے پرکھا جانا چاہیے۔ ردوبدل

کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ انتظامیہ کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے امکانات پیدا کیے جائیں اور سرکاری مشینری میں عوام کے اعتماد کو مستحکم کیا جائے۔ لیکن جس طریقے سے حکومت اس کام کو انجام دے رہی ہے اس سے انتظامیہ کی تشکیل اور کارکردگی پر عوامی اعتماد بڑھنے کی بجائے کم ہونا لازمی نظر آتا ہے، کسی بامقصد لائحہ عمل کو اپنانے کی بجائے وزیروں اور چند منظورِ نظر غیر سرکاری مشیروں کی ذاتی پسند اور ناپسند کو عیاں طور پر اپنایا جارہا ہے، یہ بات بھی صاف ظاہر ہے کہ اس اہم کام میں کچھ ''غیر متعلقہ'' اناڑی بھی شامل رہتے ہیں، ورنہ شام کو جاری ہونے والے احکامات کو دوسری صبح تک واپس لینے یا منسوخ کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ اس کی مثالیں ہر محکمے میں موجود ہیں۔ پولیس، تعمیرات عامہ کے انجینئروں، سیکریٹریٹ کے شعبوں سے متعلق آج تک کئی متضاد احکامات جاری کیے گئے ہیں۔ انتظامیہ کو سیاسی تغیر و تبدل کے تابع بنانے کی جو مثال قائم ہو رہی ہے وہ نہایت غیر صحت مند ہے اس سے ایڈمنسٹریشن پر سے لوگوں کا اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور سرکاری مشینری کے اندر غیر یقینی صورت حال پیدا ہونے کی وجہ سے حوصلہ شکنی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ بعض جونیئر آفیسروں کو اپنے سینئر آفیسروں کی نسبت اونچے ایوانوں میں رسائی اور شنوائی کے زیادہ مواقع فراہم کیے جارہے ہیں جس سے ڈسپلن پر بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ ایسی باتوں سے انتظامیہ کا Institutional Character تباہ ہوتا ہے اور اس میں ذاتیات کا عنصر غالب رہتا ہے جو عام لوگوں کے مفادات کے سراسر منافی ہے

☆☆☆

جولائی ۱۹۷۷ء

آپ بیتی اور جگ بیتی

میں آج تقریباً تین مہینے کی غیر حاضری کے بعد آئینہ کی محفل میں دوبارہ شامل ہورہا ہوں اس عرصہ میں ''آئینہ'' میں جو کچھ شائع ہوا ہے میں اس کی قانونی اور اخلاقی ذمہ داری قبول کرتا ہوں اور اپنے ان ساتھیوں اور قلمی معاونین کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنہوں نے میری عدم موجودگی اور میری غیر معمولی مصروفیات کے ایام میں ''آئینہ'' کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ اسے خوب تر بنانے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ مجھے امید ہے کہ مستقبل میں بھی ''آئینہ'' کو ان کا تعاون حاصل رہے گا۔

ان تین مہینوں کے دوران میں اور میری تقدیر مستقل گردش میں رہے۔ مارچ کے مہینے میں ملک کا سیاسی نقشہ بدل جانے کے بعد جب ریاست جموں وکشمیر کی اندرونی سیاست میں بھی اتھل پتھل پیدا ہوگئی تو میری سیاسی سرگرمیوں میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اور میں نے اپنے بعض ہم خیال دوستوں کے ساتھ مل کر ریاست کے لیے جنتا پارٹی کے قیام کے لیے جدوجہد شروع کی۔ اپریل کے مہینے میں ریاست کے لیے جنتا پارٹی کی ایڈہاک کمیٹی کا باقاعدہ اعلان ہوا اور مجھے اس کا ایک ممبر نامزد کیا گیا۔ ابھی کمیٹی نے باقاعدہ طور اپنی سرگرمیاں شروع بھی نہیں کی تھیں کہ میری ایک آنکھ میں تکلیف پیدا ہوگئی اور ماہروں نے فوری آپریشن کا مشورہ دیا۔ بعض دوستوں نے صلاح دی

کہ آپریشن ہندوستان کے بجائے لندن میں ہونا چاہیے تاکہ سو فیصدی کامیابی کا اطمینان ہو جائے ،اس لیے میں نے بڑی عجلت اور بدحواسی میں لندن جانے کا فیصلہ کیا اور ۱۲رمئی کو میں دہلی سے لندن کے لیے روانہ ہو گیا۔ لندن میں ڈاکٹر افضل میر اور مسز شنکر رینہ سے پہلے ہی بات ہو چکی تھی اور انہوں نے متعلقہ ڈاکٹروں سے ساری تفصیلات طے کر لی تھیں۔لندن پہنچنے کے دوسرے دن مجھے ہسپتال میں داخل کر لیا گیا اور تیسرے دن میرا آپریشن ہوا۔آپریشن خدا کے فضل سے کامیاب ہوا اور پانچ دن بعد مجھے ہسپتال سے رخصت کیا گیا۔لیکن ڈاکٹروں نے اس بات پر اصرار کیا کہ جب تک زخم مکمل طور ٹھیک نہیں ہوتا وہ مجھے ہندوستان لوٹنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ بالآخر ۱۰رجون کو مجھے وطن لوٹنے کی اجازت مل گئی اور میں ٹھیک ایک ماہ کے بعد ۱۲ر جون کو دہلی اور پھر سرینگر پہنچ گیا۔

لندن میں قیام کے دوران اپنی علالت کے پیش نظر میں نے اس بات کا فیصلہ کر لیا تھا کہ میں فی الحال کسی قسم کی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہیں لوں گا۔ انتخابات میں حصہ لینے کا خیال بھی میں نے دل سے نکال دیا تھا اور یہ سوچ کر کہ میرے ہندوستان پہنچنے تک انتخابات کا ابتدائی عمل مکمل ہو چکا ہوگا، میں نے اپنے آپ کو ایک خاموش تماشائی کا رول ادا کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔شوپیان کے بعض سرگرم، مخلص اور نوجوان ساتھیوں نے میری عدم موجودگی میں مجھ سے مشورہ کئے بغیر نہ صرف میری امیدواری کا اعلان کیا بلکہ میری انتخابی مہم بھی شروع کر دی۔ مجھے دھڑا دھڑ خطوط موصول ہونے لگے، کہ مجھے ہر قیمت پر انتخاب لڑنا ہوگا اور جب میں نے اپنی خرابی صحت کا عذر پیش کیا تو مجھے بتایا گیا کہ میری انتخابی مہم میری غیر

حاضری میں ہی چلائی جائے گی۔ ۲؍ جون کو میرے کاغذات نامزدگی، مجھے لندن میں ہی موصول ہوگئے اور ۳؍ جون کو میں نے انہیں اس خیال سے مکمل کر کے بھیج دیا کہ ان کا وقتِ مقررہ تک پہونچنا محال ہے۔ ۷؍ جون کو مجھے ٹیلیفون کے ذریعے، اطلاع مل گئی کہ کاغذاتِ نامزدگی نہ صرف وقت مقررہ پر پہنچے ہیں بلکہ منظور بھی ہوگئے ہیں اور میں اب شوپیان سے باقاعدہ اُمیدوار ہوں۔ اس کے بعد کیا ہوا یہ ساری دنیا کو معلوم ہے۔ اس لیے اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ میں نہ صرف شوپیان سے انتخاب ہار گیا بلکہ میری ضمانت بھی ضبط ہوگئی۔ مجھے تین ہزار سے کچھ زائد ووٹ ملے جب کہ میرے مدمقابل کو چودہ ہزار کے قریب ووٹ ملے۔ میرا اندازہ ہے کہ مجھے جو تین ہزار ووٹ ملے وہ صرف شوپیان کے قصبے سے ملے۔ دیہاتیوں نے میرے حق میں ووٹ نہیں دیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب کی بار وادی میں دیہات کے رہنے والوں نے ایک ہی امیدوار کو ووٹ دیئے اور اس اُمیدوار کا نام شیخ محمد عبداللہ ہے۔ ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟ یہ ایک الگ بات ہے اور میں اپنی آئندہ تحریروں میں اس پر روشنی ڈالوں گا۔ اس وقت صرف اس امر کی طرف اشارہ کرنا چاہیے کہ حالیہ انتخابات میں نیشنل کانفرنس کی غیر معمولی اور کس حد تک غیر متوقع کامیابی کسی تنظیم، کسی آئیڈیالوجی یا کس مربوط سیاسی فکر کی نہیں، شیخ محمد عبداللہ کی ذاتی کامیابی اور کامرانی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ انتخابی جنگ میں اپنی فتح کے نشے میں مسرور نیشنل کانفرنسی رہنما اور کارکن میرے اس بیان پر سیخ پا ہو جائیں گے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ نیشنل کانفرنس کی فتح دراصل بلند اصولوں، آدرشوں، کشمیر کی انفرادیت اور عظمت آزادی اور عزت و آبرو کے تصور کی فتح ہے لیکن جو لوگ رنگین افسانوں کی بجائے سنگین حقائق کو سمجھنے کی

صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ریاست کے حالیہ انتخابات میں شیخ صاحب کی سیاست سے زیادہ ان کی ذات ریفرنڈم کا موضوع تھی اور اس ریفرنڈم میں شیخ صاحب کو بے نظیر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ وہ لوگ جو شیخ صاحب کی اس ذاتی کامیابی کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے انتخابات میں دھاندلیوں کا رونا رو رہے ہین یا سرکاری مشینری پر جانبداری کے الزامات عائد کر کے انتخابی عمل کے تقدس کو پامال کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں وہ بھی حقائق سے آنکھیں چُرا کر اپنے دل کو جھوٹی تسلیاں دے رہے ہیں۔ ہم سب کو اس حقیقت کا اعتراف اور احترام کرنا چاہیے کہ شیخ محمد عبداللہ کی شخصیت کا جادو اور کشمیری عوام پر اس کی گرفت آج بھی بہت حد تک قائم ہے اور اپنی تمام تر غلطیوں اور ناکامیوں کے باوجود وہ آج بھی ہماری سیاست اور ریاست کے سب سے اہم اور سب سے پیچیدہ شخصیت اور کردار ہیں۔

یہ بات میں شیخ صاحب کی غیر معمولی کامیابی سے مرعوب ہو کر نہیں کہہ رہا ہوں۔ بلکہ اس کا اظہار اور اعتراف میں نے بارہا اس اخبار کے کالموں میں کیا ہے اور ۱۶/ اپریل کو میں نے جنتا پارٹی کے ایک سرکردہ رہنما اشوک مہتا کے سامنے کشمیر کی سیاسی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے واضح الفاظ میں کہا تھا، کہ شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی طاقت کو کس قیمت پر بھی Under Estimate نہیں کیا جانا چاہیے۔ وہ آج بھی غیر معمولی طاقت کے مالک ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا سیاسی مقابلہ کیا جانا چاہیے۔ انتخابات میں شیخ صاحب کی غیر معمولی کامیابی کے بعد بھی میری یہی رائے ہے کہ ان کی اس کامیابی سے مرعوب ہو کر ان کے سامنے ہتھیار ڈالنا غلط ہوگا۔ بلکہ اب ان کے سیاسی مقابلے کی اہمیت اور ضرورت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے انہوں نے اور ان

کے ساتھیوں نے انتخابات کے دوران غلط اور گمراہ کن نعرے دے کر سیاست میں بہت سے غیر صحت مند رجحانات کو جنم دیا ہے اور ہمیں ان رجحانات کے خلاف صف آراء ہو کر اپنی سیاست اور ریاست کو ترقی پسند اور صحت مند لائنوں پر چلانے کی جدوجہد کرنا پڑے گی۔ میں نے جیسا کہ کہا ہے کہ نیشنل کانفرنس کے پاس کوئی سیاسی یا اقتصادی پروگرام نہیں ہے۔ اس لیے نیشنل کانفرنس کی انتخابی فتوحات جلد ہی اس کے لیے ایک ناقابل برداشت بوجھ بن جائیں گی۔ اس مرحلے پر ہمیں واضح، مثبت اور ٹھوس سیاسی اور اقتصادی پروگرام پیش کر کے اس تاریخی رول کو انجام دینا ہوگا کہ جو ایک صحت مند اور تعمیری اپوزیشن کا خاصہ ہوتا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ شیخ صاحب کی شخصیت کے بے پناہ سحر اور رائے شماری جیسے خوبصورت مگر گمراہ کن نعرے کے باوجود وادی میں ساڑھے چار لاکھ سے زائد لوگوں نے شیخ صاحب اور ان کی جماعت کے خلاف ووٹ دیا ہے۔ ان ساڑھے چار لاکھ لوگوں میں پڑھے لکھے اور سوچنے سمجھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے اور یہ بات ہم سب کے لیے اس لحاظ سے کافی حوصلہ افزا ہے کہ یہ ریاست کی سیاست میں ایک صحت مند علامت کی نشاندہی کرتی ہے۔

پاکستانی سیاست کے ماہرین کا کہنا ہے کہ گذشتہ انتخابات میں پاکستان کے سابق وزیر اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کی کامیابی کے امکانات بہت روشن تھے۔ اور عام اندازے کے مطابق مسٹر بھٹو کے قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا لیکن مسٹر بھٹو کی مہم پسندی نے انہیں انتخابات میں شاندار اور بے مثال کامیابی حاصل کرنے کے لیے ایسے ذرائع استعمال کرنے پر مجبور کر دیا کہ جس نے سارے

انتخابی عمل کو ہی مشکوک اور مردود بنا دیا۔ میری دانست میں چھوٹے پیمانے پر شیخ صاحب نے بھی ایک دوسرے انداز میں یہی غلطی دہرائی ہے۔ اسمبلی کے حالیہ انتخابات میں ان کی کامیابی بہر حال یقینی تھی اور وہ ہر حال میں تیس پنتیس نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنی اس کامیابی کے امکان سے مطمئن نہیں تھے اور اس لیے انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے دفعہ ۳۷۰، رائے شماری، اسلام اور ایسے ہی غیر یقینی نعرے دے کر ریاست میں ایک ایسا قائم کر دیا کہ اسمبلی کی انتخابی جنگ کم از کم دیہات میں کفر اور اسلام کی لڑائی بن گئی۔ اس قسم کے ماحول اور اس حکمت عملی سے شیخ صاحب کو بے نظیر انتخابی کامیابی تو حاصل ہو گئی لیکن ان کی شخصیت اور ان کی عظمت کو ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچا۔ شیخ صاحب نے پارلیمانی انتخابات کے دوران یہ بات کہی تھی کہ ہمیں ہر اس جماعت سے تعاون اور اشتراک کرنا پڑے گا کہ جو مرکز میں برسر اقتدار آ جائے لیکن انتخابات کے دوران شیخ صاحب اور ان کے اکثر ساتھیوں نے مرکز میں برسر اقتدار جماعت کے خلاف جو پروپیگنڈا کیا وہ یقیناً مرکزی حکومت کے ساتھ ان کے تعلقات کی خوشگواری کا باعث نہیں ہو سکتے۔

بہر حال ہمیں امید کرنا چاہیے کہ شیخ صاحب انتخابی جنگ کی تلخیوں کو بھول کر مرکز کے ساتھ مفاہمت اور دوستی کی اس پرانی روش پر گامزن ہوں گے کہ جو انہوں نے گاندھی کے دورِ اقتدار میں اپنائی تھی۔

☆☆☆

۱۹۷۷ء

شیخ صاحب کیا کریں؟

ریاست کے اسمبلی انتخابات میں شیخ صاحب کو جو بھاری اکثریت حاصل ہوئی ہے، اس نے ان کی سیاسی اہمیت، عوامی مقبولیت اور ذاتی عظمت پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔ ریاست کے اندر اور باہر ان کے بدترین مخالفوں کو بھی یہ اندازہ ہوگیا ہے کہ وہ محض ایک سیاسی لیڈر نہیں ایک علامت، ایک ادارہ اور ایک تصوّر ہیں، اور انہیں عام سیاسی لیڈروں کے پیمانے سے جانچنا صحیح نہیں ہوگا۔ شیخ صاحب کی غیر معمولی کامیابی نے جہاں ان کی بے پناہ قوت ظاہر کردی ہے وہاں ان کے اثر ورسوخ اور ان کی مقبولیت کی حدیں بھی مقرر کردی ہیں۔ میری دانست میں اب کی بار وہ سیاسی طاقت اور مقبولیت کی اُن بلندیوں کو چھو گئے ہیں کہ اب اس سے اونچا جانے کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ ان بلندیوں پر زیادہ دیر تک رہنا ممکن نہیں۔ البتہ یہاں سے نیچے کا سفر شروع ہوتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ شیخ صاحب اپنی موجودہ حالت میں کتنی دیر تک اس بلندی پر قائم رہتے ہیں۔

۷۶ نشستوں کے ایوان میں ۴۸ سیٹیں حاصل کرنا بظاہر ایک ایسی کامیابی ہے کہ اس پر اطمینان کا اظہار کرکے پانچ سال کے لیے تعمیر و ترقی کے منصوبے بنانا بہت آسان دکھائی دیتا ہے لیکن اس غیر معمولی کامیابی نے کچھ ایسے مسائل اور مشکلات کو بھی جنم دیا ہے کہ ان کو حل کرنے سے پہلے شیخ صاحب کو ان کی صحیح نوعیت اور ہیت کو سمجھنا پڑے گا اور اس مقصد کے لیے اُنہیں اپنے مخالفوں کی ناکامی سے زیادہ اپنی کامیابی کے عناصر ترکیبی کا جائزہ لینا ہوگا۔

مثال کے طور پر اُنہیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس انتخابی معرکے میں وہ ریاستی عوام سے زیادہ ریاستی مسلمانوں کے مسلم لیڈر کی حیثیت سے اُبھرے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جموں کے صوبے میں اُنہیں صرف اُنہی علاقوں میں کامیابی نصیب ہوئی ہے کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ وادی میں ان کی مسلم حیثیت کو کبھی کوئی سنجیدہ چیلنج در پیش نہیں تھا لیکن اس کے باوجود اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے اُنہوں نے جن مسائل اور وسائل کا سہارا لیا، ان کی بناء پر ان کی لیڈر شپ کا مسلم کردار کچھ ضرورت سے زیادہ اُبھر گیا۔ یہ بات شیخ صاحب سے کم تر اور کمزور لیڈروں کے لیے باعث فخر اور اطمینان ہو تو ہو، شیخ صاحب کے ماضی اور ان کے تاریخی رول سے ہم آہنگ نہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف ان کے بدترین مخالفوں کو بھی ہوگا کہ شیخ صاحب ریاست کے وہ واحد لیڈر ہیں کہ جو ریاست کے تینوں خطوں کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتے تھے، آج اگر ان کی قیادت تینوں خطوں کے مسلمانوں کی قیادت تک محدود ہو جاتی ہے۔ تو اس لحاظ سے یہ بہت خوش کُن اور اطمینان بخش صورت حال نہیں ہے کہ اس سے ریاست کی وحدت اور سالمیت کو خطرہ پیش ہوسکتا ہے۔ شیخ صاحب یقیناً اس صورت حال سے باخبر ہیں اور اپنی کابینہ میں جموں کے ریٹائرڈ سرکاری ملازموں کو شامل کر کے وہ اس کمی کو پورا کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ لیکن ریٹائرڈ سرکاری ملازم، وزیر بننے کے بعد بھی بنیادی طور پر سرکاری ملازم ہی رہتے ہیں اور جس طریقے پر اُنہیں کابینہ میں شامل کیا جا رہا ہے، اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ ان کی حیثیت سرکاری ملازموں کی سی ہی رہے گی۔ شیخ صاحب کو سیاسی سطح پر اس مسئلے کو حل کرنے کے بارے میں سوچنا پڑے گا اور اس کے لیے اُنہیں اپنی

پارٹی سے زیادہ ریاست کے مجموعی مفادات کا مدنظر رکھنا پڑے گا۔

اس بے پناہ اور بے نظیر کامیابی نے شیخ صاحب کے سامنے ایک اور مسئلہ بھی پیدا کر دیا ہے اور اس کا تعلق ان سیاسی قوتوں سے ہے کہ جو انتخابی معرکہ آرائی کے دوران اُبھری ہیں اور جنہیں خود شیخ صاحب اور ان کے ساتھیوں کی انتخابی حکمت عملی سے تقویت ملی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آزادی، خودمختاری اور رائے شماری کے خوب صورت نعروں کی خوراک پر پلنے والی اُن نوجوانوں کی طاقت اور صلاحیتوں کو کس طرح ریاست کی تعمیر و ترقی کی طرف لگا دیا جائے، کہ جنہوں نے حالیہ انتخابی مہم کے دوران نیشنل کانفرنس کے لیے نمایاں خدمات انجام دی ہیں؟ صوفی محمد اکبر کا ''محاذ آزادی'' اگرچہ کسی بہت بڑی سیاسی طاقت کی نمائندگی نہیں کرتا لیکن یہ محاذ بھی انتخابی محاذ آرائی کے دوران ایک سوالیہ علامت بن کر اُبھرا ہے، اور بحیثیت وزیراعلیٰ شیخ صاحب کو اس سوال کا جواب دینا ہی ہوگا۔

شیخ صاحب کہ اس معرکتہ الآراء کامیابی کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ اس کامیابی نے اُنہیں ایک بار پھر ایک ریاست کا وزیراعلیٰ بنا دیا ہے۔ اس اخبار کے قارئین کو یاد ہوگا کہ تین ماہ قبل میں نے انہی کالموں میں شیخ صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ ایک ریاست کا وزیراعلیٰ ہونا ان کی سیاسی عظمت اور ان کے مرتبے کے شایان شان نہیں اور اُنہیں خود انتخابات میں اُمیدوار بن کر وزیر اعلیٰ بننے کی ہوس کرنے کی بجائے جے پرکاش نرائن کی طرح ایک بزرگ سیاست دان کا رول ادا کرنا چاہیے۔ اُس وقت کے ماحول میں میرے اس مشورے کو بجا طور ایک شرانگیز اور فتنہ پرور تجویز سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ لیکن انتخابات میں شیخ صاحب کو جو زبردست اور عدیم المثال کامیابی نصیب ہوئی

اور اس سے ان کے وقار اور ان کی عظمت میں جو مزید اضافہ ہوا۔ اس نے میرے مشورے کی صحت اور اہمیت کو زیادہ واضح کردیا ہے شیخ صاحب کی سیاسی عظمت، ان کی شخصیت اور ان کا قد و قامت، یہ سب کچھ ایک ریاست کے وزیر اعلیٰ کے چوکھٹے میں نہیں سماتا۔ اور مجھے تعجب ہے کہ شیخ صاحب کو اپنی طاقت کا صحیح اندازہ کیوں نہیں ہوتا؟ اس ریاست کا وزیر اعلیٰ بخشی غلام محمد سے لے کر غلام محمد شاہ تک کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن شیخ محمد عبداللہ کا مقام، ان کی سیاسی عظمت اور اہمیت، صرف ان ہی کے لیے مخصوص ہے، وہ اگر اپنی تمام تر طاقت اور عظمت کو انتظامی امور اور تعمیر و ترقی کے کاموں کی دیکھ بھال پر ہی صرف کرنا چاہتے ہیں۔ تو یہ اس ریاست کی بہت بڑی بدقسمتی ہے۔ یہ کام تو ایک معمولی سا چیف سیکرٹری اور ڈیولپمنٹ کمشنر بھی کرسکتا ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ شیخ صاحب اگر وزیر اعلیٰ نہ بنتے تو پھر وہ کیا کرتے، یہ سوال اہم ہے لیکن اس کا جواب بہت واضح ہے۔

شیخ صاحب کے بہت سے سیاسی مخالفین (جن میں یہ خاکسار بھی پیش پیش ہے) یہ سمجھ بیٹھے تھے، کہ شیخ محمد عبداللہ ایک سیاسی قوت کی حیثیت سے ختم ہوگئے ہیں۔ ہمارا اندازہ تھا کہ ریاستی انتخابات کے اس تاریخی معرکے میں ہم اُنہیں چاروں شانے چت گرا کر اُنہیں تاریخ کے عجائب گھر میں سجا کر رکھ دیں گے۔ ہم نے ان کی کنبہ پروری، اقرباء نوازی اور سیاسی غلطیوں کی ایک طویل فہرست مرتب کرکے اپنے آپ کو یہ اطمینان دلایا تھا کہ جب عامۃ الناس کو شیخ صاحب کی ان کوتاہیوں اور کارگذاریوں کا علم ہوگا تو وہ ان سے منہ پھیر کر ہم لوگوں کو سینے سے لگائیں گے۔ ہم نے یہ فرض کرلیا تھا کہ شیخ صاحب ہمارے حملے کی تاب نہ لاکر میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ لیکن حالیہ انتخابات

نے ہمارے سارے اندازے اور تخمینے غلط ثابت کر دیئے اور وادی کے عوام نے شیخ صاحب کو وہ اعتماد اور اعتقاد بخشا کہ جو غالباً اس سے پہلے اُنہیں کبھی حاصل نہیں تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شیخ صاحب نے غلط نعرے دے کر اُنہیں گمراہ کیا اور اس طرح اپنی کامیابی کو ممکن بنایا۔ میں کہتا ہوں کہ شیخ صاحب کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے وقتاً فوقتاً غلط نعرے دیئے تھے، لیکن وہ اُنہیں گمراہ نہ کر سکے، شیخ صاحب کی عوام کو گمراہ کرنے کی حرکت بھی ان کی سیاسی طاقت میں شامل ہے اور ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے۔

اپنی زندگی کے اس اہم موڑ اور مرحلے پر شیخ صاحب کو جو طاقت اور عظمت نصیب ہوئی ہے، اس کا صحیح استعمال کرنے کے لیے اُنہیں وزیراعلیٰ کی بجائے ایک ایسے بزرگ سیاست دان کا رول ادا کرنا چاہیے کہ جو اقتدار کے تحفظ سے زیادہ اقدار کے استحکام سے دلچسپی رکھتا ہو۔ اقتدار کی سیاست میں مصلحت اندیشوں، ناروا سمجھوتوں اور بڑے گھٹیا قسم کے جوڑ توڑ سے کام لینا پڑتا ہے اور اب شیخ صاحب کی عمر اور ان کے سیاسی مرتبے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کاروبار کو چھوڑ کر زیادہ تعمیری اور دور رس نتائج کے حامل سیاسی مسائل کی طرف توجہ دیں۔ وہ اپنی نئی حاصل شدہ طاقت کو ریاست کے تینوں خطوں میں سیاسی اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ گذشتہ چالیس پچاس سالوں کے دوران شہر سرینگر میں خاص طور پر شیر بکرا کے ہنگاموں اور تصادم نے ایک مستقل شکل اختیار کر لی ہے اور خطرہ اس بات کا ہے کہ اگر یہ مسئلہ شیخ صاحب کی زندگی میں حل نہ ہوا۔ تو پھر کبھی حل نہیں ہوگا۔ اسی طرح ہماری ساری سیاسی زندگی کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے اور ہم چھوٹے چھوٹے مفادات کی خاطر گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ شیخ صاحب نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر ریاستی اسمبلی میں تو نیشنل

کانفرنس کے لیے اکثریت حاصل کرلی ہے۔لیکن یہ ساری شان وشوکت اور دھوم دھام شیخ صاحب کے دم سے ہے۔ان کے بعد کیا ہوگا؟ یہ اندازہ کرنے کے لیے علمِ نجوم سے واقفیت ضروری نہیں ہے کہ شیخ صاحب کو اس بات کا تو احساس ہے کہ ان کے پاس وقت بہت کم ہے اور وہ کبھی کبھی گاندھی جی کے اصولوں اور خوابوں کی بات بھی کرتے ہیں لیکن ابھی تک انہوں نے اپنے عمل سے گاندھی جی کی تقلید کی کوئی شہادت فراہم نہیں کی ہے۔ان کے سیاسی طریق کار میں آج بھی انتقام گیری اور نفرت کا عنصر غالب ہے، وہ آج بھی اپنے مخالفوں کے خلاف میسا (MISA) جیسے کالے قانون کے استعمال سے احتراز نہیں کرتے، وہ مختلف جماعتوں سے وابستہ ممبران کو وزارت کا لالچ دے کر اپنی صفوں میں شامل کرنے کے مکروہ عمل کی حوصلہ افزائی کرنے میں مصروف ہیں اور یہ ساری باتیں گاندھی جی ،تو کیا تو خود شیخ صاحب کو بھی زیب نہیں دیتیں۔اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ وزارت اعلیٰ کو بیگ صاحب یا غلام محمد شاہ کے سپرد کرکے خود اس سے بھی زیادہ اہم کام کا بیڑا اٹھائیں اور یہ کام ہے ریاست میں نفرت، تفرقے، خانہ جنگی اور تشدد کے ماحول کو ختم کرکے جمہوریت، شرافت اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا استحکام۔شیخ صاحب سے ہزار بدگمانیاں اور بے شمار اختلافات کے باوجود میری رائے میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔سوال صرف یہ ہے کہ شیخ صاحب، وزارت اعلیٰ کے دبدبے اور اس کی آسائشوں کو ہی اپنی زندگی کی منزل سمجھتے ہیں یا وہ اپنی زندگی کے آخری دور اور اپنی مقبولیت کی معراج پر پہنچ کر کوئی ایسا کام کرنا چاہتے ہیں کہ جس سے وہ اس ریاست کی آئندہ پچاس سالہ سیاست کو متاثر کرسکیں۔

☆☆☆

۷راگست ۷۷ا۹ء

باتیں کوہ کن کی

زرعی اصلاحات، ذہنی انتشار

ریاستی اسمبلی نے زرعی اصلاحات سے متعلق نئے بل کو پاس کر دیا ہے اور وزیر مال میرزا محمد افضل بیگ نے بل پر بحث کا جواب دیتے ہوئے جو تقریر کی، اخباری نمایندوں نے اس کی بڑی تعریف کی ہے، لیکن بل کے قانون بن جانے اور بیگ صاحب کی پُر جوش اور برجستہ تقریر کے باوجود زرعی اصلاحات کے متعلق موجودہ حکومت کی روش اور ذہنی رویے کی نسبت عام لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ کانگریس کے بعض سرکردہ ممبران نے ایوان میں اس بل پر بحث کرتے ہوئے اسے کاشتکار کش اور زمیندار پسند قرار دیا ہے اور آزاد ممبر عبدالغنی لون نے اسے زمینداروں کے مفاداتِ خصوصی کا نگہبان قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس بیگ صاحب نے نئے قانون کو کسانوں کی سماجی اور اقتصادی حالت سدھارنے کی طرف ایک اہم قدم قرار دیتے ہوئے یہ اُمید ظاہر کی ہے کہ زرعی اصلاحات کی تازہ قسط، اس معاملے میں حرفِ آخر نہیں، ایک ابتدائی قدم ہے، صحیح صورت حال کیا ہے؟ اس کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں۔ اکثر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اس قانون کا مقصد کیا ہے اور اسے اس مرحلے پر پاس کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ قاسم صاحب کے دورِ وزارت میں جب یہ بل پیش ہوا تھا

تو زمینداروں نے زمین و آسمان سر پر اٹھا دیا تھا کہ اس سے ان کے بنیادی، پیدائشی، فطری اور غیر فطری حقوق پامال ہونے کا اندیشہ ہے۔ کاشتکار نالاں تھے کہ اس سے ان کو کوئی فوری فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اب ایک ڈیڑھ سال کی مغز ماری کے بعد جو قانون پاس ہوا ہے اس سے نہ زمیندار خوش نظر آتا ہے اور نہ کاشتکار۔ لیکن حکومت بہت خوش نظر آ رہی ہے کہ اس نے بالآخر یہ قانون پاس کر لیا ہے۔ جہاں تک کوہ کن کا تعلق ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ نئے قانون پر عمل درآمد کرنے سے اس کے حقوق کس طرح متاثر ہوں گے اس کی زمین پر اس کا کتنا استحقاق برقرار رہے گا اور کتنا کم ہو جائے گا۔ سُنا ہے کہ نئے قانون کی رو سے جو شخص خود زمین کاشت نہیں کرتا، اسے زمین کی ملکیت سے محروم کر دیا جائے گا۔ یہ بھی سُنا ہے کہ جو لوگ اپنی خود کاشت نہیں کرتے، لیکن اس قانون کے بعد سب کام چھوڑ کر زمین کی کاشت کرنے کے لیے تیار ہوں، انہیں ایسا کرنے کی اجازت ہوگی۔ سُننے میں یہ بھی آیا ہے کہ بڑے بڑے باغات کے مالکان پر بھی یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے کہ وہ ایک تو رقبے سے زیادہ کی اراضی اپنے پاس نہیں رکھ سکتے، غرض جتنے منہ اتنی باتیں، لیکن ایک بات بالکل طے ہے اور وہ یہ کہ نئے قانون سے وزیر مال میرزا محمد افضل بیگ کے علاوہ کوئی خوش نہیں اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بھی خوش نہیں ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جن ممبروں نے اسمبلی کی منتخبہ کمیٹی میں اس کی حمایت کی، انہوں نے بھی بحث کے دوران اس کی نکتہ چینی کی لیکن اس کے باوجود بل پاس ہو گیا، اور اسے کہتے ہیں خدا کی قدرت۔ سنا ہے کہ اب اس بل کو قابلِ فہم بنانے کے لیے ایک اور مسودہ قانون تیار کیا جا رہا ہے۔

۳۰ر جولائی ۱۹۷۶ء

کشمیری مسلمان کی شکایت

کشمیریوں کی سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ اُن کو قدم قدم پر شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ کوئی انصاف پرست اس شکایت کو بے بنیاد قرار نہیں دے سکتا۔ کیا وجہ ہے کہ کشمیری مسلمانوں کو اس تعداد میں مرکزی محکمہ جات اور فوج میں بھرتی نہیں کیا جاتا جتنی تعداد میں کشمیری ہندوؤں کو کیا جاتا ہے۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ ہندوستانی لیڈرشپ میں ایسے کانگریسی بھی شامل ہیں جو ہندوستان کے اندر سیاسی مسائل حل کرنے کا ایک نظریہ رکھتے ہیں اور کشمیر میں ایسے ہی مسائل کو حل کرنے کے لیے متضاد نظریہ رکھتے ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان کی ہر ریاست میں عام انتخابات آزادانہ ہوتے رہے ہیں لیکن کوئی حق پرست کشمیر کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ الیکشن کمشنر کتنا ہی دیانتدار ہو اور وہ کمال ایمانداری سے انتخابات کی نگرانی کرتا ہو، کشمیر میں اُس کی ایمانداری اور اصول ایک طرف رہ جاتے ہیں اور وہ اس پر تیار ہو جاتا ہے کہ برسر اقتدار پارٹی کی جابے جا حمایت کر کے ووٹوں کی صندوقچیوں کو توڑ دے اور عوام کو اپنے حق سے محروم رکھے۔ ہندوستان کے کسی حصہ میں سیاسی دنگا یا فسادیوں پر پولیس کو گولی چلانا پڑے اور موتیں واقع ہوں تو فوراً جوڈیشل تحقیقات کی جاتی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس کشمیر کے معاملے میں معنی خیز خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔

☆☆☆

۳۰ر جولائی ۱۹۷۶ء

دوردرشن کا سجدہ سہو!

جن دوستوں نے حال ہی میں بمبئی میں مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات ودیا چرن شکلا کی سرگرمیوں اور پھر اُن کے بیانات پر ذرا غور سے نظر رکھی ہوگی انہیں معلوم ہوگا کہ ہماری وزارت نشریات کے یہ مختار مطلق وہاں کے فلم پروڈیوسروں سے اس بات کی بھیک مانگنے گئے تھے کہ کسی طرح سے ہندوستانی دوردرشن کی ڈوبتی ہوئی نیّا کو ڈوبنے سے بچانے میں ہماری مدد کیجیے۔ چنانچہ ان کی منت سماجت کے بعد آخر کار ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت اب بمبئی کے پروڈیوسر زیادہ فیاضی اور زیادہ آزادی سے اپنی فلمیں دوردرشن پر دکھانے کے لیے پیش کیا کریں گے۔ پہلے پانچ سال کی فلمیں دوردرشن پر دکھائی جاتی تھیں لیکن اب پرڈیوسروں نے صرف دو سال پرانی فلموں کو دوردرشن کے لیے بھیجنے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ اس کے علاوہ فلمی دُنیا کے ستاروں، فلمی گلوکاروں، موسیقاروں اور دوسرے چھوٹے بڑے لوگوں نے شکلا جی کی ڈھارس بندھائی ہے کہ وہ باقاعدگی سے دوردرشن کے پروگراموں میں شرکت کر کے اس کے پروگراموں کی ''بوریت'' کو کسی حد تک کم کرنے میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں گے ۔ وزارت اطلاعات کے سربراہ کی اس قلابازی کا جائزہ اُن دعوؤں کے پس منظر میں کیا جانا چاہیے جو وہ ہندوستانی فلموں میں اصلاح کے متعلق کیا کرتے تھے۔ شکلا جی اور ان کے ماتحتوں نے کئی بار بلکہ بار بار کہا ہے کہ بمبئی کے فلم سازوں کو فلمیں بنانے کا سلیقہ نہیں آتا اور انہوں نے اپنی بے سرو پیر کی فلموں سے ہندوستانی سماج کا حُلیہ بگاڑا ہے۔ اگر یہ بات سچ تھی تو دوردرشن کو اپنے دروازے ان فلموں کے لیے بند کرنا چاہئے تھے لیکن ہوا اس

کے برعکس، اس کے بالکل برعکس، یعنی اب دوردرشن ہندوستانی فلموں کا ڈھنڈورچی بنے گا اور بس۔

شُکلا جی کے اس پینترے کی وجوہات سمجھا مشکل نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ٹیلی ویژن عوام کی پسندیدگی حاصل کرنے میں بُری طرح ناکام رہا ہے۔ دہلی میں تو ٹیلی ویژن بکواس کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ کشمیر میں جو دوردرشن کی حالت ہے وہ ہم آپ سبھی جانتے ہیں۔ امرتسر کو لاہور کا مقابلہ کرنا ہے اور اس لیے وہاں سے کبھی کبھی اچھے پروگرام دیکھنے کو ملتے ہیں۔ صرف بمبئی کا ٹیلی ویژن کسی قدر مقبول ہے اور اس میں فلمی ستاروں کی چمک دمک کا خاص حصہ ہے۔ اس سے پیشتر کہ لوگ اپنے ٹیلی ویژن سیٹ بیچ ڈالتے شُکلا جی کو عقل آ گئی ہے اور وہ فلم کی بیساکھی کے سہارے دوردرشن کا بھرم قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن خیال رہے کہ یہ سب کچھ تفریحی مقصد کے لیے نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس کا بڑا مقصد ہے کہ فلمی ستاروں کے پنکھ لگا کر سیاستدانوں کی بے مغز اور بے مایہ تقریروں کو عوام کے لیے قابل قبول بنایا جائے۔

۱۹ر جون ۱۹۷۶ء ☆☆☆

کشور کمار کا جُرم

کون کن مشہور فلمی ستارے کشور کمار کا پنکھا یعنی Fan نہیں ہے، وہ اس کی اداکاری یا گلوکاری سے زیادہ اس بات سے متاثر ہے کہ اُس نے ہندوستانی سکرین کی سب سے حسین اداکارہ مدھو بالا سے شادی کی تھی۔ اور اب اپنے بیٹے سے بھی کم عمر کی اداکارہ یوگیتا بالی سے دوسری بلکہ تیسری شادی رچالی ہے ۔موصوف کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ مزاحیہ اداکار اور گلوکار ہیں۔ میں ان کی

مزاحیہ اداکاری کا تو نہیں لیکن ان کی گلوکاری کا کچھ کچھ معترف ہوں۔ کشور کمار کے بارے میں کوہ کن کو اپنے تاثرات بیان کرنے کی نوبت نہ آتی اگر پچھلے دنوں آل انڈیا ریڈیو سے اُن کے گانے نشر کرنے اور ٹیلی ویژن سے اُن کی فلمیں دکھانے پر پابندی عائد نہ ہوئی ہوتی۔ (تازہ ترین اطلاع کے مطابق اب یہ پابندی اٹھا دی گئی ہے)۔ میں نے کئی بار اس پابندی کی وجوہات جاننے کی کوشش کی لیکن مصدقہ طور پر کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ اُڑتی ہوئی خبر کے مطابق کشور کمار کو یہ سزا اس لیے دی گئی تھی کہ انہوں نے کئی سرکاری یا غیر سرکاری تقریب میں شریک ہونے سے معذوری ظاہر کی تھی۔ (دروغ برگردن راوی) وجہ کچھ بھی ہو، میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ کشور کمار کی کسی مفروضہ گستاخی کے لیے آل انڈیا ریڈیو سے اُن کے گانے نشر کرنے اور ٹیلی ویژن سے ان کی فلمیں دکھانے پر پر پابندی عائد کرنے کا کون سا قانونی یا اخلاقی جواز تھا؟ اور وزارت اطلاعات ونشریات کے کس تیس مار خان نے، اپنی ناراضگی یا ناپسندیدگی کے اظہار کا یہ نیا انداز اختیار کیا ہے؟ کشور کمار جائے بھاڑ میں مجھے اُس کی پروا نہیں، لیکن اُس کے گانوں اور اس کی فلموں پر پابندی کا مسئلہ ایک اصول سے تعلق رکھتا ہے اور سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے معاشرے میں اصول، اخلاق، اقدار اور آداب کی کوئی اہمیت ہے یا نہیں؟ کشور کمار کے گانے نشر کرنے پر اگر اس لیے پابندی عائد ہوئی ہوتی کہ وہ فحش اور گھٹیا ہیں تو میں یہ فلسفہ کسی حد تک سمجھ سکتا ہوں، لیکن پھر یہ پابندی صرف کشور کمار کے گانوں پر ہی کیوں تمام فحش اور بے ہودہ گانوں پر کیوں نہیں؟ اسی طرح ان کی فلمیں دکھانے پر اگر اس لیے پابندی عائد کی گئی ہوتی، کہ وہ پست معیار اور سُست رفتار ہیں، تو مجھے اس دیوانگی میں بھی ایک معقولیت نظر آتی ہے، لیکن پھر

اس امتیاز کے لیے صرف کشور کمار ہی کو کیوں منتخب کیا گیا؟ صاف ظاہر ہے کہ کشور کمار کے جرم کا اُن کے گانوں اور ان کی فلموں کے معیار سے کوئی تعلق نہیں اور یقیناً وزارت اطلاعات ونشریات کے کسی بارسوخ حاکم نے اپنی تیس مارخانی کا مظاہرہ کرنے کے لیے ایک انتہائی نامناسب، غیر اخلاقی اور قابلِ افسوس قدم اٹھایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اخبارات پر سنسر شپ کی پابندیوں کی وجہ سے اس معمولی سے مسئلے پر کھل کر بحث نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہوسکتے کہ ایمرجنسی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر کچھ لوگ ایسی حرکتیں کریں کہ جس سے ایمرجنسی کے مثبت فائدوں کے متعلق بھی عام ذہنوں میں شکوک اور شبہات پیدا ہوجائیں۔ ظاہر ہے کہ کسی فلمی اداکار یا گلوکار کی فلموں اور گانوں پر پابندی کے معمولی مسئلے کے متعلق وزیراعظم مسز اندرا گاندھی سے صلاح و مشورہ نہیں کیا گیا ہوگا۔ لیکن جن لوگوں نے اس قسم کی فسطائی ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے، انہوں نے یقیناً وزیراعظم کے اعتماد اور اعتبار کا صحیح استعمال نہیں کیا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مرکزی وزارتِ داخلہ کے اربابِ اقتدار ''آئینہ'' کے ایک ایک لفظ کا بغور مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ کشور کمار کے مسئلے کے متعلق وزیراعظم کو میرے جذبات کی شدّت اور میرے سخت احتجاج سے آگاہ کریں۔

صدر ہسپتال کی لِفٹ

گزشتہ تیس برسوں میں ہم نے زندگی کے ہر شعبے میں اتنی ترقی کی ہے کہ جو گزشتہ تین سو سال میں نہیں کی تھی۔ تعلیم ہو یا صنعت، سڑکیں ہوں یا عمارات صحت عامہ ہو یا زراعت، سیاحت ہو یا جنگلات، زندگی کا کوئی شعبہ ترقی کے

اس برق رفتار عمل سے محفوظ نہیں رہ سکا ہے۔ اس پس منظر میں اب اُس خبر کا جائزہ لیجیے، کہ جو اس اخبار کی ایک حالیہ اشاعت میں صفحہ اول پر شائع ہوئی تھی اور جس کا تعلق نہ تعلیم سے تھا، نہ صحت عامہ سے، نہ جنگلات سے اور نہ زراعت سے، اس کا تعلق صدر ہسپتال سرینگر میں نصب شدہ اس لفٹ سے تھا کہ جو پورے ۳۵ برس کے بعد چالو ہو گئی تھی۔ میں گزشتہ بیس بائیس برس سے کسی نہ کسی بہانے صدر ہسپتال جاتا رہا ہوں اور اس لفٹ کے بارے میں، میں نے ہمیشہ یہی سنا ہے کہ ۱۹۴۵-۴۱ء میں ہسپتال کی تعمیر مکمل ہونے کے ساتھ ہی یہ لفٹ بھی فٹ کر دی گئی تھی لیکن اس کے مقدر میں ایک بار بھی نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے آنا نصیب نہ ہوا۔ گزشتہ ۲۷ برسوں میں کئی حکومتیں آئیں اور گذر گئیں۔ ریاست کی تعمیر و ترقی پر کروڑوں نہیں، اربوں روپیہ صرف کیا گیا۔ نئے نئے ہسپتال بنے، دس دس لاکھ روپے کا ایک ایک پل بنا، شہر میں اتنا بڑا سٹیڈیم تعمیر ہوا کہ اس میں بیک وقت ساٹھ ستر ہزار لوگ بیٹھ سکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن سٹیشن، جو صرف چند سال پہلے ایک دیوانے کا خواب معلوم ہوتا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے ایک حقیقت بن گیا۔ بانہال پہاڑ کا جگر چیر کر اس میں ایک [illegible] نکالی گئی جس نے اس پہاڑ کے غرور کو پاش پاش کر دیا۔ یہ سب کچھ ہوا، لیکن صدر ہسپتال کی اس لفٹ کو کوئی چالو نہیں کر سکا۔ بخشی صاحب [illegible] کے محاذ پر [illegible] کام [illegible] صادق صاحب [illegible] اس محاذ پر کامیابی حاصل نہ کر سکے، [illegible] نکالا، [illegible] ایسا لگتا ہے کہ [illegible] شیخ محمد عبداللہ کے

ہی سر رہنا تھا اور اسی لیے یہ نیک کام ان ہی کے دور میں تکمیل پذیر ہوا۔ حیرت اس بات کی نہیں ہے کہ ہسپتال کی لِفٹ چالو ہوگئی، بلکہ تعجب اس بات کا ہے کہ اس معمولی سی بات کی طرف آج تک کسی نے توجہ کیوں نہیں دی۔ معلوم ہوا ہے کہ لِفٹ کی مرمت پر اب کی بار صرف اڑھائی سو روپے خرچ ہو گئے ہیں۔ کیا کروڑوں روپے خرچ کرنے والے اس لِفٹ پر اڑھائی سو روپے خرچ نہیں کر سکتے تھے؟ یہ ایک ایسا معمہ ہے کہ جس کا جواب بخشی صاحب، صادق صاحب اور قاسم صاحب ہی دے سکتے ہیں۔ ان میں سے دو بزرگ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ تیسرے صاحب کو اتنی زبردست لِفٹ مل گئی ہے کہ وہ ہسپتال کی اس لِفٹ کو اب کوئی لِفٹ دینے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔

صادق صاحب سے کابلی صاحب تک

گزشتہ ہفتے انگریزی روزنامے ''ٹائمز آف انڈیا'' میں ایک صاحب کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے، کہ جس میں انہوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ مسٹر درگا پرشاد در کی یادگار منانے کے لیے کل ہند اور ریاستی سطح پر ایک میموریل کمیٹی قائم کی گئی ہے لیکن تحریک حریت کشمیر کے ایک اہم رہنما اور ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے ایک سرکردہ رکن، خواجہ غلام محمد صادق کے تئیں اس قسم کے کسی جذبے کا اظہار نہیں ہوا ہے۔ فاضل مراسلہ نگار نے کانگریسی رہنماؤں کو دیا دلایا ہے کہ ملک کی آزادی سے پہلے اور اس کے بعد صادق صاحب کا رول کتنا شاندار اور قابل فخر رہا ہے۔ کوہ کَن کے دل میں بھی یہ بات ایک عرصے سے کھٹک رہی تھی کہ ہندوستان کے اکثر رہنماؤں نے غلام محمد صادق کو کچھ اس طرح بھلا دیا ہے کہ جیسے ہندوستان اور کشمیر کے رشتے

کو مضبوط اور با مقصد بنانے میں ان کا کوئی رول ہی نہیں تھا۔ کوہ کن ڈی، پی صاحب کا بہت بڑا امداح ہے اور اسے ان کی بے وقت موت کا بے حد افسوس ہے لیکن جس طریقے اور جس سطح پر اس ریاست اور ملک میں ان کے کارناموں کو پیش کر کے ان کی یادگار قائم کرنے کا فیصلہ ہوا ہے اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ان کے دوسرے ہمعصروں کی ہماری تاریخ اور تحریک میں کوئی اہمیت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ خود ڈی، پی صاحب کی روح کو بھی اس سے تکلیف پہنچتی ہوگی کہ ان کی مدح سرائی کرنے والے، ان کے ان ساتھیوں کو قطعی نظر انداز کر رہے ہیں کہ جن کی بدولت وہ کامیابی کی بلندیوں کو چھونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ڈی، پی صاحب کی شان میں کسی گستاخی کا ارتکاب کیے بغیر میں یہ کہوں گا کہ نظریاتی صحت، ذاتی دیانت، اعتقادات کی سلامتی، مستقل مزاجی کردار کی عظمت اور تاریخی رول کی اہمیت کے اعتبار سے ڈی، پی صاحب اپنی تمام تر کامیابیوں کے باوجود صادق صاحب کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ہندوستان کی ترقی پسند تحریک سے صادق صاحب کا رشتہ نظریاتی بنیاد پر قائم تھا اور غالباً اسی لیے پردیش کانگریس اور دوسرے کانگریسی لیڈروں کی نگاہوں میں ان کی زیادہ وقعت بھی نہیں اور مجھے یہ دیکھ کر زیادہ تعجب نہیں ہوتا۔

۲۳/جون ۱۹۷۶ء ☆☆☆

تحریک اور تواریخ

پیر محمد افضل مخدومی آج تین ہفتوں سے صدر ہسپتال میں بے ہوش پڑے ہوئے ہیں، تاریخ تحریک حُریت کشمیر کا مورخ طاقت گویائی سے محروم ہے اور وہ ہاتھ جو تحریک کے بھولے بسرے واقعات کو اپنے زورِ قلم سے پھر زندگی بخش

رہا تھا بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ اُن کے احباب اور اقارب ایک پُر ملال خاموشی کے ساتھ برابر اُن کی عیادت کر رہے ہیں اور دستِ دُعا بلند کیے ہوئے ہیں کہ اس شگفتہ، خلیق اور شفیق بزرگ کو جلد صحت اور شفا حاصل ہو۔

مخدومی صاحب کی علالت نے ایک بار اس اہم مسئلے کو ذہنوں میں تازہ کیا ہے کہ تحریک آزادی کشمیر کی مُستند تاریخ کی تکمیل کب تک بے نیازی اور بے التفاتی کا شکار ہوتی رہے گی۔ ہماری شاندار تحریک پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں سے سب سے مشہور پنڈت پریم ناتھ بزاز کی تاریخ ہے۔ لیکن جیسا کہ ہونا بھی چاہیے، ان انفرادی مورخین کی کتابیں ذاتی پسند و ناپسند اور شخصی تفسیر و تاویل سے معمور ہیں، اور ان کتابوں کے علاوہ بھی تحریک کے متعلق کچھ قیمتی دستاویزات اور معلومات ادھر اُدھر بکھری پڑی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ابھی بفضل خُدا ہمارے درمیان تحریک حُریت کے وہ رہنما اور کارکن موجود ہیں، جنہوں نے اس تحریک کی علمبرداری اور آبیاری کی۔ عمر رواں کا قافلہ غیر محسوس طریقے پر جاری ہے اور پرانے بادہ کش ہماری بزم سے اُٹھتے جا رہے ہیں۔ اب بھی موقع ہے کہ ہمارا قومی شعور اپنی بیداری کا مظاہرہ کرے اور اس سے پہلے کہ یہ ستارے ایک ایک کر کے وقت کے بیکراں سمندر میں ڈوب جائیں، ہمیں ان کی کرنوں سے اپنے قومی حافظے کا دامن منور کر لینا چاہیے۔ کوہ کن کی رائے یہ ہے کہ تحریک آزادی کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے سرکاری سطح پر اقدامات کیے جانے چاہئیں۔ یہ آئندہ نسلوں اور ہمارے مستقبل کا ہم پر فرض ہے، اور جتنی جلد ادا ہو، ہمارے لیے اتنی سرخروئی کا باعث بنے گا۔

گھر کی مرغی دال برابر

پچھلے دنوں یہاں ڈی، پی صاحب کی پہلی برسی کے موقعے پر گورنر ایل

کے جھانے ریاست کے کچھ شاعروں اور ادیبوں کو ممتاز خدمات انجام دینے اور اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کے سلسلے میں اعزازت عطا کیے۔ ان میں سرینگر کے علاوہ جموں سے آنے والے کچھ ادیب بھی شامل تھے۔ دوسرے روز ٹیلی ویژن سنٹر نے مشاعرے کی ایک خصوصی نشست منعقد کی اور اُس میں اُن تمام شاعروں کو مدعو کیا گیا جو مادھو پور پار سے آئے تھے۔ مادھو پور کے اُس پار آنے والوں میں کچھ اچھے شاعر تو ضرور موجود تھے لیکن اُن میں کچھ تُک بند اور لچّر نویس بھی شامل تھے لیکن چونکہ اُن پر ریاست کے کسی حصّے سے وابستہ ہونے کی تہمت نہیں تھی لہٰذا وہ ٹیلی ویژن کے اہلکاروں کے لیے خصوصی مہمانوں کی حیثیت کر گئے، جن کا مناسب اعزاز اور اکرام کیا گیا۔ اس بزم میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا گیا کہ کسی ریاستی باشندے کو اس میں شرکت کا موقعہ نہ ملے۔ چنانچہ جن شاعروں کو اعزاز دینے کے سلسلے میں مادھو پور پار سے آنے والے شاعر بلائے گئے تھے اُن کے آگے بھی گھاس نہیں ڈالی گئی۔ ایک غیر ریاستی شاعر نے جب اس امتیاز کی وجہ اپنے مقامی دوست شاعر سے پوچھی تو اُس نے ایک زہر خند کے ساتھ مرزا غالب کا یہ شعر پڑھا۔

میں نے کہا کہ بزمِ ناز غیر سے چاہیئے تہی!
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا، کہ یوں

۱۷ر جون ۱۹۷۶ء

☆☆☆

عروجِ آدمِ خاکی

ہم ایک ایسے عہد میں رہ رہے ہیں کہ بڑے سے بڑا معجزہ بھی اب ہمیں حیرت میں ڈالنے کے لیے ناکافی ہے۔ ابھی چند سال پہلے جب انسان نے چاند

مرتبہ چاند کی سرزمین پر قدم رکھا تھا، تو ہمارے بہت سے مولویوں اور پنڈتوں نے اسے بے ایمان اور چارسوبیس انگریزوں کی اڑائی ہوئی افواہ قرار دے کر اپنے دل کو خوش اور عوام الناس کو گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن مولوی اور پنڈت صاحبان کی سخت مزاحمت کے باوجود تسخیر کائنات کے متعلق بے ایمان انگریزوں کی اڑائی ہوئی افواہیں اس شدت کے ساتھ پھیلتی گئیں کہ چاند کو فتح کرنے کے بعد اب زمین سے کروڑوں میل کی دوری پر واقع سیارے مریخ پر بھی انسانی عظمت اور کافروں کی بے ایمانی کے جھنڈے لہراتے ہوئے نظر آ رہے ہیں اور عام لوگ امریکی سائنس دانوں کی اس غیر معمولی، حیران کن اور نا قابلِ یقین کامیابی پر اس درجہ خوش اور مغرور ہیں کہ جیسے تسخیر کائنات کے اس عظیم ڈرامے میں خود ان کا بھی حصہ ہو۔ مریخ پر وائیکنگ اول اور وائیکنگ دوئم کا اترنا، ان کا وہاں کی زندگی، آب وہوا، درجہ حرارت اور ماحول کے متعلق بیش قیمت معلومات فراہم کرنا، یہ سب کچھ اتنا متوقع اور معمولی معلوم ہوتا ہے کہ اس پر بظاہر حیران ہونے کی ضرورت ہی معلوم نہیں ہوتی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ چھ سال قبل جب انسان نے چاند کی سرزمین پر قدم رکھا تھا تو میں ساری رات ریڈیو سے کمنٹری سُن سُن کر انسانی تاریخ کے اس سب سے حیرت انگیز ڈرامے میں شریک رہا تھا لیکن اب میں ان معجزات کا اس درجہ عادی ہو گیا ہوں کہ مریخ پر انسانی فتح و کامرانی کی نا قابلِ یقین خبر سن کر میرا پہلا ردِعمل یہ تھا کہ یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں، ایسا تو ہونا ہی تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے حیرت انگیز معجزے اب ہماری زندگی کا معمول اور ہماری فکر کا ایک حصہ بن گئے ہیں اور اس بات کا اندازہ اور تصور کیے بغیر کہ ان معجزوں کی تخلیق میں انسان کی فکر، اس کے تخلیقی شعور اور

اس کے خونِ جگر کا کتنا بیش قیمت سرمایہ شامل ہے ہم عروجِ آدم خاکی پر اس طرح فخر کرتے رہتے ہیں کہ جیسے یہ ہمارا ہی کارنامہ ہو اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ احساس کچھ غلط بھی نہیں۔

مریخ پر وائیکنگ اول کا اترنا انسانی تاریخ اور تہذیب کا ایک ایسا کارنامہ ہے کہ اس کی اہمیت اور اس کے مضمرات کو سمجھنے کے لیے ایک تربیت یافتہ ذہن اور ایک پختہ نظر کا ہونا ضروری ہے۔ چاند کی تسخیر، تسخیر کائنات کی طرف انسان کا پہلا فیصلہ کن قدم تھا۔ مریخ کی فتح، آسمان کے اسرار کھل جانے کی ابتداء ہے، اب کلیجہ تھام کے اُن ستاروں اور سیاروں کی حکایت سن لیجیے، کہ جو ہم سے ہزار دس ہزار، لاکھ دس لاکھ نہیں، دس کروڑ میل سے بھی زیادہ دوری پر واقع ہیں، عام حالات میں اس افسانے پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا، لیکن اس کا کیا کیجیے کہ آج کے افسانے کل کی حقیقت سے زیادہ پُر اسرار اور قابلِ اعتبار ہیں اور اسی لیے اب کوئی بات نا قابل یقین یا عملی نہیں دکھائی دیتی۔ اندازہ کیجیے کہ ہم کتنے بڑے عہد میں رہ رہے ہیں اور اپنی بڑائی پر فخر کیجیے۔

رویندر کا ایثار

صرف ایک ماہ قبل مدراس کا رویندرؔ ایک بے نام، بے کار اور بے یار و مدد گار نوجوان تھا۔ زندگی سے مایوس اور اپنے مستقبل کے متعلق ہزار ہا اندیشوں میں مبتلا، لیکن آج رویندر ایثار، انسانی ہمدردی اور بے لوث خدمت کی ایک بہت روشن علامت کے طور پر سارے دیش میں مشہور ہے۔ اِس کی عزت افزائی کے لیے جلسے ہوتے ہیں، جن میں بڑے بڑے وزیر بھاشن دیتے ہیں اور ملک کے نوجوانوں کو روندر کی مثال سے سبق حاصل کرنے کا درس دیتے

ہیں اور بے چارہ رویندر کا صرف یہ قصور ہے کہ اس نے چنڈی گڑھ ہسپتال میں چھ بچوں کی ایک ماں کی جان بچانے کے لیے اپنے ایک گردے کی نہ صرف پیشکش کی، بلکہ گردے کا دان دینے کے لیے براہ راست مدراس سے چنڈی گڑھ پہنچ گیا۔ رویندر کی بروقت قربانی نے سنتوش گپتا کی جان بچائی اور اس کے عوض رویندر کو وہ شہرت اور عزت ملی، جو اسے زندگی بھر مر مر کے جئے جانے سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ ابھی پچھلے دنوں راجدھانی میں رویندر کی عزت افزائی کے لیے ایک بڑا زوردار جلسہ ہوا، جس میں مرکزی وزیر خوراک شری جگ جیون رام اور وزیر صحت ڈاکٹر کرن سنگھ نے رویندر کے ایثار اور کردار کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اتفاق سے ڈاکٹر کرن سنگھ اور جگ جیون بابو دونوں اتنے کنجوس ہیں کہ وہ کسی کو گردہ تو کیا گردے کپورے کھلانے کے لیے پانچ روپے کی حقیر رقم بھی نہیں دے سکتے۔ جگ جیون رام کا بس چلے تو وہ اپنا انکم ٹیکس بھی ادا نہ کریں اور ڈاکٹر کرن سنگھ کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اپنی بے پناہ اور بے حد وحساب دولت کے باوجود سخت غربت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس پسِ منظر میں ان دونوں لیڈروں کا رویندر کے ایثار اور اس کی بے مثال قربانی کی تعریف کر کے نوجوانوں کو اس کے نقش قدم پر چلنے کی تحریک دینا، ہمارے لیے باعثِ حیرت نہیں، موجبِ تفریح ثابت ہوا ہے۔ بہر حال اس کے باوجود رویندر کا کارنامہ، قابلِ تعریف ہی نہیں، قابل تقلید بھی ہے اور اس کے ایثار کا سب سے قابلِ ذکر اور قابلِ فخر پہلو یہ ہے کہ گردے کی پیش کش سے پہلے وہ مریضہ سنتوش گپتا سے بالکل ناواقف تھا، اس نے صرف بمبئی کے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ چنڈی گڑھ ہسپتال میں ایک چھ بچوں کی ماں کے دونوں گردے خراب ہیں اور اسے ایک گردے کی ضرورت ہے جو اس کی

زندگی بچا سکتا ہے۔اس اخباری اشتہار کو پڑھنے کے فوراً بعد رویندر نے چندی گڑھ کا ٹکٹ لیا اور مریضہ کو اپنا گردہ پیش کر دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تین سال قبل ہمارے ہاں ایک نوجوان ڈاکٹر کو یہی ضرورت پیش آئی تو اس کے ماموں نے اپنا ایک گردہ اسے دینے کا فیصلہ کرلیا،آخری مرحلے پر اس کے جسم سے گردہ نکال کر اس کے بھانجے کو Transplant کرنے میں زبردست دقتیں آئیں ،کیوں ماموں جان کے عزیز واقارب نے آسمان سر پر اُٹھالیا اور میڈیکل انسٹی چیوٹ نئی دہلی کو تاریں دے دے کر اسے پریشان اور ہراساں کرنے کی کوشش کی ۔لیکن مرحبا ماموں جان پر کہ وہ اپنی ضد پر قائم رہے اور آج ماموں اور بھانجا دونوں بڑے مزے سے زندگی گزار رہے ہیں۔اس پسِ منظر میں رویندر اور اس کے والدین کا ایثار واقعی قابلِ داد ہے۔تازہ ترین اطلاعات کے مطابق رویندر کی اس بے مثال قربانی سے متاثر ہو کر تامل ناڈو کی حکومت نے اسے ملازمت دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔(اسے کہتے ہیں دیر آید درست آید)

نکاح خوانی یا وعظ خوانی

پچھلے دنوں مجھے اپنے ایک دوست کے صاحبزادے کی نکاح بندی کی رسم میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ مجھے اس سے پہلے کئی بار اِس بات کا تلخ تجربہ ہوا ہے کہ بعض نکاح خواں حضرات مجلس نکاح کو مجلس عمل کا اجلاس سمجھ کر ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو گھنٹے کی تقریریں جھاڑتے ہیں جس میں نکاح کی اہمیت اور فضیلت کے موضوع پر کم اور مسلمانان عالم کے زوال کے اسباب پر زیادہ روشنی ڈالی جاتی ہے۔اس لیے اب کی بار میں نے اطمینان کرلیا تھا کہ مولوی صاحب نکاح پڑھائیں گے،تقریر نہیں کریں گے،اور میں نے اسی شرط پر مجلس

نکاح میں شمولیت پر رضامندی بھی ظاہر کر دی تھی۔ مجلس نکاح حسب پروگرام نو بجے شروع ہوئی اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب ایک بظاہر پڑھے لکھے مولوی صاحب نے اس مجلس کو جلسہ عام سمجھ کر حاضرین کو اسلام کے بنیادی ارکان، مسلمانوں کے فرائض، ان کے کردار اور اعمال کی خامیاں، ان کے گفتار اور عمل میں تضاد کی طرف توجہ دلاتے ہوئے پورے ایک گھنٹے تک ان کی سمع خراشی کی۔ بالآخر جب سامعین اور مولوی صاحب دونوں تھک گئے تو ازراہ عنایت مولوی صاحب نے خطبۂ نکاح پڑھا اور اس طرح دس بجے ہماری خلاصی ہوگئی۔ میں نے بہت سی ایسی نکاحی مجلسوں میں بھی شرکت کی ہے کہ جہاں نکاح خواں مولوی نے کل پانچ یا دس منٹ میں ہی رسم نکاح ادا کی، میں نہیں جانتا، کہ ان مختصر نکاحی مجلسوں سے نکاح کی عظمت، اس کے تقدس اور اس کی نوعیت کس طرح متاثر ہوئی یا مجلس نکاح، نکاح خوانوں کی طویل طویل تقریروں سے ازدواجی تعلقات اور میاں بیوی کی اخلاقیات کس طرح اثر انداز ہوتی ہوں گی۔ میری دانست میں اس قسم کی مجلسوں کو خالص اس مقصد کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے کہ جس کے لیے یہ وضع ہوئی ہیں اور ہر مجلس کو وعظ کی مجلس بنانا مناسب نہیں۔ لیکن یہ میری ذاتی رائے ہے اور میں اس سلسلے میں علمائے دین کی رائے جاننے کا خواہشمند ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں ہادی برحق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا ارشاد ہے اور وہ خود کس طرح نکاح پڑھاتے تھے۔

☆☆☆

۲۹ر جولائی ۱۹۷۶ء

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو

جب زمانۂ حال اپنے دُکھ سُکھ اور نیک بد کے ساتھ گزر جاتا ہے تو اس کی یاد حسین بن جاتی ہے۔ اس لیے ماضی پرستی بہت سی قوموں کا شعار اور شیوہ بن چکی ہے لیکن سری نگر واسیوں کو کبھی کبھی لالچوک میں کھڑے ہو کر اُس ماضی کی یاد آ جاتی ہے، جو صرف وقت کی دوری کی وجہ سے خوبصورت نہیں لگتا بلکہ جو حقیقت کے کسی بھی پیمانے سے واقعی سُندر اور دلنواز تھا۔ یہ عوامی راج سے پہلے کی بات ہے۔ پرتاپ پارک کا دروازہ آج کے لالہ رُخ ہوٹل کے پاس کھُلتا تھا اور برابر ریگل چوک تک پارک کی وسعتیں لہلہاتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اُن دنوں یہ پارک اپنی وسعت اور طوالت کے باوجود آباد اور شاداب تھا جگہ جگہ پھولوں کی کیاریاں، ہر کیاری میں جھولا جھولنے کی سہولیات، ہر روش پر نشست کے لیے آرام دہ بنچیں اور کُرسیاں، اور چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی۔ یہ پارک خاص طور پر شام کو رونق کا مرکز ہوتا تھا اور عوام کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ یہاں موج منانے کے لیے اکٹھا ہوتے تھے۔ کبھی کبھی تو اندرونِ شہر کے باسی پرتاپ پارک میں ہوا خوری کے لیے ایسے ہی آتے تھے جیسے وہ آج کل نشاط اور شالا مار جاتے ہیں۔ پرتاک پارک کا ماحول اس قدر سکون پرور تھا کہ ''دانایانِ سرینگر'' یعنی شہر کے ریٹائرڈ بزرگوں نے اس کی مرکزی چوکی کو اپنا دربانِ عام بنا دیا تھا اور وہ شام چار بجے بڑے بڑے صافے باندھے وہاں دنیا جہاں پر قہقہے مارتے ہوئے نظر آتے تھے، لیکن آزادی کے بعد اچانک پرتاپ پارک کی مانگ اُجڑ گئی۔ پہلے تو اس کی وسعت پر آرے چلائے گئے اور شہر کے عین دل میں واقع صحت صفائی کے اس مرکز کی جگہ تراش لی گئی، بعد

میں اس کے اردگرد سالہا سال کی محنت سے لگائے گئے سفیدوں کی شاندار قطار کا قتلِ عام کیا گیا، اُس کے بعد اس پارک کو اناڑیوں اور بے ذوقوں کی تراش خراش کا نشانہ بنایا گیا، یہ نہیں کہ اس پر روپیہ خرچ نہیں کیا گیا بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ اس پر ضرورت سے زیادہ صرف ہوا لیکن اس کے باوجود یہ سب کچھ اتنے بے ہنگم طریقے اور بد مذاقی کے ساتھ کیا گیا کہ اس پارک کا حُلیہ ہی بگڑ گیا۔ اس کے مغربی حصے میں دُھول اُڑتی نظر آتی ہے اور اس حصے کو بس اڈے پر آنے جانے والے مسافر ایک ''اوپن ائیر باتھ روم'' کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں۔ کبھی کبھی جب جوابازی کے شوقین بچوں کو کہیں اور ٹھکانہ نہیں ملتا تو وہ اس پارک میں دادِ شجاعت دیتے نظر آتے ہیں۔ پارک کے بیچوں بیچ واقع مصنوعی جھیل میں گندے پانی پر کائی کی تہیں جمی نظر آتی ہیں اور یہ کیڑے مکوڑوں، مکھیوں اور مچھروں کی سرکاری سرائے بنی ہوئی ہے۔ اس پارک کی لُٹتی ہوئی جوانی دیکھ کر اگر کبھی کبھی شہرواسیوں کو حسین ماضی کی یاد ستانے لگے تو میرا خیال ہے کہ اُن کو قدامت پسند اور رجعت پرست کہہ کر سنگسار نہیں کیا جانا چاہیے۔

نئے مقبرے، نئے مُجاور

شری درگاہ پرشاد در کی پہلی برسی کے موقعے پر ٹیگور ہال میں جو جلسہ منعقد ہوا وہ اپنی کچھ خصوصیات کے لحاظ سے قابل توجہ تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ سٹیج اور ہال میں کانگریسی رہنماؤں اور کارکنوں کا مکمل غلبہ تھا، بلکہ یوں کہیے کہ نیشنل کانفرنس اور اس کے لیڈرانِ کرام کا کوئی نشان نظر نہیں آتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ کانفرنس کے عمائدین ضروری کام سے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے، لیکن جس

ضابطے اور قاعدے سے کانفرنس کے معمولی سی معمولی کارکن کی غیر حاضری کا اہتمام کیا گیا تھا، اُس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے پیچھے صرف اتفاق کا ہاتھ نہیں تھا اور بڑی بات تو یہ ہے کہ ڈی، پی صاحب کے پرانے دوست اور نیشنل کانفرنس کے صوبائی صدر خواجہ غلام محمد بٹ بھی بڑی فنکاری سے آنجہانی لیڈر کے ساتھ تعلقات کی ساری تاریخ کو بھول کر پتہ نہیں کون سے نئے رشتے اُستوار کرر ہے تھے۔ اسی طرح سٹیج پر ''پردیش کانگریس'' کے نئے ''شوبوائے'' عبدالرشید کابلی بھی نظر نہیں آئے۔ حالانکہ وہ اپنی تقریر دلپذیر کے ساتھ اپنے بازوؤں اور اپنی جسم کے انگ انگ کو جس انداز سے گھماتے اور نچاتے ہیں اُس کے پیش نظر وہ سیاسی سٹیج سے زیادہ اداکاری کے پلیٹ فارم پر بہتر نقشہ جما سکتے ہیں اور ٹیگور ہال اُن کی ایکٹنگ کے مظاہرے کے لیے بے حد موزوں جگہ تھی۔ بہر حال ان دوستوں کی جگہ ڈی پی صاحب کے دو پرانے مخالفوں نے لے لی تھی۔ موتی لال مصری، ڈی پی صاحب کے خلاف ''ہمارا کشمیر'' کے صفحات پر جو کچھ لکھ چکے ہیں، اُس کے پس منظر میں ڈی، پی صاحب کو اُن کا خراجِ عقیدت خاصے کی چیز تھا۔ دینا ناتھ نادم کو بھی ڈی پی صاحب نے کبھی مُنہ نہیں لگایا۔ مگر اُنہوں نے اُن کی یاد مناسب پیرائے میں تازہ کی۔ دراصل کشمیر کی سیاست اور ثقافت کے یہ دونوں تجربہ کار مسافر اب کثرتِ استعمال سے مقبروں کے مجاور بن گئے ہیں اور اُن کی فصاحت کے دریا اب صرف مرحوم لیڈروں کی تعزیت کے مواقع پر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نئے مجاوروں کے اس حلقے میں صرف پنڈت شیام لال صراف کی کمی نظر آرہی تھی لیکن اطلاع کے مطابق وہ ابھی سے پندرہ جولائی کو مرحوم بخشی غلام محمد کا یوم وفات منانے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ جس میں موتی لال مصری

صاحب اور دینا ناتھ نادم دونوں کی نوحہ گری کے نئے کرتب منظر عام پر لائے جائیں گے۔ ہر کیف بات ہو رہی تھی نیشنل کانفرنس کارکنوں کی، جو اپنی غیر موجودگی کی وجہ سے نمایاں تھے۔ کوہ کن کو اس موقعے پر پچھلے سال کی یاد آ گئی جب آنجہانی کے لیے آنسوؤں کی جھڑی لگا دینے میں کانگریس اور نیشنل کانفرنس کی کوئی حد حائل نہیں رہی تھی۔ ایک سال کے عرصے میں بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، شاید شاعر نے ایسے ہی مواقع کے لیے کہا تھا ؎

اِس کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا

تاشقند کا تحفہ!

''راج ترنگنی'' کے فاضل مترجم اور مؤلف سر آرل سٹائن نے یہ کلمہ کفر تحریر کیا ہے کہ اُن کی رائے میں کشمیر برصغیر ہند کا حصہ ہونے سے زیادہ مشرقِ وسطی کا ایک حصہ ہے۔ سر آرل نے اس سلسلے میں جغرافیائی، تمدنی، تواریخی، لسانی اور اقتصادی دلائل کے انبار لگا دیئے ہیں۔ لیکن عالموں اور فاضلوں کا کیا کہنا، وہ اپنے زورِ بیان سے سیاہ کو سفید اور دن کو رات ثابت کر سکتے ہیں۔ پھر بھی کوہ کن کے پاؤں کے نیچے اُس وقت زمین سِرک گئی جب اُس نے پچھلے روز دن دھاڑے اپنے ٹیلی وژن سیٹ پر تاشقند سے ٹیلی کاسٹ ہونے والا پروگرام اُبھرتا دیکھا۔ اگرچہ آواز صاف نظر نہیں آ رہی تھی لیکن شبیہہ اور امیج لاہور ٹی وی کی تصاویر کی طرح تھرک رہی تھیں۔ حُسنِ اتفاق یہ ہے کہ اس پروگرام کے ایک حصے میں مسز اندرا گاندھی کے حالیہ دورۂ روس کی کچھ جھلکیاں دکھائی جا رہی تھیں۔ کوہ کن کو اُس وقت سابق روسی وزیر اعظم نکولائی بلگانن کی وہ بات یاد آئی جو اُنہوں نے ۱۹۵۵ء میں سرینگر میں کہی تھی۔ اُنہوں

نے کہا تھا کہ کبھی ہماری ضرورت پڑے تو پہاڑ کی چوٹی سے ہمیں آواز دے دینا۔ خیر ہم اُنہیں کیا بلائیں گے مگر یوں لگتا ہے کہ انہیں ہماری یاد آئی تو اُنہیں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ اپنے ٹیلی ویژن سے سے ہمیں آنکھ مار کر اشارہ کر سکتے ہیں۔ دیکھئے روسی ریچھ کی اس آنکھ مچولی کا جواب سنکیانگ میں بیٹھا ہوا چینی اژدھا کس انداز سے دیتا ہے، رہے ہم کشمیر تو بقولِ میر

ناحق ہم مجبوروں پہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا

☆☆☆

۱۶/جون ۱۹۷۶ء

یکے دُزد باشد، یکے پردہ دار

پنڈت پریم ناتھ بزاز اس بات کے راوی ہیں کہ جب ۴۲ء میں اُن کی کتاب ''انسائیڈ کشمیر'' پر حکومت نے پابندی لگائی تو اُن کی کتاب کو اُس وقت کے چیف سیکریٹری مسٹر بھیم سین کے گھر میں پناہ ملی اور یہ کتاب وہیں سے چوری چھپے فروخت ہوتی رہی۔ موجودہ دور میں یہ روایت اُلٹی ہوگئی ہے۔ پہلے انقلابیوں اور مجاہدینِ آزادی کو روشن خیال اور محبِ وطن سرکاری ملازم پناہ دیتے تھے لیکن اب سرکاری ملازمین کی فضیحات کو چھپانے کے لیے رہنمایانِ قوم یعنی سیاسی لیڈرں کا سایہ دستیاب ہوتا ہے۔ ہمارا ویجی لینس کمیشن کچھ مدت سے غیر معمولی طور پر سرگرم ہو گیا ہے اور مشکوک شہرت کے سرکاری ملازمین کے دفتروں پر ہی نہیں بلکہ اُن کے گھروں میں بھی چھاپے ڈالے جا

رہے ہیں اور وہاں سے حیرت انگیز نمونے حاصل کیے جاتے ہیں۔ اس آفتِ ناگہانی کا مقابلہ کرنے کے لیے اس خاص قبیل کے سرکاری ملازموں نے جوابی تدابیر اختیار کرنا شروع کی ہیں۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے اور کوہ کن کی اطلاع کے مطابق سرکاری ملازمین کی نئی ضرورت کی اماں جان نے ایک نہایت ہی محفوظ اور سو فی صدی فُول پروف ایجاد کا صحت مند بچہ جنا ہے۔ یہ بات طے ہے کہ سرکاری ملازم اُس وقت تک اپنے دھندے کو کامیابی اور اعتماد سے نہیں چلا سکتا جب تک اس کی پیٹھ ٹھونکنے کے لیے پردے کے پیچھے کسی سیاستدان کی قوت موجود نہ ہو۔ چنانچہ اب اس قسم کے سرکاری ملازمین نے سر چڑھ کر بولنے والی نشانیوں کو دفتر یا گھر کی چار دیواری میں رکھنے کا خطرہ مول لینے کے بجائے اسے اپنے سیاسی سرپرستوں کے دار الامان میں ہی رکھنا شروع کر دیا ہے اور چونکہ سیاستدان ویجی لینس کمیشن یا کسی ایسی ہی ایجنسی کے ''شر'' سے محفوظ ہیں اور وہاں جاتے ہی ان کے پر جلنے لگتے ہیں، اس لیے اب انتظامیہ کو پاک بنانے کا دعویٰ کرنے والے خدائی فوجدار تلملا کر رہ جاتے ہیں اور اُن کے امکانی شکار سرکاری ملازم اُن کو چڑھانے کے لیے اپنی مونچھول پر تاؤ دیتے رہتے ہیں۔ یہ بات خدائی فوجداروں کے لیے خاص طور تکلیف دہ ہے کیونکہ کشمیری ضرب المثل کے مطابق بلی کا گھی چٹ کر جانا اتنا تکلیف دہ نہیں، ہوتا جتنا اُس کو گھی کھاتے ہوئے دم ہلاتے دیکھنے کا منظر ہوتا ہے۔ جب تک ہماری حکومت ہر سرکاری ملازم کو بد دیانت اور ہر سیاستدان کو دیانتدار سمجھنے کا مفروضہ ترک نہ کرے گی اس قسم کے حادثات پیش آتے رہیں گے۔

جون ۱۹۷۶ء

میونسپلٹی کی اُستاد پنچایت

بانڈی پور وادی کا ایک ایسا قصبہ ہے جو کئی لحاظ سے خاص امتیاز رکھتا ہے یہ بڑا مُر دم خیز علاقہ ہے اور آج بھی یہاں پڑھے لکھے اور سوچنے سمجھنے والے دوستوں کی تعداد خاصی ہے، یہ گریز کا دروازہ ہے اور ولر کا شہزادہ اور اگر اقبال کا خضر واقعی کہیں پر اس غور وفکر میں مصروف ہے کہ ہمالیہ کے چشمے کب تک اُبلتے رہیں گے تو وہ بانڈی پور کے نزدیک پہاڑ پر بنی ہوئی چوکی ہی ہوگی۔ اسی طرح یہاں پچاسی سالہ پٹھان قلندر کوثر صاحب کا نشیمن ہے، جہاں شہر سرینگر اور وادی کے دور دراز علاقوں سے بڑے بڑے حاکم، پروفیسر، ڈاکٹر اور دوسری جنتا حاجت روائی کے لیے آتی رہتی ہے۔ کوثر صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بڑے سے بڑے حاکم کو کڑوی بات اُس کے منہ پر سنانے سے گریز نہیں کرتے، اور اس لحاظ سے اُن کو سچے معنوں میں باغی قلندر کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کوہ کن کو سب سے زیادہ متاثر بانڈی پور میں پنچائتی پارکوں نے کیا۔ وہاں کا ''نشاط باغ'' تو حسین انتظام اور حسنِ ذوق کا ایسا نمونہ ہے کہ اُس کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ اسی طرح بانڈی پور بازار کے عین درمیان میں ایک چھوٹی سی پارک بنی ہے، حالانکہ اس کے چاروں طرف تارکول بچھی ہوئی سڑکیں ہیں اور بسیں اور موٹریں دھول اُڑاتی رہتی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ پارک اتنا خوبصورت اور صاف ستھرا ہے کہ عش عش کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ اس میں سبزے کی فراوانی ہی نہیں، پھولوں کی بہتات بھی ہے۔ کاش سرینگر میونسپلٹی کے اہلکار کچھ دنوں کے لیے بانڈی پور جا کر وہاں کی پنچایت کے ممبرں کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے۔ تو یقین ہے کہ سرینگر کے پارکوں کی

ویرانی میں کسی قدر کمی واقع ہو جاتی۔

☆☆☆

جولائی ۱۹۷۶ء

خطرناک دلیل

اتوار کو نئی دہلی میں نیشنل کانفرنس اور کانگریس کی رابطہ کمیٹی نے ایک میٹنگ میں یہ سفارش کی ہے کہ ریاست میں پنچایتوں، میونسپل کمیٹیوں اور دوسری لوکل باڈیز کے انتخابات ملتوی کیے جائیں۔ کوہ کن کو رابطہ کمیٹی کے اس مطالبے پر حیرت نہیں ہوئی لیکن انتخابات ملتوی کیے جانے کے لیے کمیٹی نے جو جواز پیش کیا ہے، اس پر وہ حیران ہی نہیں حد درجہ پریشان ہے اور اسے اس بات پر تعجب ہے کہ مرزا محمد افضل بیگ اور ٹھاکر دیوی داس جیسے ماہرین قانون نے اس مطالبے میں فریق بننا کیسے گوارا کر لیا؟ کمیٹی کی رائے میں یہ تمام انتخابات ملتوی کیے جانے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ انتخابات مقررہ اور معینہ تاریخوں پر کرائے جائیں تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ تخریب پسند عناصر اس موقع سے فائدہ اٹھا کر فساد اور گروہ بندی کی آگ کو ہوا دیں گے۔ کمیٹی کے ممبران کی رائے میں اس قسم کے عناصر اکثر انتخابات کے مقصد کو ہی فوت کر دیتے ہیں۔ اس لیے اس بات کی کوشش کی جانی چاہیے کہ گزشتہ ایک سال کے دوران بڑی محنت اور کاوش سے تیار کیے گئے پُرامن ماحول کو ہر قیمت پر برقرار رکھا جائے اور کوئی ایسا کام نہ کیا جائے کہ جس سے اس خوشگوار ماحول میں رخنہ پڑنے کا امکان ہو۔ کمیٹی نے یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ اس ماحول کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کا موقع فراہم کرنا نہ صرف غلط ہوگا بلکہ سخت نقصان

وہ بھی۔ میں نے جیسا کہ عرض کیا ہے کہ مجھے پنچایتی انتخابات ملتوی کیے جانے کی خبر سے کوئی حیرت نہیں ہوئی ہے، مجھے خود اس بات کا احساس ہے کہ نیشنل کانفرنس اور کانگریس کے درمیان معرکہ آرائی کے امکانات کو کم کرنے کے لیے پنچایتی انتخابات کا ملتوی کیا جانا ضروری بن گیا تھا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب تک دونوں جماعتوں کے درمیان انتخابات کے متعلق کوئی مفاہمت نہیں ہوتی ان کے درمیان تصادم اور ٹکراؤ کا اندیشہ باقی رہے گا اور اسی لیے دونوں جماعتوں کے لیڈر اس حادثے کو ٹالنے کی کوششیں کر رہے ہیں، اور میرا خیال ہے کہ ان کوششوں کا جاری رہنا ضروری ہے۔ لیکن انتخابات کو ملتوی کرنے کے لیے یہ بہانہ تراشنا کہ اس سے تخریب پسند عناصر کو فساد اور تخریب کاری کا موقع ملے گا یا یہ کہ اس قسم کے عناصر انتخابات کے مقصد کو ہی فوت کر دیں گے، ایک انتہائی شرانگیز اور غیر جمہوری رجحان ہے۔ اس قسم کی دلیل سید میر قاسم اور شری اوم مہتہ کو تو زیب دیتی ہے کیونکہ حکمران جماعت کے لیے انتخابات رفتہ رفتہ ایک غیر ضروری اور تکلیف دہ عمل کی صورت اختیار کر رہے ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ مدت تک انتخابات کو ٹالنے کے لیے کوشاں ہیں لیکن مرزا محمد افضل بیگ اور ٹھاکر دیوی داس کو کس حکیم نے یہ مشورہ دیا ہے کہ جو دوائی سید میر قاسم اور شری اوم مہتہ کے لیے مفید ہے وہی ان کی صحت اور توانائی کے لیے بھی موزوں ہے۔ وزیر اعظم مسز گاندھی نے پچھلے ایک سال کے دوران بارہا اپنی تقریروں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ جمہوریت میں انتخابات ہی سب کچھ نہیں ہوتے اور ظاہر ہے کہ یہ موقف مسز گاندھی کے نئے رول سے بڑی مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ان کے اس دعویٰ کو بلا چوں چرا تسلیم کر لیں، وہ جو کچھ کہہ رہی ہیں، بے حد اہم ہے اور ان کے نکتۂ نگاہ اور

ان کی ضروریات کے مطابق ٹھیک ہے، لیکن مرزا بیگ اور ڈی، ڈی ٹھاکر دونوں جانتے ہیں کہ انتخابات کے بغیر جمہوریت کا تصور ناممکن ہے اور اپنی تمام تر خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود انتخابات ہی جمہوریت کی بقاء اور اس کے استحکام کی ضمانت ہیں۔ اس لیے کوہ کن کو اس بات پر حیرت ہوئی ہے کہ ان دونوں لیڈروں نے انتخابات کے عمل کے خلاف ایک ایسی دلیل کو قبول کر لیا ہے کہ جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ انتخابات نہ صرف غیر ضروری ہیں بلکہ ایک ایسا خطرناک عمل، جس کا نتیجہ تفرقے، گروہ بندی اور فساد کے سوا کچھ نہیں۔ ایک طرف سے ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ملک میں سب کچھ ٹھیک ہے، رجعت پسند قوتوں کو حکومت اور عوام نے مل کر زبردست شکست دی ہے، چاروں طرف امن و امان کا دور دورہ ہے قیمتیں گر گئی ہیں، خوراک کی افراط ہے وغیرہ وغیرہ۔ دوسری طرف ہم یہ کہتے ہیں کہ انتخابات اس لیے نہیں کرائے جا سکتے کہ رجعت پسند اور تخریبی عناصر اس پُر امن ماحول کو درہم برہم نہ کر دیں۔ اس دلیل کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر آئندہ پچاس برسوں کے لیے انتخابات ملتوی کرنے کا جواز بھی بہم ہو جاتا ہے، کیونکہ رجعت پسند اور تخریبی عناصر ہمیشہ پُر امن ماحول درہم برہم کرنے کے درپے ہوں گے اور اس خطرے کے پیشِ نظر ہم انتخابات ملتوی کرتے جائیں گے۔

بیگ صاحب اور ٹھاکر صاحب کو یاد ہو گا کہ اس ملک میں چین کے حملے کے بعد بھی انتخابات ہوئے ہیں۔ انہیں یاد ہو گا کہ بنگلہ دیش کے بحران کے بعد بھی یہاں انتخابات ہوئے ہیں، لیکن تخریبی عناصر کا ہوا ۱۹۷۵ء کے بعد ہی کھڑا کر دیا گیا ہے اور تعجب یہ ہے کہ اب شیخ محمد عبداللہ کی حکومت نے بھی اس ہُوّے کو حقیقت کے طور پر تسلیم کر کے تمام انتخابات کو جون ۱۹۷۷ء تک ملتوی

کرنا مان لیا ہے۔ میری دانست میں یہ اصولی طور پر غلط ہے۔ سیلاب یا دوسری وجوہات کی بناء پر انتخابات ملتوی کرنا قابلِ فہم ہے، اور موجودہ تلخ حقائق کے پیش نظر کوہ کن اس التواء کو گوارا کرنے کے لیے تیار ہے، لیکن انتخابات کو ایک شر انگیز، تکلیف دہ اور خطرناک عمل قرار دے کر ملتوی کرانا، بجائے خود ایک خطرناک کھیل ہے۔ ان تمام انتخابات کو جون ۱۹۷۷ء تک ملتوی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ فروری ۱۹۷۷ء میں ریاستی اسمبلی کے انتخابات ہونے کا کوئی امکان نہیں اور مجھے حیرت ہے کہ رابطہ کمیٹی نے آنے والے انتخابات کے متعلق اپنا فیصلہ اور رویہ صادر کرنے میں کیوں اتنی عجلت سے کام لیا۔ میرا دعویٰ ہے کہ انتخابات سے تخریبی عناصر کا فائدہ اٹھانے کی دلیل نہ صرف ایک غیر جمہوری دلیل ہے بلکہ اس رسم کو ختم کرنے کی کوششوں کا آغاز۔ میں نہیں جانتا کہ ریاستی حکومت کے قانون دان، اس خوبصورت چوہے دان میں پھنسنے کے مضمرات کو سمجھتے ہیں یا نہیں؟

اُردو نوازی کا فریب

آج کل راجدھانی دہلی میں اُردو کا بڑا زور وشور ہے۔ پچھلے مہینے گلزار زتشی کا جشن منایا گیا، اور جشن میں بڑے بڑے مرکزی وزیر اور کانگریسی لیڈر شریک ہوئے، اور اُنہوں جی بھر کر گلزار زتشی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد جشن عزیز وارثی منعقد ہوا۔ جس میں سرکردہ وزیر اور کانگریس کے صدر مسٹر بروا نے بھی شرکت کی اور اُردو کی تعریف میں بڑی دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ گلزار زتشی اور عزیز وارثی کے ادبی کارناموں اور ان کی شعری تخلیقات کا منصب کیا ہے ا؟ انہیں خراج عقیدت پیش کرنے والے رہنما ان

کے کلام سے واقف ہیں بھی یا نہیں؟ یہ الگ بحث ہے لیکن ان شاعروں کے جشن منانا اور پھر ان میں شرکت کر کے اُردو کی مدح میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا، مجھے کچھ معنی خیز معلوم ہوتا ہے۔ اور تو اور اب کی بار مشہور اُردو شاعر جان نثار اختر کی موت کا بھی اعلیٰ سطح پر سوگ منایا گیا۔ جس میں سرکردہ کانگریسی رہنماؤں نے ان کی ادبی خدمات کو سراہا۔ اُردو کے ساتھ سرکاری حلقوں اور حکمران جماعت کی یہ غیر معمولی دلچسپی دیکھ کر مجھے بے اختیار غالب کا یہ شعر یاد آرہا ہے۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آیا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اور اس شعر کی موزونیت اور معقولیت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ایک طرف اُردو کی یہ خاطر داری ہو رہی ہے اور دوسری طرف آل انڈیا ریڈیو کو یہ ہدایت ہوئی ہے کہ وہ خبروں کے اُردو بلیٹن میں وزیر اعظم کی بجائے پردھان منتری، صدر جمہوریہ کی بجائے راشٹر پتی، نائب صدر کی بجائے اپ راشٹر پتی اور آل انڈیا ریڈیو کی بجائے آکاش وانی کے الفاظ استعمال کریں۔

☆☆☆

۲۶/اگست ۱۹۷۶ء

جمہوریت کی تعریف

ہندوستان کے عوام اور خواص آزادی کی جدو جہد کے دوران ہی جمہوریت کے لفظ اور اس کے اصطلاحی معانی سے اس درجہ مانوس ہو گئے تھے، کہ گزشتہ ۲۷، ۲۸ برسوں میں کبھی کسی شخص کو جمہوریت کی تعریف جاننے کی ضرورت ہی محسوس

نہیں ہوئی۔ ہر شخص کے لیے جمہوریت کا وجود اور اس کے معانی ایک مسلمہ حقیقت تھے اور عام لوگ مسلمہ حقائق کو آنکھیں بند کر کے تسلیم کرتے ہیں، لیکن پچھلے ایک ڈیڑھ سال کے دوران جمہوریت کے معانی اور جمہوری نظام کی تعریف Definition میں کچھ ایسا ابہام پیدا ہوا ہے یا کیا گیا ہے کہ وہ کن کے خیال میں جمہوریت کے اس تصور کی یاد تازہ کرنا ضروری بن گیا ہے کہ جس سے اس ملک کے عوام اور خواص ہی نہیں، ساری دُنیا کے جمہور پسند عوام مانوس ہیں۔

مثلاً یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ جمہوریت کے قیام اور استحکام کی بنیادی شرط یہ ہے کہ ہر شخص کو تحریر و تقریر کی مکمل آزادی حاصل ہو۔ اخبارات اور اخبار نویس ہر قسم کے دباؤ سے آزاد ہوں، اور اخبار والوں کو یہ نہ بتایا جائے کہ انہیں کون سی خبر شائع کرنی چاہیے، اور کون سی نہیں۔ اسی طرح اخبار والوں کو سرکاری ملازم سمجھ کر انہیں ترقی کا لالچ اور تبدیلی کا خوف دلانا، جمہوری نظام میں ناپسندیدہ ہی نہیں ناممکن سمجھا جاتا ہے، اخبارات کو ملک کی سب سے بڑی شخصیت یا اس کے خاندان کے کسی بھی فرد کے خلاف بھی اظہار رائے کی مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے اور ہونی چاہیے اور جس نظام یا معاشرے میں یہ آزادی حاصل نہ ہو، اسے جمہوری نظام یا معاشرہ کہنا سیاسی بددیانتی اور حد درجہ کی ریاکاری ہے۔

جمہوری نظام کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قانون کی عمل داری ہوتی ہے اور وزیراعظم سے ایک ادنیٰ فقیر تک ہر شخص قانون کی نگاہوں میں برابر ہوتا ہے۔ کسی شخص کو صرف اس کے خاندانی رتبے سیاسی مرتبے یا صاحب اقتدار لوگوں سے قربت کی بناء پر کوئی خصوصیت یا مراعات حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ جمہوری ممالک میں قانون اندھا ہوتا ہے اور وہ امیر، غریب بادشاہ اور

گدا میں فرق نہیں کرتا، جس ملک میں ایک بھی انسان قانون سے بالاتر سمجھا جائے یقین کیجیے کہ اس ملک میں جمہوریت کا خاتمہ اور ڈکٹیٹر شپ کا آغاز ہوتا ہے۔

جمہوری نظام میں حکومتیں عوام کی مرضی سے بنتی اور اکھڑتی ہیں اور عوام کی مرضی جاننے کے لیے ہر معینہ مدت کے بعد بالغ رائے دہندگی کی بنیادوں پر آزادانہ انتخابات عمل میں لائے جاتے ہیں۔ جس ملک میں انتخابات نہ ہوں ،اُس ملک کو جمہوری ملک کہلانے پر بھی اصرار نہیں کرنا چاہیے (کوہ کن وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے اس خیال سے متفق نہیں کہ جمہوریت کے لیے انتخابات ہی سب کچھ نہیں، جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ انتخابات سب کچھ نہیں ہیں لیکن یہ جمہوریت کی بنیاد ہیں اور اس بنیاد کے بغیر جمہوریت ڈکٹیٹر شپ میں بدل جاتی ہے)

جمہوری نظام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نظام میں ایک مقررہ معیاد کے بعد عام انتخابات ہونا ضروری ہوتے ہیں اور یہ احتیاط اس لیے روا رکھی گئی ہے کہ کہیں ایک بار برسر اقتدار آنے والی جماعت زیادہ سے زیادہ مدت تک برسر اقتدار رہنے کے لیے انتخابات کو پہلے غیر معین عرصے تک ملتوی نہ کرے، اور بالآخران کی ضرورت سے ہی انکار نہ کرے۔

جمہوری نظام میں ہر فیصلہ کثرت رائے سے ہوتا ہے لیکن اس نظام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اقلیت کی آواز کو بڑے غور اور بڑی توجہ کے ساتھ سنا جاتا ہے۔ جمہوریت کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ اس میں اکثریت والی جماعت حکومت کرتی ہے اور اقلیت شور شرابہ، جس طرح اکثریتی جماعت کی حکومت جمہوریت کی خصوصیت ہے، اسی طرح اقلیتی جماعت کا شور شرابہ بھی ، جمہوریت کا ہی ایک ناگزیر حصہ ہے۔ جس ملک میں صرف

اکثریتی جماعت ہی کو تحریر و تقریر کی آزادی حاصل ہو، وہ ملک جمہوریت کا دعوے دار ہونے کے باوجود جمہوری ملک نہیں بلکہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس ملک کے دروازے پر ڈکٹیٹر شپ دستک دے رہی ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے، جمہوری نظام میں ہر شخص قانون کی نگاہوں میں برابر کا درجہ رکھتا ہے۔ اسی لیے جس ملک میں جمہوریت کا چلن ہو، وہاں کسی شخص کو کسی قانون یا ضابطے کی خلاف ورزی کے بغیر گرفتار یا نظر بند نہیں کیا جا سکتا۔ جمہوریت میں فرد کی آزادی کو اولین اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اس آزادی کا احترام کرنا حکومت کا قانونی اور اخلاقی فرض ہوتا ہے۔ اس لیے جس ملک میں فرد کی آزادی کسی تھانیدار، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا کسی بڑے حاکم کے بیٹے یا بیٹی کے رحم و کرم پر ہو اس ملک میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن جمہوریت باقی نہیں رہتی۔

جمہوری نظام میں عدالتیں صرف فرد اور فرد کے درمیان ہی نہیں، حکومت اور فرد کے درمیان بھی انصاف کرنے کا فرض انجام دیتی ہیں، اور اس لیے عدالتیں اپنے دائرہ کار میں مکمل طور خود مختار اور غیر جانبدار ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ جمہوری معاشرے میں عدالتوں کے اختیار اور وقار کو نقصان پہنچانے کی ہر کوشش توہین عدالت کے زمرے میں شامل سمجھی جاتی ہے۔ یہاں آئین اور قانون بنانے کی ذمہ داری لیجسلیچر پر عائد ہوتی ہے اور اس کی تشریح و تفسیر کا کام عدالتیں انجام دیتی ہیں۔ جس ملک میں عدالتوں کو ایک غیر ضروری بدعت سمجھ کر ان کے اختیار اور وقار کو کم کرنے کی مہم میں حکومت بڑھ چڑھ کر حصہ لے، اس ملک میں جمہوریت کا وجود اور اس کا مستقبل خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

جس ملک میں نشر و اشاعت کے سرکاری ذرائع کو پرائیوٹ اشخاص یا کسی خاص سیاسی جماعت کے مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے استعمال کیا جائے

وہ ملک اور کچھ ہوسکتا ہے لیکن جمہوریت کا دعویٰ دار نہیں ہوسکتا۔ جس ملک میں صرف ایک یا دو آوازیں سنائی دیں وہ ملک نہ آزاد ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہے اور نہ جمہوری ہونے کا، الغرض جمہوریت کی تعریف اتنی واضح اور مکمل ہے کہ اس کے معانی اور مفہوم کے سلسلے میں کسی کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔ جو لوگ ہندوستان کے موجودہ نظام کو جمہوری کہنے پر مُصر ہیں، انہیں جمہوریت کی تشریح وتفسیر کے لیے مروجہ ضابطوں کو چھوڑ کر کچھ نئے ضابطے وضع کرنا چاہئیں ورنہ ان کی ہر خواہش اور کوشش بے کار ثابت ہوگی۔

میر واعظ کی سادگی

اور لوگ کچھ بھی کہیں مجھے اپنے میر واعظ مولوی محمد فاروق کی سادگی پر بڑا پیار آتا ہے۔ ان کی باتوں میں ایک بچے کی سی معصومیت ہوتی ہے کہ ان پر پیار نہ آنا بڑا مشکل ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ دشتِ سیاست میں بارہ سال کی صحرانوردی کے باوجود سیاست دانوں کی چالاکی، پُرکاری اور عیاری سے محفوظ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ ساری دُنیا کو اس پر اعتبار کرنا ہی پڑے گا۔ ابھی چند دن پہلے انہوں نے عوامی مجلس عمل کے ضلع بارہ مولہ کے کارکنوں سے میر واعظ منزل سرینگر میں خطاب کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان حال ہی میں جو مفاہمت ہوئی ہے، وہ عوامی مجلس عمل کی دوراندیشانہ پالیسیوں کا بھی نتیجہ ہے۔

اب آپ ہی بتائیے کہ مولانا کے حسنِ ظن اور ان کی سادگی پر پیار نہیں آئے گا، اور ہاں اس بات کو ذہن میں رکھیئے کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے انہیں اس پر خود بھی یقین ہے، بارہ مولہ کے عہدیداروں کے سامنے اپنی تقریر دلپذیر

میں انہوں نے ایک اور دلچسپ انکشاف بھی فرمایا، اور وہ یہ کہ چند سال قبل انہوں نے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لیے جس سہ فریقی گول میز کانفرنس کی تجویز پیش کی تھی، اس کو روبہ عمل لانے کے امکانات روشن تر ہوتے جارہے ہیں۔ مولانا نے یہ دعویٰ حالات اور ماحول کے کس پہلو کو زیرنظر رکھ کر کیا ہے یہ جاننے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ بات خاص دلچسپ ہے کہ مولانا اپنی کہی ہوئی بات، جسے عرف عام میں موقف کہا جاتا ہے، پر بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ ڈٹے رہتے ہیں اور دنیا کچھ سے کچھ ہو جائے وہ اپنی ہی بات کہتے جاتے ہیں۔ اب دیکھیے حالات کیا سے کیا ہو گئے اور ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا سے کیا ہو گئی؟ لیکن مولانا کو ان تمام باتوں کا کوئی غم بلکہ علم ہی نہیں۔ وہ اپنی سہ فریقی گول میز کانفرنس کی بات دہرائے جاتے ہیں۔ انگریزی میں اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے Ignorance is Bliss اور کوہ کن اس کا انگریزی ترجمہ کر کے میر واعظ صاحب کی سادگی کا مذاق نہیں اڑانا چاہتا۔

☆☆☆

۱۹/اگست ۱۹۷۶ء

شامتِ اعمال یا شامتِ بے عملی

ریاست میں سیلاب کی تباہ کاریوں سے ابھی تک پچاس کے قریب افراد جان بحق ہو گئے ہیں۔ سینکڑوں مکانات منہدم ہو چکے ہیں، اور ہزاروں ایکڑ زمین برباد ہو چکی ہے۔ اس تباہی و بربادی پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے اور رنج و غم کا یہ احساس اس خیال سے کچھ زیادہ گہرا ہو جاتا ہے کہ اگر پچھلے آٹھ دس برسوں

میں سیلاب پر قابو پانے کی دیر پا سکیموں پر عمل کیا جاتا، تو آج ریاست کے طول و عرض میں اس درجہ جانی اور مالی نقصان نہ ہوا ہوتا۔ بہرحال یہ ایک الگ بحث ہے، اور اس پر مفصل اظہارِ خیال کو میں اس وقت ملتوی کرتا ہوں۔ آج سیلاب کے موضوع پر اپنے جواں سال، جوان فکر اور بیان باز میر واعظ، مولانا محمد فاروق صاحب کے تازہ ترین ارشادات کا جائزہ لینا چاہتا ہوں، عین اس وقت جب وادی کے مختلف مقامات پر ہزاروں لوگ اپنی جانوں پر کھیل کر خونخوار دریاؤں اور بے قابو ندی نالوں کا رُخ بدلنے کی جنگ میں مصروف تھے، مولانا صاحب نے جامع مسجد کے محفوظ منبّر سے یہ فتویٰ جاری کر دیا کہ بڑھتے ہوئے پانی اور چڑھتے ہوئے دریاؤں کی تباہ کاریاں دراصل ہمارے بُرے اعمال کا نتیجہ ہیں اور جب تک ہم اپنے اعمال ٹھیک نہیں کرتے، قہرِ الٰہی کی شکل میں اس قسم کے حادثات رونما ہوتے رہیں گے۔ کوہ کن کو عام حالات میں مولانا کے اس بیان پر اعتراض نہ ہوتا لیکن اس کے خیال میں قہرِ الٰہی اور خدا کی خدائی کا یہ تصّور نہ صرف غلط ہے بلکہ حد درجہ غیر اسلامی بھی ہے اور مولانا جیسے عالم دین کو اس قسم کے تصّورات اور توہمات کو فروغ دینے کے شعوری یا غیر شعوری عمل سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میر واعظ صاحب کو دینی علوم کے ساتھ ساتھ جغرافیہ، تاریخ اور سائنس کے کچھ مضامین پڑھنے کا بھی موقع ملا ہوتا، تو وہ رب العالمین پر اس قسم کی تہمت عائد نہ کرتے۔

مولانا صاحب کو یہ سُن کر شاید تعجب ہو کہ صرف تیس چالیس سال قبل چیچک، کالرا، طاعون اور اسی نوعیت کی دوسری بیماریوں کو بھی، اس وقت کے مولانا اور میر واعظ، ہمارے بُرے اعمال کا نتیجہ قرار دے کر قہرِ الٰہی سے تعبیر کیا کرتے تھے، لیکن آج وہ عالم ہے کہ چیچک کے کسی بیمار کا پتہ دینے والے کو

ایک ہزار روپے انعام دیئے جانے کی پیش کش ہے، اور پچھلے ایک سال سے ایک بھی شخص نے یہ انعام حاصل نہیں کیا ہے، اسی طرح ہیضے اور طاعون کی جس بیماری سے ہر سال ہزاروں لوگ مر جایا کرتے تھے۔ ان کا نام اب شاذ و نادر ہی سُنا جاتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا پچھلے تیس چالیس برسوں میں ہمارے اعمال اتنے سدھر گئے ہیں کہ اب ہم پر قہر الٰہی نازل ہونا بند گیا ہے؟ مولانا اس رائے سے یقیناً متفق نہیں ہوں گے، کیوں کہ ان کی دانست میں ہمارے اعمال اور اخلاق روز بروز خراب ہوتے جارہے ہیں اور اگر یہ صحیح ہے تو میں میر واعظ صاحب سے یہ دریافت کرنا چاہوں گا کہ اب چیچک، کالرا اور طاعون عذاب الٰہی کی علامتیں کیوں نہیں رہیں۔ مولانا کو شاید کشمیر کی کوئی مستند تاریخ پڑھنے کا بھی موقع نہیں ملا ہے ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ کشمیر کی تاریخ میں بڑے خطرناک سیلاب آئے ہیں اور ان سیلابوں سے آج کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ نقصان ہوا کرتا تھا لیکن یہ پچھلے دس سالوں کے دوران سیلاب پر قابو پانے کی کچھ سکیموں کا ہی نتیجہ ہے، کہ اتنے خطرناک سیلاب کے باوجود جانی اور مالی نقصان کا دائرہ آج اتنا وسیع نہیں ہے کہ جتنا دس پندرہ یا تیس سال پہلے ہوا کرتا تھا، اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ آج ہمارے اعمال، ہمارے اسلاف کے اعمال سے بہتر ہیں۔ مولانا کے لیے اگر سیلاب کے موضوع پر بیان دینا ضروری ہی تھا تو انہیں یہ کہنا چاہیے تھا کہ سیلاب کی موجودہ تباہ کاریاں حکومت کے تغافل، اس کی لا پروائی اور غیر ذمہ داری کا نتیجہ ہے اور حکومت کو سیلاب کی روک تھام کے لیے جامع اور موثر سکیموں پر عمل کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس انہوں نے غیر شعوری اور غالباً غیر ارادی طور پر حکومت کی کوتاہیوں اور ناکامیوں پر پردہ ڈال کر ان کے لیے ایک جواز فراہم کیا ہے۔

آج سے پچاس برس پہلے حکومتیں مولویوں اور پنڈتوں کو اسی طرح عوام کی توجہ اصل مسائل سے ہٹا کر انہیں قہر الٰہی اور معیشت ایزدی کے فلسفے میں الجھانے کے لیے استعمال کیا کرتی تھیں۔ مولانا کو غیر شعوری طور پر حکومت کا آلہ کار نہیں بننا چاہیے۔ کوہ کن کا دعویٰ ہے کہ اگر اس ریاست کی حکومت نے پچھلے دس برسوں میں سیلاب پر قابو پانے کی سکیموں پر سنجیدگی سے عمل کیا ہوتا تو ہمارے خونخوار دریا اور ندی نالے اپنی طغیانی کے باوجود ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ مولانا کو شاید اس بات کا علم نہیں ہوگا کہ امریکہ، جاپان اور روس جیسے بد اعمال ملک میں سیلابوں پر مکمل فتح حاصل کر لی گئی ہے، اور وہاں سیلاب کے پانی کو اس طرح زیر کر لیا گیا ہے کہ وہ نقصان پہنچانے کی بجائے فائدہ مند ہو جاتا ہے۔ کیا ان لوگوں کے اعمال، ہمارے اعمال کے مقابلے میں بہتر ہیں؟ مولانا کو کسی کم بخت نے یہ بتانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی ہے کہ امریکہ میں اخلاقی بے راہ رویوں اور بد اعمالیوں کا یہ عالم ہے کہ وہاں زنا اور شراب نوشی کو گناہ سمجھنے کی بجائے زندگی کی روح سمجھا جاتا ہے۔ انہیں شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ روس میں خدا کا نام لینا یا بچوں کو مذہبی تعلیم دینا سنگین جرائم میں شامل ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں اللہ تعالیٰ سیلابوں کی شکل میں قہر الٰہی نازل نہیں کرتا۔ بلکہ ان دونوں بدمعاش ممالک کو زندگی کے ہر شعبے میں فتح پر فتح حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سیلابوں اور ان کی تباہ کاریوں کو ہمارے بُرے اعمال سے نہیں، ہماری بے عملی سے تعلق ہے اور اگر ہم فطرت کو تسخیر کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جائیں تو خدا تعالیٰ ہم سے ناراض ہونے کی بجائے ہماری قدم قدم پر مدد کرے گا، اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے مولانا سے ایک بات اور دریافت کرنا چاہوں گا، اور وہ یہ کہ سیلاب کی

تمام گزشتہ اور حالیہ تباہ کاریوں میں صرف غریبوں اور ناداروں کے مکانات اور زمینیں ہی کیوں غرقاب ہو جاتی ہیں ؟ کیا انہوں نے آج تک کسی امیر، وزیر یا سفیر کے ڈوبنے کی خبر سُنی ، کیا انہوں نے آج تک کسی رئیس کے بنگلے کے زیر آب ہونے کی افواہ سنی ؟ کیا انہوں نے سرینگر کلب یا امر سنگھ کلب (جہاں دن رات شراب نوشی ہوتی ہے یا جوا کھیلا جاتا ہے) کو کوئی نقصان پہونچنے کی خبر سُنی ؟ یہ کیا وجہ ہے کہ سیلاب کا نزلہ عام طور پر بے چارے غریب دیہاتیوں اور لاچار مزدروں پر ہی گرتا ہے؟ کیا خدا تعالیٰ کو صرف ان غریبوں کے ہی اعمال پر نظر ہے اور وہ آپ جیسے امیروں کے اعمال سے اس درجہ مطمئن ہے کہ ان پر پر اپنا قہر الٰہی نازل کرنے سے ڈرتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ سیلاب کی یہ تعبیر اور قہر الٰہی کی یہ تفسیر خدا کی خدائی کے ساتھ انصاف تصور نہیں ہوگا اور جو شخص خدا کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا وہ اس کے بندوں کے ساتھ کیا انصاف کرے گا۔

جے ، جے سنگھ

جے ، جے سنگھ اڑھائی سال کی طویل بیماری کے بعد '' قید حیات '' سے آزاد ہو گئے ہیں اور یہ خبر سن کر کوہ کن کے دل اور ذہن سے جیسے منوں بوجھ اُتر گیا ہو، پچھلے دو سال کی بیماری نے انہیں اتنا نحیف اور لاغر بنا دیا تھا کہ ان میں زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ اچھا ہوا کہ انہیں اور ان کی بیوی بہن جی کو اس عذاب سے نجات مل گئی ہے۔ جے جے سنگھ کی عمر ۷۶ برس کی تھی اور وہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ امریکہ میں صرف کر کے جب ہندوستان آئے تو انہوں نے امریکی لیبرلزم سے متاثر ہو کر ہندوستان میں بھی شخصی آزادی ،

عظمتِ آدم اور آزادیٔ تحریر و تقریر کے اصولوں کی علمبرداری کی۔ کشمیر کے معاملے میں شروع سے ان کا یہ موقف تھا کہ کشمیری عوام پر کوئی فیصلہ ٹھونسا نہیں جانا چاہیے اور یہاں کے مستند رہنماؤں سے مفاہمت کیے بغیر اس مسئلے کا کوئی حل نہیں۔ پچھلے ایک دو سال سے تو مکھن لال فوطیدار جیسے لوگ بھی شیخ صاحب سے مفاہمت کی خوبیوں کو سمجھنے لگے ہیں، لیکن جے جے سنگھ نے اس وقت مفاہمت کی بات کی تھی جب شیخ صاحب سے مفاہمت کی بات کرنا سنگین جرم تھا۔ اس طرح جے جے سنگھ پاکستان سے دوستی کے بھی علمبردار تھے اور انہوں نے اسے اپنی زندگی کا مشن بنا دیا تھا۔ افسوس کہ اس وقت جب کہ ان کی دلی مراد بھر آنے والی تھی وہ اب اس دنیا سے ہی چلے گئے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ انہیں پاکستان کے ساتھ سفارتی تعلقات اور ریلوے سفر کی بحالی کا علم تھا یا نہیں، کیونکہ ایک عرصے سے ان کا ذہن تقریباً مفلوج تھا۔ بہر کیف جے جے کی موت ایک عظیم انسان اور کشمیری عوام کے ایک بہترین دوست کی موت ہے اور ہم سب ان کے خاندان کے ساتھ اس غم میں شریک ہیں۔

☆☆☆

۱۱؍اگست ۱۹۷۶ء

شہری ہوابازوں کی حماقتیں

دنیا کہاں سے کہاں پہونچ گئی مگر ہم لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہیں۔ امریکی سائنس دانوں نے زمین سے کروڑوں نہیں، اربوں میل دور مریخ پر سراغ رسانی کا محکمہ قائم کرلیا، لیکن ہمارے ہاں کے ہوائی اڈوں پر ابھی تک تصویر لینا سخت جرم ہے، کے سائن بورڈ لگے ہوئے ہیں۔ ابھی دو سال پہلے کی بات ہے

کہ السٹر ٹیڈ ڈ ویکلی کے مدیر خشونت سنگھ، جنہیں اب لوگ خوشامد سنگھ کہنے لگے ہیں سرینگر تشریف لائے اور ہمارے ہاں ایک نوعمر سیاستدان کو ٹھیک سرینگر کے ہوائی اڈے پر ان کے ساتھ فوٹو کھچانے کا شوق ہوا۔ انہوں نے خشونت سنگھ کو راضی کر لیا اور اپنے ایک دوست کو تصویر کھینچنے کی زحمت دی، تصویریں دھڑا دھڑ کھچی جانے لگیں اور چند لمحوں بعد حفاظتی دستے کے کسی مستعد کارکن نے یہ سارا امر واقعہ دیکھ لیا۔ ہمارے حفاظتی دستے فوراً حرکت میں آ گئے اور انہوں نے نہ صرف خشونت سنگھ اور نوعمر سیاستدان کو تنبیہہ کی بلکہ سارا فلم ضبط کر لیا، آپ کو سن کر شائد تعجب ہو کہ پچھلے دو سال سے یہ فلم مرکزی وزارت شہری ہوا بازی میں محفوظ ہے، اس دو سال کے عرصے میں خشونت سنگھ، خوشامد سنگھ بن گئے اور نوعمر سیاستدان محمد شفیع شیدا، یوتھ کانگریس سے بہت بے آبرو ہو کر نکال دیئے گئے۔ لیکن ہوائی اڈے پر کھچی گئی تصویریں شہری ہوا بازی کے گودام میں بہ حفاظت موجود ہیں۔ اور اسی قسم کے بے ہودہ اور بے ہنگم واقعات، ہمارے ہوائی جہازوں اور ہمارے اڈوں پر روز مرہ کا معمول بن گئے ہیں۔ اگر آپ کو دہلی اور سرینگر کے درمیان کوہ کن ہی کی طرح بار بار ہوائی سفر کرنے کا اتفاق ہو، تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ جموں سے بانہال کے اوپر اڑان کرتے ہوئے نیچے کا منظر کتنا خوبصورت اور دلکش دکھائی دیتا ہے۔ اس بے پناہ خوبصورتی اور دل کشی سے متاثر ہو کر میں نے بارہا غیر ملکی سیاحوں کو بے خودی کے عالم میں چلاتے ہوئے دیکھا ہے اور کچھ من چلے ان لافانی مناظر کو اپنے کیمروں میں محفوظ کرنے کے لیے تصویریں کھینچنا شروع کر دیتے ہیں لیکن ایئر ہوسٹس یا سیٹو ارڈ فوراً انہیں خبردار کرتے ہیں کہ ہوائی جہاز سے تصویریں کھینچنا منع ہی نہیں سخت منع بلکہ جرم ہے۔ اور وہ بڑی حسرت سے اپنا

کیمرہ بند کر کے یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ہندوستان کتنا پسماندہ ملک ہے اور یہاں شہری ہوابازی کا کاروبار کرنے والے کتنے جاہل اور بیوقوف ہیں۔ ہوائی اڈوں پر تصویریں کھینچنے کی ممانعت اس دور کی یادگار ہے کہ جب کیمرہ صرف سوڈیڑھ سو یا زیادہ سے زیادہ دوتین سو گز کے فاصلے پر ہی تصویریں کھینچ سکتے تھے، اور خطرہ اس بات کا تھا کہ کوئی دشمن ہوائی اڈوں کی تصویر کھینچ کر اس بات کا تعین نہ کر سکے کہ ہمارے اڈوں کی ساخت، ان کا محل وقوع اور ان کی ترتیب کیا ہے اور یہ معلومات جنگ کے زمانے میں ہمارے خلاف استعمال نہ کی جاسکیں۔ ہوائی جہازوں پر سے تصویریں کھینچنے کی بھی اسی خیال سے ممانعت کی گئی تھی کہ کہیں دشمن ہماری فوجی اہمیت کے علاقوں کی تصویریں حاصل کر کے انہیں ہمارے خلاف جنگ میں استعمال نہ کر سکے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب کیمرہ تکنیکی اعتبار سے دوتین سو گز سے زیادہ کے فاصلے کی تصویر نہیں لے سکتا تھا، اور ان دنوں یہ احتیاط کچھ معنی بھی رکھتی تھی لیکن آج ایسے ایسے کیمرے ایجاد ہوئے ہیں کہ انسان سوڈیڑھ سو گز سے نہیں چالیس پچاس ہزار فٹ کی بلندی سے ایسی مکمل اور واضح تصویر کھینچ سکتا ہے کہ اس میں ذرے ذرے کی تفصیل آسکتی ہے۔ ہمارے ہاں کے شہری ہوابازی کو معلوم ہوگا کہ آٹھ سال قبل امریکہ کے......

ہوائی جہاز نے اسی ہزار فٹ کی بلندی سے روس کے فوجی اہمیت کے ٹھکانوں کی تصویریں کھینچی تھیں اور روسیوں نے اس جہاز کو مار گرا کر یہ تصویریں ضبط کر لی تھیں۔ یہی عالم روس کا بھی ہے وہ بھی اپنے حریفوں کے فوجی اڈوں اور ٹھکانوں کی تصویریں جمع کرنے کے لیے ساٹھ ساٹھ ہزار فٹ کی بلندی سے تصویریں کھچواتا ہے اور اس کے حریفوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ جن لوگوں

کو ہمارے ہوائی اڈوں یا ہماری سرحدوں کی تصویریں ضرورت ہوں گی کیا وہ یہ اہم کام کسی سیاح کے سپرد کریں گے یا کیا ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ سرینگر کے ہوائی اڈے پر آ کر ہی یہ تصویریں کھینچ لیں۔ ہمارے حفاظتی دستوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ اب ایسے ایسے کیمرے ایجاد ہوئے ہیں کہ ان سے تصویریں کھینچنے کے لیے کیمرے کو باقاعدہ سنبھالنے کی بھی ضرورت نہیں۔ آپ کے بازو پر ایک گھڑی نما چیز بندھی ہوئی ہے، آپ کو صرف بازو کو حرکت دینا ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ ہمارے حفاظتی دستے اس قسم کے کیمروں کا سراغ کیسے لگائیں گے۔ لیکن انہیں آج بھی ضد ہے کہ ہوائی اڈے پر تصویریں کھینچنا منع ہے کیوں کہ وہ ذہنی طور اگر ایک صدی نہیں تو کم از کم پچاس سال موجودہ زمانے سے پیچھے ہیں۔

ہوائی سفر کے سلسلے میں پچھلے کئی سالوں سے ایک اور مصیبت کا بھی اضافہ ہو گیا ہے اور وہ ہے جہاز میں سفر کرنے سے پہلے سامان کی جانچ پڑتال اور اپنی ذاتی دیکھ بھال، اس میں شک نہیں کہ عالم گیر سطح پر ہائی جیکنگ کے بڑھتے ہوئے واقعات کی بناء پر ایسا کرنا ضروری ہے لیکن اس احتیاط کو مسافروں کے لیے مصیبت بنانے کا کوئی جواز نہیں اور خاص طور پر سرینگر کے ہوائی اڈے پر عام مسافروں کی جو بے عزتی اور بے حرمتی ہوتی ہے وہ روز بروز نا قابل برداشت بنتی جا رہی ہے۔ اور اس سلسلے میں غیر ملکی سیاحوں کو جو زحمت اور مصیبت اٹھانا پڑتی ہے اس سے ہماری ٹورسٹ انڈسٹری کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ کوہ کن پچھلے کئی سال کے دوران متعدد بار غیر ملکی سفر پر جا چکا ہے، ان ممالک میں بھی ہائی جیکنگ کو روکنے کے لیے مسافر اور اس کے سامان کی سخت جانچ پڑتال کی جاتی ہے لیکن یہ سب کچھ اس انداز سے

ہوتا ہے کہ مسافر کو اکثر اوقات اس کا احساس اور بعض اوقات اس کا علم بھی نہیں ہوتا۔ اب ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں ابھی اس قسم کی مشینیں نہیں ہیں کہ جن کی مدد سے مسافروں کی دیکھ بھال اور ان کے سامان کی اس طرح جانچ پڑتال ہو سکے، کہ انہیں کم سے کم زحمت اٹھانا پڑے، لیکن جس طرح دہلی کے ہوائی اڈے پر رجسٹرڈ سامان کی جانچ پڑتال کا کام سامان کھولے بغیر کی جاتی ہے اس طرح سرینگر کے ہوائی اڈے پر کیوں ممکن نہیں ہو سکتا ہے اور ایسا کرنے کے لیے اگر کسی ساز و سامان کی ضرورت ہے تو اسے مہیا کرنے میں کیوں تاخیر کی جا رہی ہے؟ سرینگر کے ہوائی اڈے پر سامان کی جانچ پڑتال کا کام اس درجہ تکلیف دہ اور صبر آزما ہے کہ میں نے بہت سے غیر ملکی سیاحوں کو اس بے عزتی اور بے ہودگی کے خلاف سخت احتجاج کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہائی جیکرس کی تلاش ہوائی سفر کو محفوظ بنانے کے لیے بہت ضروری ہے لیکن ہر مسافر کو ہائی جیکر سمجھ کر اس کی بے عزتی کرنا غیر ضروری ہے اور میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں ہوائی اڈے پر تعینات حفاظتی عملے کو دوش دینا غلط ہے۔ یہ محکمۂ شہری ہوا بازی کے ناخداؤں کا کام ہے کہ وہ اس عمل کو کم سے کم تکلیف دہ بنانے کے لیے ہوائی اڈے پر ضروری ساز و سامان فراہم کر دیں۔ کم از کم اس معاملے میں ہمارے حکمرانوں کو اپنی ذہنی پسماندگی کا ثبوت نہیں دینا چاہیے۔

قاسم صاحب کا قلمدان

مرکزی کابینہ میں دو ماہ تک بلا قلم دان رہنے کے بعد سید میر قاسم کو بالآخر قلمدان مل ہی گیا۔ لیکن انہیں جس محکمے کا نگران بنا دیا گیا ہے اس سے کوہ کن

کے منہ کا ذائقہ کچھ بگڑ گیا۔ سول سپلائز اور کوآپریشن کے محکمے کچھ اتنے غیر شاعرانہ، غیر سیاسی اور غیر اہم ہیں کہ ہمیں قاسم صاحب کو یہ محکمے تفویض کیے جانے پر کوئی خوشی نہیں ہوئی، خدا بہتر جانتا ہے کہ خود قاسم صاحب کا اپنا ردعمل کیا ہے، ہم نے تو اُن کے لیے کچھ عرصہ پہلے سیاحت اور شہری ہوابازی کا محکمہ تجویز کیا تھا۔ یہ محکمہ سیاسی اعتبار سے نہیں لیکن ایسے خاصا اہم اور رومانی محکمہ ہے اور قاسم صاحب اس کے لیے زیادہ موزون ثابت ہوتے۔ بہرحال وزیر چُننے اور انہیں محکمے تفویض کرنے کا حق چونکہ مسز گاندھی کو ہے، کوہ کن کو نہیں۔ اس لیے ہم مسز گاندھی کے فیصلے پر اظہار ناپسندیدگی ہی کرتے ہیں اور بس! (اگر چہ اب ہندوستان کے شہریوں کو اس حق سے بھی محروم کردیا گیا ہے)۔

۱۰راگست پارلیمنٹ کا اجلاس شروع ہونے کے بعد جب وزیراعظم نے قاسم صاحب کو ایوان میں متعارف کیا تو ممبران نے تالیاں بجا بجا کر انہیں خوش آمدید کہا، وہ اپنی نرم روی، سادہ مزجی اور سیاسی تدبّر کی وجہ سے مشہور بھی ہیں اور مقبول بھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سٹیج پر ان کی کارکردگی کا کیا معیار رہتا ہے۔ سِول سپلائز اور کوارپریشن کے محکموں میں اگر چہ قاسم صاحب کی شخصیت کے اُبھار اور نکھار کی زیادہ گنجائش نہیں لیکن پھر بھی یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے مخصوص اسٹائل میں اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے سے اپنے اثر ورسوخ میں اضافہ کریں گے، نئی دہلی کے سیاسی حلقوں میں یہ بات بھی کہی جارہی ہے کہ مسز گاندھی نے قاسم صاحب کو جان بوجھ کر ایک ہلکا سا چارج سونپا ہے کیونکہ وہ ان سے کچھ اور بڑے کام لینا چاہتی ہیں۔ اب اس سلسلے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے کیونکہ کچھ دنوں تک یہ بات سرگباشی ڈی، پی ذر کے بارے میں بھی کہی جاتی رہی۔

۱۴راگست ۱۹۷۶ء

آزادی یا غلامی

دو دن قبل وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے مشہور صحافی اور اخبار نیشنل 'ہیرلڈ' کے ایڈیٹر مسٹر چلا پتی راؤ کے اعزاز میں منعقدہ ایک تقریب پر تقریر کرتے ہوئے ہندوستانی عوام اور صحافیوں کو یہ خوش خبری سنائی کہ ان کی حکومت اخبارات کی آزادی کو سلب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ اگر وزیر اعظم ،ان کی کابینہ کا کوئی دوسرا رُکن یا ششی بھوشن جیسا کوئی بے لگام ممبر پارلیمنٹ ایک یا دو مہینے تک اس بیان کی تردید یا تکذیب نہیں کرتے ،تو سمجھ لینا چاہیے کہ مسز گاندھی نے جو کچھ کہا ہے، سنجیدگی سے کہا ہے اور وہ واقعی پریس کی آزادی کو سلب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ایمرجنسی کے بعد سے اخباری بیانات اور ریڈیائی نشریات سے رہا سہا اعتبار بھی اُٹھ گیا ہے۔ اور اب یہی معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والے نے کیا کہا، لکھنے والے نے کیا لکھا، اور سننے والے نے کیا کیا سنا؟ بہر کیف خبر چونکہ بہت خوش کُن اور روح افزا ہے اس لیے ہم اسے حرف بحرف صحیح تصور کر کے یہ فرض کر لیں گے کہ اخبار نویس کی حیثیت سے کوہ کن کی آزادی محفوظ ہے اور مسز گاندھی اسے سلب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ کوہ کن کو وزیر اعظم اور ان کے بعض ساتھیوں کے اس بیان سے سو فیصدی اتفاق ہے کہ ایمرجنسی سے پہلے اس ملک کے بعض اخبارات اپنی آزادی کا غلط استعمال کر کے اپنے قارئین کا استحصال کرتے تھے۔ ان کے لیے صحافت اور بلیک میلنگ ایک ہی چیز کے دو نام تھے اور بعض اخبارات اور اخبار نویسوں نے اسے ایک مقدس پیشے کی بجائے ایک دھندہ بنا دیا تھا، یہ اور اس قسم کی بہت سی باتیں ایمرجنسی سے قبل کے پریس کے متعلق کہی

جا سکتی ہیں۔ لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ ملک کے سبھی یا اکثر اخبارات اس قسم کی بازاری اور بے ہودہ صحافت میں مصروف تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ملک میں شائع ہونے والے اخبارات اور جرائد کی ایک بہت ہی مختصر تعداد، صحافتی معیار اور وقار کو نقصان پہونچا کر اپنے آپ کو فائدہ پہنچانے کے لیے کوشاں تھی ورنہ اکثر اخبارات، جن میں دہلی، بمبئی، مدراس اور کلکتہ سے شائع ہونے والے انگریزی اخبارات خاص طور پر قابل ذکر ہیں، معیار، مواد اور ستھرے پن کے اعتبار سے ترقی یافتہ اور مہذب ممالک کے صحافتی معیار سے کسی درجہ کم نہیں تھے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ایمر جنسی کے بعد سب سے زیادہ انہی اخبارات کو نظم و نسق کا پابند ہونا پڑا ہے۔ جب کہ فحش، گھٹیا اور غیر معیاری صحافت کے علمبردار آج بھی اسی طرح دندناتے پھر رہے ہیں کہ جس طرح ایمر جنسی سے پہلے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ حکومت کے ذہن میں پریس کی آزادی کا تصور یہ ہے کہ اخبارات حکومت کے ہر قدم کی تعریف کرنے میں آزاد ہوں اور جو اخبارات حکومت یا اربابِ حکومت کے کسی قدم یا فیصلے کی تنقید کریں وہ آزادی کا غلط اور بے جا استعمال کر رہے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ حکومت کا کوئی ترجمان اس کے اس بیان کی تصدیق نہیں کرے گا اور عین ممکن ہے کہ اس کی فوری تردید کا بھی انتظام کرے۔ لیکن ایک صحافی کی حیثیت سے اسے پچھلے ایک برس کے دوران یہی تجربہ ہوا ہے کہ وزیر اعظم، ان کے بیس نکاتی پروگرام اور ایمر جنسی کی تعریف کرو، تو اخبار نویس کی ہر خطا معاف ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی بڑا بلیک میلر اور فحش نگار کیوں نہ ہو، اخبارات کی آزادی کے تئیں حکومت کا یہ رویہ یقیناً صحافت کے معیار اور اس کے اعتبار کو بلند نہیں کر سکتا اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ چند سر پھرے اور بے

راہ رو اخبارات اور اخبار نویسوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے پورے صحافتی ڈھانچے کو تبدیل کرنے کی کوششیں کیوں کی جا رہی ہیں؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ افراد اور اداروں سے متعلق ہتک عزت Defamation کے قانون کو زیادہ سخت بنا کر ہر گناہ گار اخبار نویس کو اپنے اعمال کی سزا بھگتنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا جائے۔ یہ کیا ضروری ہے کہ حکومت اپنے آپ کو صحافیوں کے احتساب اور صحافت کی گرفت سے آزاد کرنے کے لیے ایک ایسا ضابطۂ اخلاق مرتب کرے کہ جس کی موجودگی میں اخبارات آزاد ہوتے ہوئے بھی غلام رہیں گے۔ اخبارات کی آزادی ایک مثبت تصّور ہے۔ منفی قدر نہیں اور اگر ہم آزاد ممالک کی صف میں کھڑا ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں اس ملک کے اخبارات کو وہی آزادی دینا ہوگی کہ جو برطانیہ، امریکہ، جرمنی، فرانس، اٹلی اور دوسرے ممالک میں حاصل ہے، اس وقت ہمیں وہی آزادی حاصل ہے کہ جو بنگلہ دیش، سیلون اور سنگاپور کے اخبارات کو حاصل ہے اور کوہ کن کو یہ کہتے ہوئے سخت شرمندگی کا احساس ہو رہا ہے کہ پاکستان میں اخبارات کو نسبتاً زیادہ آزادی حاصل ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد ہمیں جن باتوں پر بجا طور فخر کا احساس ہوتا تھا، ان میں اس ملک کا پریس بھی شامل تھا۔ وزیر اعظم کے تازہ بیان کے بعد یہ اُمید پیدا ہوگئی ہے کہ شاید ہمیں ایک بار پھر اپنی صحافت اور صحافیوں پر فخر کرنے کا حق حاصل ہو جائے!

۳/ جولائی ۱۹۷۶ء

ناممکن مگر دل چسپ

کوہ کن کو اس بات کا علم نہیں کہ وزیر اعظم اندرا گاندھی کے پاس

(Sense of Humor) ہے یا نہیں، اگر ہے تو کتنا؟ ہاں ان کے والد محترم جواہر لال نہرو کے Sense of Humor کی کئی مثالیں مشہور ہیں، اس لحاظ سے یہ فرض کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ بیٹی میں باپ کی یہ خصوصیت کسی نہ کسی حد تک ضرور موجود ہوگی۔ ۲۶/جون کو جب ملک بھر میں ایمرجنسی کی سالگرہ منائی جارہی تھی اور کانگریسی لیڈر ایمرجنسی کی برکتیں گنانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کررہے تھے تو کوہ کن کے دل میں ایک عجیب سا خیال پیدا ہوا، اتنا عجیب کہ مجھے بھی اس کے بارے میں سوچتے ہوئے کچھ عجیب سا لگا، آیئے آپ کو بھی اس خیال کے استعجاب میں شریک کروں، میں نے سوچا کہ اگر ۲۷/جون کو مسز گاندھی ٹھیک آٹھ بجے آل انڈیا ریڈیو دہلی کے سٹیڈیو میں داخل ہوکر قوم کے نام یہ پیغام نشر کریں۔

بھائیو اور بہنو!، ایمرجنسی کو آج ایک پورا سال گزر گیا اور میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اس ایک سال میں ہم نے بہت کچھ کھویا، ایمرجنسی سے ملک کو بہت نقصان پہنچا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ تجربہ بہت ناکام رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم نے ملک میں بظاہر ایک ضبط ونظم کی صورت پیدا کردی ہے۔ لیکن یہ ایک بالکل ظاہری چیز ہے اور یہ تبھی تک قائم رہ سکتی ہے جب تک ایمرجنسی برقرار ہے۔ اس لیے میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں ایمرجنسی کو ختم کرکے فوراً اپنے پرانے طریقے کو اپنانا چاہیے۔

اب صاف ظاہر ہے کہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی ایسا نہیں کریں گی لیکن فرض کیجیے کہ وہ صرف یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ کون کتنے پانی میں ہے یہ دلچسپ شرارت کربیٹھیں اور دو دن تک عام لوگوں اور لیڈروں کے ردعمل کا مطالعہ کرتی رہیں۔ اس خیال کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہی

کانگریسی لیڈر جو صبح سے شام تک ایمر جنسی کے فوائد، اس کی ضرورت، اس کی اہمیت اور اس کی برکتوں کا راگ الاپ رہے ہیں، آنِ واحد میں ایمر جنسی کے اس حد تک مخالف ہو جائیں گے، کہ پھر انہیں اس کی برائیوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آئے گا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کریں گے کہ یہ ہو کیا گیا۔ انہیں فکر صرف اس بات کی ہو گی کہ وہ جلد سے جلد اپنے آپ کو وزیر اعظم کے خیالات سے ہم آہنگ کریں اور اس دوڑ میں اپنے دوسرے ساتھیوں کو آگے نہ بڑھنے دیں اور اس کے بعد صبح و شام، رات دن محل بے محل لوگ جو ایمر جنسی کی مدح کیا کرتے تھے اس کی مخالفت اور برائی کرنا شروع کریں گے۔ اس خواب یا خیال کا محرک کوہ کَن کا یہ احساس اور عقیدہ ہے کہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو اس بات کا بخوبی علم اور عرفان ہے کہ ان کی جماعت کے بہت سے لوگ صرف اس لیے ان کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہتے ہیں کہ وہ وزیر اعظم ہیں۔ ان کے بہت سے سینئر ساتھی اور وزیر بھی ان کی اس لیے حمایت کرتے ہیں کہ مسز گاندھی کے پاس اقتدار ہے۔ مسز گاندھی، ان سب کو اچھی طرح سے جانتی ہیں، وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ ان کے اقتدار کو کسی بھی وقت کوئی خطرہ لاحق ہو جائے تو یہ لوگ انہیں دغا دینے میں سب سے پہلے ہوں گے۔ یہی حال ان بہت سے اخبار نویسوں کا بھی ہے کہ جو ۲۵ رجون تک مسز گاندھی کو گالیاں دیتے تھے لیکن ۲۶ رجون کے بعد ان کے سب سے بڑے مداح بن گئے ہیں۔ ان سب لوگوں کو یہ خوش فہمی ہے کہ مسز گاندھی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ لیکن کوہ کن کی اطلاع یہ ہے کہ وہ سب کے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں۔ اس لیے میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ کسی دن ایسے لوگوں کو بے نقاب کرنے کے لیے یہ دلچسپ شرارت کر

بیٹھیں تو کیا ہوگا؟ میں جانتا ہوں کہ کیا ہوگا، ہوسکتا ہے کہ مسز گاندھی بھی جانتی ہوں کہ کیا ہوگا، اور اسی لیے وہ ایسا نہیں کریں گی۔

فیضؔ اور کشمیر

اِدھر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہوائی سفر کے بعد ریلوے رابطے کی بحالی کی خبر موصول ہوگئی اور اُدھر ماسکو کے ہندوستانی سفارت خانے میں پاکستان ہی کے نہیں اُردو دُنیا کے سب سے مقبول اور محبوب شاعر فیض غزل سرا ہوگئے۔ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کی استواری کا یہی عالم رہا تو وہ دن دور نہیں کہ فیض کی آواز، سرینگر کے، شہر ممنوع میں بھی سنائی دے گی کشمیر اور کشمیری لیڈروں سے فیض احمد فیض کی وابستگی ان کی یادوں کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے اور مجھے ۷ رسال قبل کراچی میں ان کی قیام گاہ پر گذاری ہوئی وہ شام اچھی طرح یاد ہے کہ جب فیض نے شیخ صاحب، صادق صاحب اور ڈی، پی صاحب کا تذکرہ بڑی محبت کے ساتھ کیا تھا۔ اُنہوں نے اپنی بیوی کی موجودگی میں کہا تھا کہ ہم دونوں شیخ صاحب اور صادق صاحب کو زندگی بھر نہیں بھلا سکتے۔ کیونکہ شیخ صاحب نے ہمارے نکاح پڑھا لیے ہیں اور صادق صاحب بطور گواہ موجود تھے۔ پچھلے پندرہ بیس برسوں کے دوران فیض کئی بار ہندوستان آئے اور صادق صاحب، ڈی، پی صاحب اور دوسرے دوستوں سے ملتے رہے لیکن اپنے نکاح خوان شیخ صاحب سے ان کی ملاقات ہوئے ایک مدت گذر گئی ہے۔ ممکن ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان بدلتے ہوئے حالات اور ماحول میں ان کی یہ خواہش بھی پوری ہو کہ وہ کشمیر آکر اپنے پرانے احباب سے مل سکیں۔ فیضؔ نے اسی شام کشمیر کے مستقبل کے متعلق اپنے

شان دار تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ کشمیر کا مستقبل شان دار ہے، ان کی یہ پیشن گوئی کہاں تک صحیح ثابت ہوئی ہے، یہ بات انہیں سے پوچھنے کو جی چاہتا ہے، اُن دنوں پاکستان میں صدر ایوب کے خلاف بغاوت کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے فیض سے پوچھا تھا کہ اس کا سبب کیا ہے تو انہوں نے کہا تھا کہ ہر حکمران کے مقدر میں گالی کھانا ہے اور ڈکٹیٹروں کو ساری گالیاں ایک ہی قسط میں ادا کی جاتی ہیں۔

☆☆☆

یکم جولائی ۱۹۷۶ء

ہتکِ عزت کا قانون

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی بہت سی باتوں سے اختلاف کے باوجود ان کی اس بات سے کوہ کن کو بھی اتفاق ہے کہ ایمرجنسی سے پہلے اس ملک کے اخبارات کا ایک حصہ بالکل دیوانہ ہو گیا تھا۔ آزادئ تحریر کے نام پر ان اخبارات نے گندگی، فحاشی، کردار کشی اور بلیک میلنگ کا ایسا بازار گرم کر رکھا تھا کہ شریف اور باعزت لوگ اخبار والوں کے نام سے بھی کانپتے تھے۔ اس سلسلے میں جن سنگھ کے دو اخبارات، مدر لینڈ اور آرگنائزر کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ ان اخبارات نے اپنی غیر ذمہ دارانہ اور بے بنیاد تحریروں سے صحافت کے وقار کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ سستی جذبات انگیزی اور ہیجان انگیزی کی خاطر ان دونوں اخبارات نے صحافت اور شرافت کی ہر قدر کو پامال کر دیا تھا اور خاص طور پر وزیر اعظم کی ذات اور ان کے خاندان کے متعلق ایسی ایسی واہیات اور اشتعال انگیز تحریریں شائع کی جاتی تھیں کہ جنہیں دُنیا

کے کسی اور ملک میں برداشت نہیں کیا جا سکتا اور یہ سلسلہ صرف مدر لینڈ اور آرگنائزر تک ہی محدود نہیں تھا ہر صوبے سے اس قسم کے درجنوں چیتھڑے شائع ہوا کرتے تھے کہ جن کا کام، شریف اور باعزت لوگوں کی پگڑیاں اچھال کر اپنے لیے روزگار کی سبیل پیدا کرنا ہوتا تھا۔ اخبارات کی اس دیوانگی نے بہت سے نا ہنجار، نا قابل کار اور نا خواندہ لوگوں کو صحافی بننے کی ترغیب دی تھی اور ۲۶ جون ۱۹۷۵ء سے پہلے اخبارات کی آزادی کے نام پر وہ دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی کہ خدا کی پناہ!

ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد سے یہ سلسلہ کلیتاً ختم نہیں ہوا ہے لیکن صحافتی دُنیا میں ایک زبردست تبدیلی پیدا ہو گئی ہے اور اخبارات کا لہجہ زیادہ محتاط اور ذمہ دارانہ ہو گیا ہے۔ بہت سے وہ اخبارات جو آزادیٔ تحریر کی آئینی ضمانت کا سہارا لے کر اپنی بے خوفی اور بے جگری کا مظاہرہ کرنے کے لیے ادب، اخلاق اور شرافت کی ہر حد پھاندنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی فکر میں رہتے تھے' اب ایسے موم ہو گئے ہیں کہ ان کی مصنوعی شرافت پر ترس آنے لگتا ہے، پچھلے دنوں مجھے ایک نیوز ایجنٹ کے پاس بمبئی سے شائع ہونے والا ایک نیم فلمی اور سیاسی جریدہ ''مدر انڈیا'' کا تازہ شمارہ دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ ماہنامہ مشہور فرقہ پرست بابوراؤ پٹیل کی ادارت میں شائع ہوتا ہے اور یہ اپنی زہریلی تحریروں اور گھناؤنے کارٹونوں کی وجہ سے کئی بار قانون کی زد میں آچکا ہے۔ خود بابوراو پٹیل ہندو مہا سبھا کی حمایت سے پارلیمنٹ کا ممبر بھی رہ چکا ہے اور ایمرجنسی سے پہلے یہ شخص وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی کی ذات اور ہندوستان کے مسلمانوں کے خلاف ایسا زہر اگلتا تھا کہ اسے پڑھ کر کوہ کن کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی، لیکن تازہ ترین شمارہ دیکھ کر محسوس ہوا کہ

ایمر جنسی کے ڈنڈے نے بابوراؤ پٹیل کی کمر ہی نہیں، ان کی نظر بھی ٹھیک کر دی ہے اور اب وہ مسز گاندھی کی ذات، ان کی حکومت اور ان کی پالیسیوں کی تعریفیں کرتے ہوئے نہیں تھکتا۔ اسی طرح ہمارے ہاں کے بہت سے بابوراؤ پٹیل بھی ایمر جنسی کے خوف سے سیدھے ہو گئے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اخبارات کو اپنی ہر تحریر کے لیے قانونی اور اخلاقی طور پر ذمہ دار بنانے کے لیے ہمیں اس کے علاوہ بھی کچھ کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ ایمر جنسی کے موجودہ ضابطوں اور اخبارات کے متعلق تازہ ترین قوانین سے سرکاری لیڈروں اور حکومت سے وابستہ بڑی بڑی شخصیات کو تو تحفظ مل گیا ہے لیکن چھوٹا سرکاری ملازم، عام آدمی یا معمولی سطح کے لوگ ابھی تک بد ذات اور بد کردار اخبار والوں کی زد سے محفوظ نہیں ہیں۔ ابھی تک کسی نہ کسی رنگ میں بلیک میلنگ کے عادی اخبار نویس، شریف اور بے زبان لوگوں کے لیے وحشت کا سامان بنے ہوئے ہیں اور میری دانست میں اس روش اور رجحان کی حوصلہ شکنی کرنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ ہتک عزت Law of Defamation کو زیادہ سے زیادہ سخت اور مؤثر بنا دیا جائے۔ یہ قانون اگر چہ اپنی موجودہ شکل میں بھی خاصا سخت ہے، لیکن اس کا سہارا لینے کے لیے ایک پیچیدہ عمل سے گذرنا پڑتا ہے اور اس لحاظ سے یہ اتنا صبر آزما اور تکلیف دہ عمل ہے کہ بہت سے لوگ ازالۂ حیثیت عرفی کی بجائے خاموشی کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔
اس صورت حال نے بلیک میکرس کے حوصلے بلند کر دیئے ہیں اور وہ یہی سمجھنے لگے ہیں کہ ان کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہتک عزت کا موجودہ قانون اپنی تمام خامیوں کے باوجود اتنا مؤثر اور جان لیوا ہے کہ موذی اخبار نویس کی ہڈی پسلی ایک کر سکتا ہے، لیکن اپنے ہاں بہت کم

لوگوں کو اپنے حقوق کا احساس، اپنی طاقت اور اپنی عزت کی قیمت کا اندازہ ہے، انہیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ ان کی عزت اور شہرت کو نقصان پہنچانے والے اخبار نویس کے لیے قانون نے سخت سے سخت سزا مقرر کی ہے اور عدالتوں نے بلا وجہ، بغیر کسی جواز کے کسی شخص کی عزت اور شہرت کو نقصان پہنچانے کے لیے اخبار نویسوں کو بھاری جرمانے کی سزائیں دی ہیں اور انہیں بار ہا جیل جانا پڑا ہے۔ لیکن جس طرح دوائی کھائے بغیر درد کا علاج ممکن نہیں اسی طرح قانون کا سہارا لے کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے بغیر ایسے بدطنیت اور بدکردار اخبار نویسوں کو کیفر کردار تک پہچانا بھی ممکن نہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ عام لوگ یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہتک عزت کا قانون کیا ہے اور اس قانون کی رو سے انہیں اپنی عزت اور شہرت کے تحفظ کے لیے کیا کیا حقوق اور مراعات حاصل ہیں؟ کچھ اخبار نویسوں نے جان بوجھ کر یہ تاثر عام کر دیا ہے کہ ہتک عزت کا جرم ثابت کرنا بہت مشکل ہے اور یہ کہ مقدمے کی کارروائی کے دوران شکایت کنندہ کو ملزم سے زیادہ تکلیف پہنچنے کا احتمال رہتا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہتک عزت کا جرم ثابت کرنا سب سے آسان کام ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کا عمل قدرے طویل ہوتا ہے، لیکن طوالت ہمارے عدالتی نظام کی ایک خصوصیت ہے، عام لوگوں کو اس سلسلے میں اپنے حقوق سے آگاہ کرنے اور مختلف عدالتی فیصلوں کی روشنی میں اس قانون کے مضمرات سے آگاہ کرنے کے لیے ہم اگلے ہفتے سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کر رہے ہیں۔ جس سے قارئین کو اندازہ ہوگا کہ ایمرجنسی کے قواعد اور نئے قوانین کی عدم موجودگی میں بھی غیر ذمہ دارنہ اور کردار کُش صحافت کے خلاف مؤثر قوانین موجود ہیں اور ان

موجودہ قوانین کو سخت بنا کر عام لوگوں کو اپنے حقوق سے آشنا کر دیا جائے تو صحافتی دیوانگی کا مؤثر علاج ممکن ہوسکتا ہے۔ میرے خیال میں اگر ہتکِ عزت قانون کو مؤثر بنا دیا جائے تو اخبار نویسوں میں ذمہ داری اور توازن کا احساس پیدا ہو جانا کوئی مشکل بات نہیں۔ انگلستان میں اخبار والوں کو معمولی سے معمولی فروگذاشت پر کئی کئی ہزار پونڈ جرمانے کی سزا دی جاتی ہے اور اسی طرح امریکہ میں بھی اخبار نویسوں کے خلاف ایک ایک دو دو لاکھ ڈالر کی ڈگریاں ہو چکی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ان ملکوں میں صحافتی آزادی کے نام پر افراد کی عزت اور شہرت سے کھیلنا سب سے مہنگا سودا ثابت ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ہمیں ان ممالک کی مثالوں سے سبق سیکھ کر اپنے ہاں کے صحافتی غنڈوں کی سرکوبی کرنا چاہیے اور اس کے لیے ایمرجنسی کی ضرورت نہیں۔ موجودہ قانون میں معمولی سی ترامیم کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

۲۲/اگست ۱۹۷۶ء

سنسر شپ کیوں اور کس لیے؟

ایمرجنسی کے نفاذ کے ساتھ ہی اخبارات پر سنسر شپ عائد کرنا قابلِ فہم بھی تھا اور ایک حد تک ضروری بھی۔ لیکن اب جب کہ ایمرجنسی کو ایک سال سے زائد عرصہ گزر گیا ہے، اس بات پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ سنسر شپ کی موجودہ پابندیوں کا کوئی جواز ہے بھی یا نہیں۔ حکمران لوگ بجا طور پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ایمرجنسی کے بعد سے ملک میں نہ صرف ضبط و نظم کا ماحول پیدا ہوا ہے بلکہ بڑے دنوں کے بعد ملک میں معاشی استحکام اور اقتصادی

توازن کی خوشگوار فضا پائی جاتی ہے۔حق تو ہے کہ ایمرجنسی کے بہت سے فائدے اتنے واضح اور نمایاں ہیں کہ مسز گاندھی اور ایمرجنسی کے بدترین مخالف بھی ان کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے ۔ جب صورت حال میں ایک سال کے اندر یہ بنیادی تبدیلی پیدا ہوگئی ہے تو پھر اخبارات پر سنسرشپ کی موجودہ پابندیوں کی کیا ضرورت ہے؟ کہا جا سکتا ہے کہ اخبارات پر سے سنسرشپ کی پابندی اُٹھانے کے ساتھ ہی بہت سے لوگ غیر ضروری ہیجان انگیزی اور غیر ذمہ دارانہ روش اختیار کر کے موجودہ ماحول کو بگاڑنے کی کوشش کریں گے۔کوہ کن کی دانست میں یہ اندیشہ بے بنیاد اور کسی حد تک مبالغہ آمیز ہے، ایک تو ایمرجنسی کی کڑوی دوائی نے اکثر لوگوں دماغ ٹھیک کر دیئے ہیں (اور ایسے لوگوں میں یہ ناچیز کوہ کن بھی شامل ہے) اور عام طور پر کسی شخص کو اب یہ ہمت نہیں ہوگی کہ وہ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر رکھے ۔ دوئم پارلیمنٹ نے اپنے پچھلے اجلاس کے دوران قابلِ اعتراض تحریروں کو روکنے کے لیے جو قانون پاس کیا ہے، اس نے عام تحریروں کو ہی نہیں ، پارلیمنٹ کی کاروائی کی اشاعت پر بھی ایسی ایسی پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ اس کی حدود سے تجاوز کرنے والا فوراً ہی قانون کی گرفت میں آئے گا۔ان حالات میں کس ماں کے لال میں یہ ہمت ہوگی کہ وہ حاکمانِ وقت کا ادب نہ کرے یا ان کی شان میں کوئی ایسی گستاخی کرے کہ جس کی سزا معین بھی ہو اور یقینی بھی۔اس کے علاوہ اخبار نویسوں کے لیے مرتب کردہ ضابطۂ اخلاق نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہے اور اس ضابطے کے قانون بن جانے کے بعد ہر اخبار نویس کی میز پر میر کا یہ شعر جلی حروف میں لکھا ہوا نظر آئے گا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہِ شیشہ گری میں

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اخبارات پر سنسر شپ کی موجودہ پابندیوں سے حکومت کو قطعی کوئی فائدہ حاصل نہیں ہورہا ہے بلکہ الٹا نقصان ہورہا ہے، اور سب سے نمایاں اور قابلِ ذکر نقصان یہ ہے کہ حکومت کا اعتبار کم ہوتا جارہا ہے اخبارات میں شائع ہونے والی صحیح خبروں کے بارے میں بھی عام لوگ شک وشبہ میں مبتلا رہتے ہیں، اور ملک بھر میں کانا پھوسی اور افواہ بازی کو قومی مشغلے کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ سنسر شپ کے قواعد وضوابط پر عمل درآمد کرانے والے بعض ضرورت سے زیادہ جوشیلے افسروں نے اس پوری ورزش Exercise کو اتنا مضحکہ خیز اور بعض اوقات اشتعال انگیز بنادیا ہے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا، کہ پریس سنسر شپ کا مقصد کیا ہے، اور اسے کس کی خاطر چلایا جا رہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہر شہر اور ہر قصبے میں آئے دن ایسی ایسی بے بنیاد افواہیں اڑتی رہتی ہیں کہ جن سے یقیناً حکومت اور حکمران جماعت کو سب سے زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں دہلی کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے اور بعض لوگ بجا طور پر اس شہر کو افواہوں کی راجدھانی بھی کہنے لگے ہیں۔ کوہ کن کو پچھلے ہفتے چند دنوں کے لیے دہلی میں مقیم رہنا پڑا اور اسے یہ جان کر بے حد دُکھ ہوا کہ دہلی کا ہر گھر افواہ سازی اور افواہ بازی کی ایک چھوٹی سی فیکٹری کے طور پر کام کررہا ہے، جس کے منہ میں جو آتا ہے وہ کھسر پھسر کر کے دوسرے کے کان میں پہنچاتا ہے اور پھر یہ سلسلہ ایک آٹو میٹک واچ کی طرح یوں چالو ہوجاتا ہے کہ پھر رکنے کا نام نہیں لیتا۔ مثلاً دہلی میں اس وقت زوروں سے یہ افواہ گشت کررہی ہے کہ مرکزی وزیر مسٹر پی، سی سیٹھی کسی دماغی عارضے میں مبتلا ہیں اور انہیں وزارت سے عنقریب سبکدوش کیا جارہا ہے۔ یہ افواہ اتنے زوروں سے اُڑی ہے کہ اس کے راوی ایسے ایسے معتبر لوگ ہیں کہ کوہ کن جیسے

جہاں دیدہ نے بھی کچھ دنوں تک اس کا اعتبار کرلیا اور بالآخر اسے خود جا کر سیٹھی صاحب سے مل کر اس افواہ کی تصدیق یا تردید کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ افواہ محض گپ تھی، جو یقیناً سیٹھی صاحب کے کسی دشمن نے اڑائی ہے۔ لیکن دل چسپ بات یہ ہے کہ دہلی میں رہنے والا ہر شخص اس غلط افواہ کے صحیح ہونے پر قسم کھانے کے لیے تیار ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کا غیر صحت منداور خطرناک ماحول سنسر شپ کی غیر ضروری پابندیوں کا نتیجہ ہے اور ان پابندیوں کو جتنی جلد ختم کردیا جائے ...... حکومت کے حق میں مفید رہے گا۔

اسی طرح بعض اوقات سنسر شپ پر عمل در آمد کرانے والے افسراں بادشاہ سے بھی زیادہ وفاداری کا ثبوت دینے کی کوشش میں اپنی حدود سے بھی تجاوز کرتے ہیں ۔ خاص طور پر پارلیمانی کاروائی کو نشر کرنے اور اس کی اشاعت کے سلسلے میں ایسی بے ہودہ اور غیر ضروری احتیاط سے کام لیا جاتا ہے کہ اس سے ملک کے اس عظیم ترین جمہوری ادارے کا وقار اور اعتبار بھی مشکوک ہو گیا ہے۔ ۱۰ ر اگست کو جب لوک سبھا اور راجیہ سبھا کا اجلاس شروع ہوا تو راجیہ سبھا میں ایک غیر معمولی واقعہ رونما ہوا، ٹھیک گیارہ بج کر دو منٹ پر جب کہ راجیہ سبھا کے چیرمین مسٹر جتی کچھ سرگباشی ممبروں کے بارے میں ماتمی قرارداد پڑھ رہے تھے، جن سنگھی ممبر سبھر امنیم سوامی ایوان میں داخل ہوئے اور انہوں نے داخل ہوئے ہی ''پوائنٹ آف آرڈر'' کہا۔ اس مرحلے پر سب ممبران کی نگاہیں ان پر مرکوز ہوگئیں لیکن وہ یہ کہنے کے فوراً بعد ایوان سے باہر آئے اور یوں غائب ہوگئے کہ اب تک ان کا کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے۔ اس واقعے سے بجا طور پر ساری پارلیمنٹ میں سنسنی پھیل گئی اور یہ ابھی تک گفتگو اور

بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ سبھر امنیم سوامی ایمرجنسی کے اعلان کے فوراً بعد ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے اور پچھلے ایک سال سے وہ برطانیہ اور امریکہ میں ہندوستان کے خلاف زہریلا پروپاگنڈا کرنے میں مصروف ہیں ۔ ان کا پاسپورٹ ضبط کر دیا گیا ہے اور ان کے خلاف MISA کے تحت گرفتاری کا وارنٹ جاری ہے ، پھر وہ ہندوستان میں کب اور کس طرح داخل ہو گئے وہ راجیہ سبھا تک کیسے پہنچ گئے؟ اور اس کے بعد کہاں غائب ہو گئے؟ یہ ایسے اہم سوالات ہیں کہ ہمیں ان کا جواب ملنا چاہیے ، ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم یہ جانیں کہ ملک کی سلامتی کے تیئں کس شخص نے غیر ذمہ داری اور لاپرواہی سے کام لے کر ایک جن سنگھی کو پہلے ملک میں اور پھر راجیہ سبھا میں داخل ہونے میں مدد دی ، لیکن سنسر والوں نے اس خبر پر ایسا زبردست سنسر بٹھا دیا کہ یوں تو سارے ہندوستان کو اس واقع کا علم ہے لیکن کسی اخبار میں اس کے متعلق ایک لفظ بھی شائع نہیں ہوا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ اس واقعہ پر سنسر شپ عائد کرنا کس گائیڈ لائن کے تحت آتا ہے اور اس سے ملک کی سلامتی اور اس کے تحفظ کو کیا نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ سنسر شپ عائد کرنے والوں کو اب خود بھی یہ معلوم نہیں کہ سنسر شپ کا مقصد کیا ہے اور اس سے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اس لیے میرا مطالبہ ہے کہ اب اس ڈرامے کو ختم کر دیجیے اور اخبار والوں سے یہ کہہ دیجیے کہ موجودہ سیاسی حقائق اور قانون کو ملحوظ خاطر رکھ کر وہ احتیاط اور ذمہ داری سے کام لیں اور صحافت کو زیادہ سے زیادہ معتبر اور باوقار بنانے کی کوشش کریں۔ میرا خیال ہے کہ ایسا کہنے اور کرنے سے سنسر شپ کے اصلی مقاصد بھی پورے ہوں گے اور پریس کی آزادی بھی برقرار رہے گی۔

☆☆☆

۱۷ / اگست ۱۹۷۶ء

مرحوم بشیر اور فردوس کی یاد میں

پچھلے ہفتے سرینگر کے برن ہال سکول میں زیر تعلیم دو بھائیوں فردوس اور بشیر کی ایک موٹر سائیکل حادثے میں بیک وقت موت نے سارے شہر میں صفِ ماتم بچھادی، جس کسی نے یہ منحوس خبر سنی، ان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، اور بدنصیب والدین کے ساتھ سارا شہر روتا رہا۔ موت یوں بھی بڑی بے رحم اور بے مروت ہوتی ہے، لیکن فردوس اور بشیر کی ایک ساتھ موت نے اس کی سفا کی کو اس درجہ نا قابلِ برداشت بنا دیا کہ پتھر دل بھی پگھل کر رہ گئے۔ فردوس اور بشیر کی عمر ۱۵ اور ۱۷ سال کے درمیان تھی۔ وہ دونوں برن ہال سکول میں زیر تعلیم تھے اور ان کی موت اگر چہ ان کا مقدر تھی لیکن اس بے وقت اور المناک موت کا فوری سبب وہ موٹر سائیکل تھی کہ جوان کے والدین نے انہیں اپنے غیر معمولی پیار کا اظہار کرنے کے لیے دی تھی۔ دونوں بھائی ۱۵/اگست کو اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ موٹر سائیکلوں پر سوار، پہلگام کے لیے روانہ ہو گئے اور ایک اطلاع کے مطابق تین موٹر سائیکل پر سوار کچھ کم سن بچے سرینگر پہلگام روڈ پر اس تیزی کے سے جا رہے تھے کہ ہر دیکھنے والے کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی کہ کہیں انہیں کوئی حادثہ پیش نہ آئے۔ پہلگام سے کچھ دوری پر سیر کا نلی گنڈ کے قریب یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا کہ برق رفتار موٹر سائیکل سامنے سے آتی ہوئی ایک بس سے کچھ اس طرح ٹکرائی کہ موٹر سائیکل پر سوار ایک بھائی تو وہیں جان بحق ہو گیا اور دوسرا بھائی انتہائی نازک حالت میں سرینگر پہنچا دیا گیا۔ جہاں دوسرے دن اس کی موت ہوئی۔ اندازہ کیجیے کہ اس غیر متوقع اور المناک موت سے بدنصیب والدین پر کیا گزری ہوگی۔

یہ سانحہ اتنا دردناک اور روح فرسا ہے کہ میں اس کے تصوّر سے بھی کانپ اُٹھتا ہوں، لیکن اس حادثے کے تعلق سے دو ایک باتیں کہنا ضروری معلوم ہوتی ہیں تاکہ ہمارے نوجوان اور ان کے والدین اس عبرتناک اور المناک سانحے سے کچھ سبق حاصل کرسکیں۔ پوچھا جاسکتا ہے کہ ان دو کمسن بچوں کو موٹر سائیکل جیسی خطرناک سواری مہیا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کم بخت سواری میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس پر سوار ہوکر تیز چلانے کی خواہش اتنی شدید ہوتی ہے کہ نوجوان تو کیا اڈھیر عمر کے لوگ بھی اس پر بیٹھ کر اپنے پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ پھر ہائی سکول میں زیرِ تعلیم کچی عمر کے بچوں کو موٹر سائیکل خرید کر دینا، کہاں کی دانش مندی اور کہاں کا پیار ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق برن ہال سکول کے پرنسپل نے مرحوم بشیر اور فردوس کے والدین سے کہا تھا کہ ان بچوں کو موٹر سائیکل چلانے کی اجازت نہیں دی جانی چاہئیے کیوں کہ ان کے متعلق یہ معلوم ہوا تھا کہ یہ موٹر سائیکل کو بڑی تیزی سے چلاتے ہیں۔ اگر یہ اطلاع صحیح تو پھر یہ کہوں گا کہ ان دو کمسن بھائیوں کی موت کی ذمہ داری بہت حد تک ان والدین پر بھی عائد ہوتی ہے کہ جن کے غم میں ہم سب شریک ہیں۔

ایک اور بات بھی اہم ہے اور وہ یہ کہ موٹر سائیکلوں پر سوار ہوکر پہلگام جانے کی اجازت انہیں کس نے دی؟ اور کیا والدین کو ان کے اس پروگرام کا علم تھا؟ اگر تھا، تو انہوں نے اس کی اجازت کیوں دی؟ اور اگر انہیں اس کا علم نہیں تھا تو تب بھی وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہوسکتے، کیوں کہ عام حالات میں ہر ماں باپ کو اپنے بچوں کی سرگرمیوں کا حتی الامکان علم اور اندازہ رہنا چاہیے۔ موٹر سائیکل کے استعمال میں پیٹرول خرچ ہوتا ہے اور یہ جاننا

ضروری ہے کہ ان معصوم بچوں کی یہ ضرورت کون پوری کرتا تھا اور کیوں؟ ظاہر ہے کہ ماں باپ اپنے پیار اور دلار میں ان کی ہر خواہش پوری کیا کرتے تھے اور یہی وہ بات ہے کہ جس کی طرف کوہ کن ہر ماں باپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہے۔

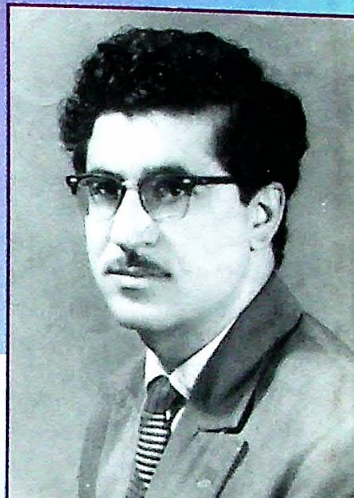
۱۴ سال سے انیس اور بیس سال تک کی عمر کو ماہرین تعلیم اور نفسیات نے بچے کی عمر کا سب سے خطرناک حصہ قرار دیا ہے اسے Adolescence یا عنفوان شباب کہا جاتا ہے اور اس عمر میں بچے کی شخصیت، اس کی نفسیات اور اس کے جسمانی وجود میں بڑی زبردست تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ عمر کے اس حصے میں بچے کی زبردست نگہداشت ہونا چاہیے اور نگہداشت کا یہ فریضہ بجائے خود بہت ہی نازک اور مشکل ہے۔ کیوں کہ جبر و تشدّد یا غیر ضروری دباؤ سے بھی خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اور نا مناسب پیار سے بھی بچے کی شخصیت کا توازن بگڑنے کا اندیشہ ہے، بعض دولت مند لوگ بچوں کی ہر خواہش کو پورا کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے پیار دلار کا بھرپور مظاہرہ کر کے بچے کے تئیں اپنے فرائض پورے کر لیے۔ یہی غلطی مرحوم فردوس اور بشیر کے والدین سے بھی ہوئی اور اس غلطی کا خوفناک انجام ان کی موت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ میں نہیں کہتا کہ موٹر سائیکل پر سوار ہونے والا ہر نوجوان در اصل موت کے سفر پر روانہ ہوتا ہے لیکن کم سنی اور نو عمری میں موٹر سائیکل، سکوٹر یا کار چلانا یقیناً موت کو دعوت کے مترادف ہے۔ اور ہمارے ہاں کے بہت سے نو دولیتے اپنے بچوں کو اس قسم کی چیزیں مہیا کر کے ان کی زندگی خطرے میں ڈالنے کا باعث بنتے ہیں۔ بہت سے لوگ اپنے بچوں کو بے تحاشا پیسے دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ میں نے ۱۵، ۱۶ سال کے بچوں کو سگریٹ نوشی اور

شراب نوشی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر آپ کو بھی کوہ کن کی طرح شہر کے مختلف ریستوانوں میں جانے کا اتفاق ہوتا ہو، تو آپ دیکھیں گے کہ ان ریستوانوں میں چائے پینے والوں کی تعداد کا ساٹھ فیصدی حصہ ۱۵ سے بیس برس تک کے نوجوانوں کا ہوتا ہے، یہ نوجوان جو ایک پیسہ نہیں کماتے، ہر روز ہوٹلوں اور ریستوانوں میں پانچ دس روپے خرچ کرنے کے لیے کہاں سے لاتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یا تو یہ رقم ان کے والدین مہیا کرتے ہیں یا یہ بچے اس کی فراہمی کا خود انتظام کرتے ہیں۔ دونوں لحاظ سے یہ ہماری نئی نسل کی صحیح تربیت کے لیے شگونِ نیک نہیں ہے اور والدین کو اس کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

میں اپنے ذاتی علم کی بناء پر تمام والدین کو خبر دار کرنا چاہتا ہوں کہ سرینگر شہر کے سکول اور کالج جانے والے طالب علموں میں بالخصوص سگریٹ نوشی اور شراب نوشی کی عادات بڑھتی جارہی ہیں اور میں بہت سے ایسے نوجوانوں کو جانتا ہوں کہ جو شراب پیئے بغیر زندہ رہنے کو زندگی کی توہین سمجھتے ہیں، اس قسم کے نوجوانوں میں بہت سے مولویوں اور بزرگانِ دین کے صاحبزادگان بھی شامل ہیں۔ میں چاہوں گا کہ فردوس اور بشیر کی المناک موت کے بعد ہم سب لوگ اپنے بچوں کی زیادہ توجہ سے دیکھ بھال کریں۔ تاکہ ہماری لاپرواہی ان کی ذہنی، اخلاقی اور جسمانی موت کے باعث نہ بنے۔

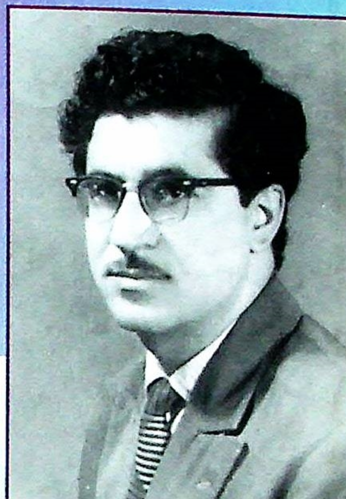
☆☆☆

۲۱: اگست ۱۹۷۶ء



بہت سے ماہرینِ اقتصادیات کا خیال ہے کہ ہندوستان ایسے بڑے ملک میں دولت کے اتنے بے پناہ ذرائع اور وسائل موجود ہیں کہ اگر اُنہیں احتیاط کے ساتھ ہاتھ میں لایا جائے اور پھر حاصل کرنے کے بعد ان کو دیانتداری اور ہوشیاری سے ملک کے عوام کی بہبودی پر صرف کیا جائے تو اسے بیرونی ممالک سے امداد اور قرضے لینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بدقسمتی یہ ہوئی ہے کہ ایک طرف سے ہم ملکی وسائل اور آمدنی کو بڑھاوا دینے کی طرف کم توجہ دیتے ہیں اور دوسری طرف سے حاصل شدہ دولت کو بے رحمی کے ساتھ بے کار چیزوں پر ضائع کرتے ہیں۔ قناعت کی جگہ اسراف نے لی ہے اور سادگی کی جگہ بے جا نام ونمود کو زندگی کا مقصد قرار دیا گیا ہے۔ ہماری دولت کا اکثر حصہ ظاہر دارانہ اخراجات کی نذر ہو جاتا ہے کیونکہ ہم جھوٹے وقار کو قائم رکھنے کے لئے ایسی حرکتیں کرتے ہیں، جن کے بغیر بھی ہم وقار اور عزت کے ساتھ زندگی بسر کرسکتے ہیں۔

☆☆☆



بہت سے ماہرینِ اقتصادیات [illegible] ہے کہ ہندوستان ایسے بڑے ملک میں دولت کے اتنے بے پناہ ذرائع اور وسائل موجود ہیں کہ اگر اُنہیں احتیاط کے ساتھ ہاتھ میں لایا جائے اور پھر حاصل کرنے کے بعد ان کو دیانتداری اور ہوشیاری سے ملک کے عوام کی بہبودی پر صرف کیا جائے تو اسے بیرونی ممالک سے امداد اور قرضے لینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بدقسمتی یہ ہوئی ہے کہ ایک طرف سے ہم ملکی وسائل اور آمدنی کو بڑھاوا دینے کی طرف کم توجہ دیتے ہیں اور دوسری طرف سے حاصل شدہ دولت کو بے رحمی کے ساتھ بے کار چیزوں پر ضائع کرتے ہیں۔ قناعت کی جگہ اسراف نے لی ہے اور سادگی کی جگہ بے جا نام ونمود کو زندگی کا مقصد قرار دیا گیا ہے۔ ہماری دولت کا اکثر حصہ ظاہر دارانہ اخراجات کی نذر ہو جاتا ہے کیونکہ ہم جھوٹے وقار کو قائم رکھنے کے لئے ایسی حرکتیں کرتے ہیں، جن کے بغیر بھی ہم وقار اور عزت کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

☆☆☆